فوجی عدالتیں

(لہو کا قرض)

سید شاہد حسن

فوجی عدالتیں، لہو کا قرض

سید شاہد حسن

ویلکم بُک پورٹ

فہرست

انتساب

راہِ حق کے شہیدوں کے نام

پیش لفظ

لوحِ تاریخ پر فطرت کا یہ ابدی قانون رقم ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں شہید ہونے والے کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ قرآن کریم میں بھی ارشاد خداوندی ہے کہ اس کی راہ میں شہادت پانے والا کبھی نہیں مرتا بلکہ ہمیشہ کے لئے زندہ و جاوید رہتا ہے، اس پس منظر میں لازم ہے کہ آرمی پبلک اسکول پشاور کے معصوم بچوں اور اساتذہ کی بعض انسان نما حیوانوں اور درندوں کے ہاتھوں شہادت پانے والوں کا خون رنگ لائے، تاریخ عالم گواہ ہے کہ ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔''

پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں عدالتوں میں زیر سماعت مقدمات میں سزاؤں کی اوسط شرح دس فیصد سے بھی کم ہے، ایک اندازے کے مطابق پاکستان کی عدالتوں میں زیر سماعت مقدمات کی تعداد 30 لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ مقدمات کے بروقت فیصلے نہ ہونے کی بہت سی وجوہات ہوں گی، اس حوالے سے متعلقہ ادارے درجنوں تاویلیں پیش کر سکتے ہیں مگر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ اپنی ریاست کے لوگوں کو بروقت انصاف کی فراہمی بھی انہی اداروں کی ذمہ داری ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ ''کفر کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے، ظلم کی نہیں'' حقدار کو اس کا حق نہ ملے اور ملے تو تب ملے جب وہ جزا و سزا کے بندھن ہی سے آزاد ہو چکا ہو، جس ملک میں انصاف سوالیہ نشان بن جائے وہ ملک افراتفری کا شکار ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں انصاف کا حصول ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر دور دور تک نظر نہیں آتی، عام آدمی کے لئے انصاف حاصل کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم سرونسٹنٹ چرچل نے دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک تاریخی

سچائی کا اظہار کیا تھا، اپنے ملک کے نظامِ انصاف کے بارے میں اظہار خیال کرنے کے لئے مجھے بھی چرچل کے اس قول کا سہارا لینا پڑ رہا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا "اگر برطانیہ کی عدالتوں میں انصاف ہو رہا ہے تو برطانیہ عالمی جنگ کبھی نہیں ہار سکتا۔" گویا معاشرت اور معیشت سمیت قومی زندگی کے تمام شعبوں اور اداروں کی طاقت اور عظمت اس قوم کی عدالتوں میں ہونے والے انصاف پر منحصر ہوتی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آپریشن "ضرب عضب" کی کامیابی قومی امن اور ملک کے بہتر اور شاندار مستقبل کا انحصار بھی پاکستان کی عام عدالتوں اور خصوصی فوجی عدالتوں میں ہونے والے عدل وانصاف پر مبنی ہوگا۔

صد افسوس کہ ہمارا موجودہ عدالتی نظام "اسٹیٹس کو" کا شکار ہے جو مجرموں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے، اس کمزور ہوتی ہوئی ریاست اور بے جان ہوتے ہوئے معاشرے نے گزشتہ کئی عشروں سے اپنے سینے پر ہزاروں گھاؤ برداشت کئے ہیں لیکن پشاور کے اسکول میں ہونے والی خونریزی نے قوم پر سکتہ طاری کر دیا۔ اب سب کے سامنے سوال یہ تھا کہ دہشت گردوں سے کیسے نمٹا جائے، ملک میں روایات کے برعکس پہلی بار قومی سطح پر ایک اتحاد کی فضا دیکھنے کو ملی جو کہ ہمارے ہاں ناپید تھی، اس اتفاق رائے کے نتیجے میں دہشت گردی سے نمٹنے کے لئے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا گیا جسے قومی ایکشن پلان کا نام دیا گیا۔ اس قومی ایکشن پلان میں بہت سارے اقدامات تجویز کئے گئے جس میں سب سے اہم قدم فوجی عدالتوں کا قیام ہے تاکہ دہشت گردوں کو انصاف کے کٹہرے میں لا کر جلد از جلد سزائیں دی جاسکیں۔ یہ ایک انتہائی اہم اور ضروری اقدام ہے کیونکہ انصاف کا بروقت نہ ملنا ساری برائیوں کی جڑ ہے جس کی وجہ سے دہشت گردوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔

ذاتی طور پر میں نے زندگی بھر آئین اور قانون کی بالادستی کے لئے عملی جدوجہد کی ہے۔ صحافت میں آنے سے قبل میں سیاسی کارکن تھا، زمانہ طالب علمی سے ہی "کتابیں" میرا اوڑھنا بچھونا رہا۔ مسلسل مطالعہ نے مجھے جو شعور عطا کیا اس نے مجھے ترقی پسند تحریک

سے جوڑ دیا۔ 70ء کی دہائی میں ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں جو سیاسی ابھار پیدا ہوا اس نے میری طرح کے بے شمار نوجوان کو اپنی طرف راغب کیا، ایک عام کارکن کی طرح میں پیپلز پارٹی میں شامل رہا، جب جنرل محمد ضیاء الحق نے بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ملک بھر سے سینکڑوں کارکنوں کو گرفتار کیا جانے لگا تو میری گرفتاری کے لئے بھی چھاپے پڑنے لگے، میرا آبائی تعلق ٹیکسلا (ضلع راولپنڈی) سے ہے، ٹیکسلا اور واہ کینٹ کی پولیس نے میرے گھر پر متعدد بار چھاپے مارے، یہ آنکھ مچولی طویل عرصہ تک جاری رہی، اس دوران کبھی کبھار گرفتار ہوا بھی تو ''شریف بچہ'' بننے کی یقین دہانی کرا کے چھوٹ جاتا اور حوالات سے باہر آتے ہی سرگرمیاں پھر شروع کر دیتا۔ چھاپے گرفتاریوں کے دوران کئی بار مجھے ''چھترول'' کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ وقت گزرتا رہا۔ اسی دوران 1983ء میں ایم آر ڈی کی تحریک بحالی جمہوریت شروع ہوئی، پارٹی کی مقام قیادت (راولپنڈی) کی جانب سے مجھے ہدایت دی گئی کہ میں راجہ بازار پہنچ کر اپنی گرفتاری پیش کروں، یہ ستمبر کا مہینہ تھا، تاریخ تو مجھے یاد نہیں تاہم میں نے وقت مقررہ پر راجہ بازار پہنچ کر گرفتاری پیش کر دی۔ پارٹی کے آٹھ دس کارکن مجھے چھوڑنے آئے تھے، میں تن تنہا سینکڑوں لوگوں کے ہجوم میں مسلسل ایک ہی نعرہ لگا رہا تھا ''1973ء کا آئین بحال کرو۔'' یہ وہ آئین تھا جسے جنرل ضیاء الحق کاغذ کا پُرزہ کہا کرتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ میں جب چاہوں اس آئین کو پھاڑ کر پھینک دوں۔

گرفتاری کے چند گھنٹے بعد مجھے راولپنڈی کی ملٹری کورٹ کے جج (جو میجر رینک کے وجیہ نوجوان تھے، مجھے ان کا نام یاد نہیں تاہم یہ ملٹری کورٹ نمبر 18 کے جج تھے) کے سامنے پیش کیا گیا، انہوں نے مجھے راولپنڈی سینٹرل جیل بھیجنے کا حکم صادر کیا۔ راولپنڈی کی یہ جیل اب صفحہ ہستی سے مٹ چکی ہے یا مٹا دی گئی ہے۔ اگلے روز مجھے دوبارہ ملٹری کورٹ نمبر 18 میں پیش کیا گیا۔ یہ فوجی عدالت سول لائن راولپنڈی میں قائم تھی، جیل سے عدالت کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا، دس منٹ کے اس سفر میں، میں راستے بھر 1973ء کا آئین بحال کرو

کے نعرے لگاتا رہا۔ پولیس اہلکار راستے میں میرا تمسخر اڑا رہے تھے مگر ان بے چاروں کو کیا پتہ کہ اس آئین کی کیا اہمیت ہے۔ مجھے میجر صاحب کے روبرو پیش کیا گیا، انہوں نے مجھ سے نام ولدیت پوچھنے کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کی، پندرہ منٹ کے دوران اپنی ''قانونی'' کارروائی مکمل کی اور پھر مجھے سزا سنا دی گئی، میں حیرت زدہ کھڑا تھا اور میرے کانوں میں جج صاحب کی آواز گونج رہی تھی ''سید شاہد حسن ولد سید آل حسن آپ کو مارشل لاء رولز کی خلاف ورزی پر ایک سال قید، 10 کوڑے اور 50 ہزار روپے جرمانہ کی سزا دی جاتی ہے۔'' سزا سننے کے بعد کمرہ عدالت میں ایک بار پھر میں نے نعرہ لگایا۔ ''1973ء کا آ...... ابھی میں نے نعرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ سب انسپکٹر پولیس نے بڑی سختی سے میرا منہ بھینچ دیا اور میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ اب میں ملزم سے مجرم بن چکا تھا۔ اسی روز ایم آر ڈی کے دیگر سیاسی کارکنوں کو بھی سزائیں سنائی گئیں، ہمیں واپس راولپنڈی جیل لے جایا گیا۔ راستے میں سب اپنی اپنی مرضی کے نعرے لگا رہے تھے۔ چند روز بعد ایم آر ڈی کے سیاسی کارکنوں کو میانوالی جیل بھیج دیا گیا۔ مجھے اور نیر حسین بخاری ایڈووکیٹ (جو آصف زرداری کی حکومت میں چیئرمین سینیٹ کے عہدے پر فائز ہوئے) کو مشترکہ سیل میں رکھا گیا۔ کم عمری کی وجہ سے کوڑوں کی سزا سے بچ گیا، قیدی بننے اور جیل کی داستان بڑی دلچسپ ہے جو جلد ضبط تحریر میں لاؤں گا۔

میانوالی جیل سے رہائی کے بعد دوبارہ معمول کی زندگی شروع ہو گئی، 1985ء میں مجھے ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اس بار میرا جرم پاکستان آرڈیننس فیکٹریز واہ کینٹ میں ہڑتال کرانے اور محنت کشوں کو اکسانے کا الزام تھا۔ اس زمانے میں لیفٹیننٹ جنرل (ر) طلعت مسعود پی او ایف بورڈ کے چیئرمین ہوا کرتے تھے۔ مجھے ایک حساس ادارے نے گرفتار کیا تھا۔ کچھ عرصہ حساس ادارے نے مجھے اپنی بیرک میں رکھا، بعد ازاں مجھے لاہور کے شاہی قلعہ بھیج دیا گیا، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرے ساتھ وہاں کس ''حسن سلوک'' کا مظاہرہ کیا گیا۔ تاہم مجھے بے گناہ قرار دے کر شاہی قلعہ ہی سے رہا کر دیا گیا۔ 1986ء

میں بے نظیر بھٹو وطن واپس آئیں۔ انہوں نے ملک بھر کا دورہ کیا۔ صوبہ سرحد، آزاد کشمیر اور پنجاب کے بیشتر شہروں کی ریلیوں میں، میں بے نظیر بھٹو کے ہمراہ ہوتا۔ وطن واپسی کے بعد بے نظیر بھٹو صاحبہ نے پیپلز پارٹی کی تنظیم نو کا آغاز کیا تو مجھے پیپلز پارٹی تحصیل راولپنڈی کا صدر نامزد کیا گیا۔ دورے مکمل کر کے بے نظیر بھٹو کراچی چلی گئیں جہاں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک بھر میں ایک بار پھر پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں، راولپنڈی میں دیگر کارکنوں اور عہدیداروں کے ہمراہ مجھے بھی گرفتار کر کے 90 روز کے لئے راولپنڈی جیل میں نظر بند کر دیا گیا تاہم دو ماہ بعد سب کو رہا کر دیا گیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی رہائی کے بعد پیپلز پارٹی میں جاگیرداروں اور وڈیروں کی دھڑا دھڑ شمولیت کی وجہ سے مجھ جیسے بہت سے کارکن مایوسی کا شکار ہو گئے، میں نے پیپلز پارٹی سے استعفیٰ دے دیا، کچھ عرصہ بعد میں نے عوامی نیشنل پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی، اے این پی نے مجھے 1988ء کے عام انتخابات میں راولپنڈی کے حلقہ پی پی 5 سے ٹکٹ بھی دیا۔ میری الیکشن مہم ترقی پسند جماعتوں کے کارکنوں نے بڑے زور شور سے چلائی تاہم پنجاب میں اے این پی کی گنجائش کہاں۔ خان عبدالولی خان اور اے این پی کے دیگر مرکزی رہنماؤں کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ پوری قیادت میری انتخابی مہم چلا رہی تھی۔

واہ کینٹ کے مشہور ''لائق علی چوک'' میں علاقے کی تاریخ کا بہت بڑا جلسہ ہوا جس سے خطاب کرنے کے لئے خان عبدالولی خان اور بیگم نسیم ولی خان خود تشریف لائے، الیکشن تو میں بھلا کیا ہی جیتتا البتہ یہ ضرور ہوا کہ اے این پی اٹک کا پل پار کر کے پنجاب میں داخل ہو گئی، اے این پی کے سینیٹر زاہد خان کا سیاسی جنم پنجاب ہی سے ہوا، وہ راولپنڈی میں پلے بڑھے، تعلیم حاصل کی اور انہوں نی شادی بھی مقامی خاتون سے کی، زاہد خان پختون ہونے کے باوجود آج بھی راولپنڈی کے سیاسی حلقوں کی ہردلعزیز شخصیت ہیں، ان جیسا سیاسی کارکن برسوں میں پیدا ہوتا ہے۔ سیاست سے میں پہلے ہی بے زار آ چکا تھا لہٰذا میں نے

خاموشی سے اپنے آپ کو سیاست سے الگ کرلیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے جب 1988ء کے انتخابات کے بعد وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا تو انہوں نے راولپنڈی کی مقامی قیادت کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا اور میرے تحفظات دور کرنے کا وعدہ کیا۔ تحفظات تو کیا ہی دور ہوتے تاہم میرا بی بی سے ایک بار پھر رابطہ استوار ہوگیا۔ (شہید بے نظیر بھٹو سے میں ان کی زندگی کے آخری ایام تک رابطے میں رہا، پہلے سیاسی کارکن کی حیثیت سے اور بعد ازاں ایک صحافی کی حیثیت میں۔) پھر حالات مجھے کراچی لے آئے، یہاں میں نے قومی اخبار میں ملازمت اختیار کرلی، سیاست سے صحافت تک کا سفر بڑا دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی، زندگی نے وفا کی تو بہت جلد اپنی داستان حیات بھی قلم بند کروں گا کہ میں کس طرح ''ٹیشو پیپر'' کی طرح استعمال ہوتا رہا ہوں۔

یہاں یہ داستان سنانے کی مجھے ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جب وزیر اطلاعات و نشریات سینیٹر پرویز رشید قومی اسمبلی میں فوجی عدالتوں کے قیام کے لئے 21ویں آئینی ترمیم کا بل پیش کررہے تھے تو یہ کہا گیا کہ آج وہ شخص فوجی عدالتوں کے قیام کا بل قومی اسمبلی کے منتخب ایوان میں پیش کر رہا ہے جو ماضی میں خود ایک فوجی عدالت سے سزا یافتہ ہے، یہ حالات کا تقاضہ یا تاریخ کا جبر ہے کہ مجھ جیسا ''سوشلسٹ مائنڈڈ'' اور سیکولر افکار کا علمبردار فوجی عدالتوں کے قیام کا وکیل بن کر اس کتاب کی صورت میں قوم کے سامنے دلائل دے رہا ہے۔ میں تو ایک بہت چھوٹا سا آدمی ہوں، آج تو بیرسٹر اعتزاز احسن، رضا ربانی (روتے دھوتے ہی سہی) بیرسٹر فروغ نسیم جیسے بڑے آئین وقانون کی بالادستی کی جدوجہد کرنے والے لوگ بھی میری طرح فوجی عدالتوں کے قیام کی حمایت کرنے پر مجبور ہیں۔ ملک نارمل حالات سے نہیں گزر رہا اس لئے غیر معمولی صورت حال میں غیر معمولی فیصلے کرنے پڑ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دہشت گردوں کو نیست و نابود، انتظامیہ، ماتحت عدلیہ، صحت، تعلیم، پولیس، ٹیکسوں کے نظام سمیت ان تمام شعبوں کی تنظیم نو پر بھی توجہ دی

جانی چاہئے اور اصلاح احوال کے لئے مزید آئینی ترامیم اور قانون سازی کی ضرورت ہو تو اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ ہمارے معاشرے میں برسوں سے روبہ زوال رجحانات پنپ رہے ہیں جس کے باعث ہمارا ملک ناکام ریاست کے دہانے پر پہنچ چکا ہے، جن معاشروں میں استحصال، معاشی وسماجی ناانصافی اور کرپشن کا دور دورہ ہو اور جو غریبوں کی فلاح و بہبود کے اقدامات سے خالی ہوں، جرائم اور دہشت گردی کی پرورش کے لئے وہ بہترین سرزمین ثابت ہوتے ہیں۔

آج صرف طالبان ہی نہیں بلکہ بہت سے دیگر گروہ بھی مختلف اہداف کے لئے تشدد کا سہارا لے رہے ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گزشتہ ایک عشرے سے تشدد کی کارروائیوں میں بے تحاشہ اضافہ کیوں ہوا، اس کا مختصر جواب ''ہمارے نظام کی ناکامی'' ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاستی ادارے اور حکومتیں اپنے فرائض سرانجام دینے میں ناکام رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں 2002ء سے مسلسل بم پھٹ رہے ہیں، خودکش حملے ہو رہے ہیں، بچوں اور بچیوں کے اسکول بموں سے اڑائے جا رہے ہیں، پولیو کے قطرے پلانے والے رضاکاروں کی زندگیوں کے چراغ گل کر دیئے جاتے ہیں، بدنصیبی تو یہ ہے کہ بعض سیاسی و مذہبی جماعتیں ان وحشیانہ کارروائیوں کے مختلف جواز پیش کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہاں تک ہوا کہ ایک جماعت کے سابق امیر نے ان دہشت گردوں کو شہید تک قرار دے ڈالا، فرقہ وارانہ بنیادوں پر ٹارگٹ کلنگ آج بھی جاری ہے، اب بھی خودکش حملے ہو رہے ہیں، اب جب کہ فوج خود فیصلہ کن انداز میں دہشت گردوں کا صفایا کرنے کے عزم کے ساتھ میدان میں اتری ہے تو ہمیں من حیث القوم اپنی فوج کی پشت پر کھڑا ہونا ہوگا جو یہ جنگ انتہائی جانفشانی اور بہادری سے لڑ رہی ہے۔

ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں تعلیم اور صحت سمیت ہر شعبے کو ذریعہ تجارت بنا کر عام آدمی کے لئے شجرہ ممنوعہ کا درجہ دے دیا ہے، تعلیمی نظام کی بوسیدگی دور

کر کے اسے مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے اقدامات کرنے ہوں گے۔ استحصال کی روک تھام کر کے سماجی انصاف کو یقینی بنانا ہوگا تا کہ دہشت گردی کو جنم دینے والے اسباب کا خاتمہ کیا جا سکے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مالیاتی دہشت گردوں کو بھی اسی ہنگامی انصاف کے عمل سے گزارا جائے، مجھے یقین ہے کہ پارلیمنٹ، حکومتی مشینری، جاگیردار اور وڈیرے جیتے جی ایسا قانون نہیں بننے دیں گے کیونکہ ہر کوئی کرپشن کی دہشت گردی میں لتھڑا ہوا ہے اس لئے ہمیں اپنے پورے نظام کی اصلاح کرنا ہوگی، اس کے لئے کوئی مردِ غیب نہیں آئے گا۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ ناکام ہوتی ہوئی ریاست کو بچانے کے لئے پاک فوج کو مزید اختیارات دیئے جانے چاہئیں تا کہ اداروں کی اصلاح کے لئے وسیع تر اصلاحات کا عمل شروع کیا جا سکے تا کہ

امن ملے ترے بچوں کو اور انصاف ملے
دودھ ملے چاندی سے اجلا، پانی صاف ملے
(احمد مشتاق)

یہ میری دوسری کتاب ہے، حسب سابق اس کتاب کی تکمیل میں بھی میری تینوں بیٹیوں رافعہ، ماہ نور اور ماریہ نے میری معاونت کی، انٹرنیٹ، سے مواد کے حصول میں میری مددگار بنی رہیں۔ کتاب کی پروف ریڈنگ میں میری اہلیہ شاہانہ طلعت نے میری معاونت کی جس پر میں ان سب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

ویلکم بک پورٹ کے روح رواں جناب اصغر زیدی کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میری کتاب کی تزئین و آرائش پر خصوصی توجہ دی، انشاء اللہ میری تیسری کتاب بھی بہت جلد آنے والی ہے جو میری سوانح حیات بھی ہوگی اور سیاسی کارکنوں کے باعث عبرت بھی۔

سید شاہد حسن
حیدر آباد کالونی۔ کراچی
talwar.war@gmail.com

باب نمبر 1

☆لب پہ آتی ہے دعا

☆پرعزم سپہ سالار

☆جنرل راحیل شریف مبصرین کی نظر میں

☆دہشت گردی اور جنرل راحیل شریف

☆قومی تاریخ کی بہترین عسکری ٹیم

☆قومی اتفاق رائے، پاک فوج کی کوششیں

☆اکیسویں آئینی ترمیم، سیاسی جماعتوں کا مخمصہ

☆لہو کا قرض

☆اتفاق واتحاد کا لازوال منظر

لب پہ آتی ہے دعا......

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی بم سے ہو محفوظ خدایا میری
میں جو دفتر کے لئے گھر سے نکل کر جاؤں
روزمرہ کی طرح خیر سے واپس آؤں
نہ کوئی بم کے دھماکے سے اڑا دے مجھ کو
مفت میں جام شہادت نہ پلا دے مجھ کو
ہائے جن لوگوں سے کل تک تھی وطن کی زینت
آج وہ لوگ ہوئے قبر و کفن کی زینت
گھر مرا ہوگیا ویرانے کی صورت یا رب
اور بدلی نہ کسی تھانے کی صورت یارب
ان پہ جائز ہے زبردستی حکومت کرنا
اور ہے جرم مجھے اپنی حفاظت کرنا
میرے اللہ لڑائی سے بچانا مجھ کو
اور سکھا دے کوئی بندوق چلانا مجھ کو
خیر سے لوٹ کے آئیں میرے ابو گھر میں
اُڑ نہ جائیں وہ دھماکے سے کہیں دفتر میں
کلمہ گویوں کو مسلمان بنا دے یارب
نیک اور صاحب ایمان بنا دے یارب
نامِ اسلام کی حرمت کو بچالے یارب
وقت کے سارے یزیدوں کو اٹھالے یارب
لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

(محشر لکھنوی)
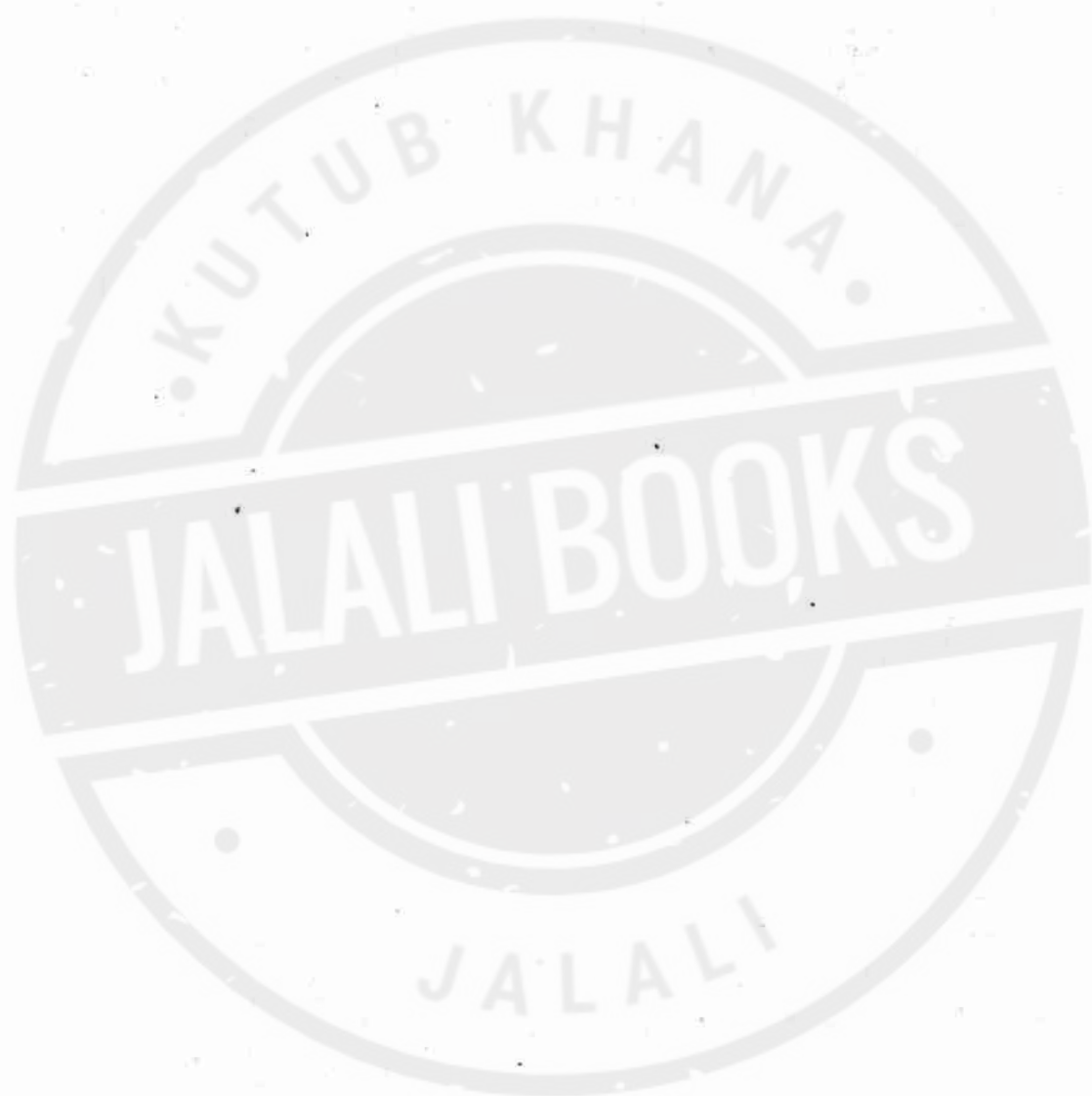
پرعزم سپہ سالار

2014ء میں یوم شہداء کی تقریب سے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل شریف کا خطاب اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اپنے خطاب میں آرمی چیف نے دہشت گردی کے خلاف جس عزم کا اظہار کیا، بعد میں آنے والے دنوں میں انہوں نے اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ وہ اپنے پیش رو کی طرح ایک لمحہ کے لئے بھی تذبذب کا شکار نہیں ہوئے۔ جنرل راحیل شریف کا تاریخی خطاب ملاحظہ فرمایئے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہداء کرام کے معزز لواحقین،

مہمانانِ گرامی اور خواتین و حضرات

السلام علیکم!

قوم کے شہیدوں اور غازیوں کو میرا سلام

آج کا دن ان شہداء کے نام ہے، جنہوں نے 1947ء سے 2014ء تک وطن عزیز پاکستان کو درپیش اندرونی و بیرونی خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

ہم ان ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور شہداء کے دیگر لواحقین کے جذبوں کو سلام پیش کرتے ہیں، جنہوں نے اپنے پیارے اس وطن کے تحفظ پر نچھاور کر دیئے۔ ہم ان غازیوں کی بہادری کو بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں جو دفاع وطن کے لئے دشمن کے سامنے سینہ سپر ہیں۔

معزز خواتین و حضرات!

آج ہمیں بحیثیت قوم ایک ایسی جنگ کا سامنا ہے جس سے افواج پاکستان کے

ساتھ ریاست کے تمام ادارے اور پاکستانی عوام بھی برسرِ پیکار ہیں۔ اس مناسبت سے میں نہ صرف افواج پاکستان، ایف سی، رینجرز، فرنٹیئر کانسٹیبلری، پولیس اور لیویز بلکہ ان ہزاروں محبِّ وطن شہریوں کو بھی خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس جنگ میں اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ وطن عزیز کے استحکام کے لئے ان کا کردار لازوال اور ناقابل فراموش ہے۔

ہمارے ملک کو بے شمار اندرونی اور بیرونی چیلنجز کا سامنا ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ افواج پاکستان سیکورٹی کے دیگر اداروں خصوصاً سول آرمڈ فورسز، پولیس اور انٹیلی جنس اداروں کے ساتھ مل کر اپنے فرائض پورے کرتے ہوئے ان تمام خطرات کے خلاف دیوار بن کر کھڑی رہیں گی، اور دشمن کے عزائم کو ناکام بنادیں گی۔

معزز حاضرین!

پاک فوج دہشت گردی کے خاتمے اور امن کی بحالی کے لئے ہر کوشش کی حمایت کرتی ہے۔ یہ ہماری دلی خواہش ہے کہ پاکستان کے خلاف سرگرم عمل تمام عناصر غیر مشروط طور پر ملک کے آئین اور قانون کی مکمل اطاعت قبول کریں اور قومی دھارے میں واپس آئیں۔ بصورت دیگر ریاست کے باغیوں سے نمٹنے کے معاملے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ پاکستان کی غیور عوام اور افواج پاکستان ایسے عناصر کو کیفر کردار تک پہنچانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

جنگی محاذ، خواہ اندرونی ہو یا بیرونی، قومیں لڑا کرتی ہیں اور اپنی افواج کا حوصلہ بلند رکھتی ہیں۔ پاک افواج کی طاقت کا سرچشمہ عوام کا اعتماد ہے اور پاکستانی قوم نے ہمیشہ اپنی افواج کا ساتھ دیا ہے۔ قوم کی حمایت کے ساتھ یقیناً ہمارے بہادر سپوت قومی سلامتی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ انشاءاللہ، ہر آنے والا دن عوام اور افواج پاکستان کے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر کرے گا۔

معزز خواتین وحضرات!

افواج پاکستان نے دفاع وطن کے بنیادی فریضے کے ساتھ ساتھ ملک کی تعمیر و ترقی اور فلاح و بہبود میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ 1947ء میں مہاجرین کی بحفاظت پاکستان آمد اور آباد کاری سے لے کر سوات اور فاٹا کے لوگوں کی گھروں کو واپسی اور بحالی تک مسلح افواج کا کردار نمایاں رہا ہے۔

معزز حاضرین!

افواج پاکستان وفاق کی تمام اکائیوں کی نمائندہ، قومی یکجہتی کی آئینہ دار، پاکستانیت کی علامت اور دفاع وطن کی ضمانت ہے۔ حالیہ برسوں میں بلوچستان سے تعلق رکھنے والے 20 ہزار سے زائد نوجوانوں نے پاک فوج میں بحیثیت آفیسر اور سولجرز شمولیت اختیار کی ہے جو صوبہ بلوچستان کے لوگوں کا اپنی افواج پر بھرپور اعتماد کا واضح ثبوت ہے۔

پاکستان کی نصف سے زائد آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہمارے نوجوان قوم کا قیمتی اثاثہ اور پاکستان کا مستقبل ہیں۔ افواج پاکستان کے زیر نگرانی مختلف تعلیمی اور تکنیکی ادارے چل رہے ہیں جن میں قوم کے ہزاروں بچے زیر تعلیم ہیں، ان میں سے زیادہ تر کا تعلق بلوچستان، فاٹا اور ملک کے دور دراز علاقوں سے ہے۔

معزز خواتین وحضرات!

عالمی امن کے قیام میں بھی افواج پاکستان کا کردار نمایاں ہے۔ اقوام متحدہ کی امن فوج میں پاکستان افواج ہراول دستے کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ اقوام متحدہ کی تاریخ میں پاکستانی امن دستوں کی تعداد دیگر ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ اقوام عالم کا ہماری قوم اور افواج پر اعتماد کا مظہر ہے اور ہمارے لئے باعث فخر ہے۔

معزز حاضرین!

کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی تنازعہ ہے جس پر اقوام متحدہ کی

قراردادیں موجود ہیں اور اس کا کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق حل کرنا علاقائی سلامتی اور پائیدار امن کے لئے ناگریز ہے۔ کشمیری عوام کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ افواج پاکستان امن کی خواہاں ہیں مگر کسی بھی قسم کی جارحیت کا جواب دینے کے لئے ہمہ وقت تیار بھی ہیں۔

خواتین وحضرات!

افواج پاکستان جمہوریت کے استحکام، آئین وقانون کی پاسداری اور بالادستی پر یقین رکھتی ہیں۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر گامزن رہ کر ہم ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے لازم ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کے دیئے گئے سنہری اصول Faith, Unity and Discipline کو ہمیشہ یاد رکھا جائے اور ملک کے تمام ادارے ایک دوسرے کے ساتھ ملکر اس نظام کی کامیابی کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہیں۔ پاکستان کی مسلح افواج ملک کی ترقی اور عوام کی خوشحالی کے لئے ہمیشہ کام کرتی رہیں گی۔

معزز حاضرین!

ریاست کے تمام اداروں کے ساتھ ساتھ قومی تعمیر میں سول سوسائٹی اور میڈیا کا کردار بھی قابل تعریف ہے۔ میڈیا نے ہر موڑ پر وطن عزیز کی سلامتی کے حق میں عوامی رائے کو ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہم میڈیا کی آزادی اور ذمہ دارانہ صحافت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی قربانیوں کو سراہتے ہیں۔

خواتین وحضرات!

تمام مشکلات کے باوجود پاکستان اپنے استحکام اور خوشحالی کی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ 18 کروڑ سے زائد محنتی، ہنرمند اور متحرک عوام پر مشتمل ہمارا وطن ہر لحاظ سے انتہائی اہم مقام پر کھڑا ہے۔ انشاء اللہ اقوام عالم میں صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہم اپنا صحیح

مقام حاصل کر کے رہیں گے۔

معزز حاضرین!

شہادت ایک عظیم رتبہ ہے۔ آپ کی افواج جذبہ شہادت سے سرشار ہے۔ خوش نصیب ہیں ہمارے وہ ساتھی جنہیں یہ سعادت نصیب ہوئی۔ آج کا دن پاک سرزمین کی حفاظت کے لئے یوم تجدید عہد بھی ہے۔ ہم شہداء کے لواحقین کے لئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم بحیثیت قوم ان کے ساتھ کھڑے رہیں گے۔

آخر میں، میں یہ بات دہرانا چاہتا ہوں کہ افواج پاکستان ملکی سلامتی کو درپیش ہر طرح کے اندرونی اور بیرونی خطرات پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور ان سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔ مسلح افواج قومی سلامتی اور مادر وطن کی ترقی اور خوشحالی کے لئے اپنا کردار ادا کرتی رہیں گی۔

یہ ہمارا مشن ہے کہ مستقبل کا پاکستان اندرونی اور بیرونی طور پر محفوظ پاکستان ہو۔ قوم کے شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اگلی نسل کو ایک مستحکم اور خوشحال پاکستان حوالے کریں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو! آمین

پاک فوج زندہ باد

پاکستان پائندہ باد

جنرل راحیل شریف مبصرین کی نظر میں

سابق فوجی عہدیدار اور دفاعی امور پر نظر رکھنے والے بیشتر مبصرین جنرل راحیل شریف کو ایک ایسے پیشہ ور فوجی کے طور پر جانتے ہیں جو ملک کو درپیش دہشت گردی کے چیلنج سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پاکستان کی بری فوج کے سربراہ جنرل راحیل شریف

1976ء میں فوج میں شامل ہوئے اور نومبر 2013ء میں انہوں نے بطور 15 ویں چیف آف آرمی اسٹاف کے ملک کی طاقتور فوج کی کمان سنبھالی۔

جنرل راحیل شریف کا تعلق ایک فوجی خاندان سے ہے اور ان کے والد محمد شریف میجر تھے جبکہ مرحوم کے بڑے بھائی میجر شبیر شریف شہید کو پاکستان کے اعلیٰ ترین فوجی اعزاز 'نشان حیدر' سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ میجر عزیز بھٹی شہید 'نشان حیدر' آپ کے ماموں تھے۔ بری فوج کی قیادت سنبھالنے کے بعد جنرل راحیل شریف نے قبائلی علاقے شمالی وزیرستان میں طالبان اور ان کے اتحادی گروہوں کے خلاف بھرپور آپریشن کا آغاز کیا۔ اس بھرپور آپریشن سے قبل ایک تقریب سے خطاب میں جنرل راحیل شریف نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ فوج ملک میں امن کی بحالی کے عزم پر قائم ہے۔ ''یہ ہماری دلی خواہش ہے کہ پاکستان کے خلاف سرگرم عمل تمام عناصر غیر مشروط طور پر ملک کے آئین اور قانون کی اطاعت قبول کریں۔ بصورت دیگر ریاست کے باغیوں سے نمٹنے کے معاملے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ پاکستان کے غیور عوام اور افواج پاکستان میں ایسے عناصر کو کیفر کردار تک پہنچانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔'' پاکستان کی سابقہ سیاسی اور عسکری قیادت کئی سال سے شمالی وزیرستان میں دہشت گردوں کے خلاف بھرپور کارروائی کا آغاز کرنا چاہتی تھی لیکن شدت پسندوں کی طرف سے ممکنہ ردعمل کے خدشے کے باعث وہ ایسا کرنے سے ہچکچاتے رہے۔ فوج کے سابق ترجمان میجر جنرل (ریٹائرڈ) اطہر عباس کہتے ہیں کہ جنرل راحیل شریف نے طالبان کے خلاف کارروائی کرنے کا درست فیصلہ کیا۔ ''وہ (جنرل راحیل شریف) مقصد کو حاصل کرنا جانتے ہیں، میں انہیں انتہائی محبِّ وطن، راست گو، بااصول انسان سمجھتا ہوں۔ یہ ایسی چیز ہے جس کا بیرونی دنیا بھی اعتراف کرتی ہے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ پاکستان کے امریکہ اور دنیا کے دیگر ممالک سے تعلقات میں نئی شروعات ہوئی ہیں۔'' دفاعی تجزیہ کار ماریہ سلطان کہتی ہیں کہ جنرل راحیل شریف

ناصرف اندرونی بلکہ عالمی حالات سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں اور انہیں اپنی فوج کی طاقت اور کمی دونوں کا پوری طرح ادراک ہے۔ ''جو سانحہ پشاور میں ہوا ہے، اس کے بعد جس طرح آپ کے آرمی چیف نے ناصرف جوایکشن لیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قوم کو بھی ساتھ رکھا ہے یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔'' نومبر 2014ء میں جنرل راحیل شریف نے بطور آرمی چیف امریکہ کا پہلا دورہ کیا، جہاں ان کی اعلیٰ امریکی فوجی کمانڈروں اور اوباما انتظامیہ کے عہدیداروں کے علاوہ اراکین کانگریس سے بھی تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ مبصرین کا ماننا ہے کہ یہ دورہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں بہتری کے لئے انتہائی اہم ثابت ہوا۔ ''آپ نے دیکھا کہ تمام ہی اعلیٰ امریکی عہدیداروں کی جنرل راحیل شریف سے ملاقاتیں ہوئیں اور حتیٰ کہ وزیر خارجہ جان کیری سے ان کی ملاقات کے لئے دورے کی مدت بھی بڑھا دی گئی۔ اس سے امریکہ کی سنجیدگی اور پاکستان کے بارے میں پالیسی میں تبدیلی کی عکاسی ہوتی ہے۔'' تجزیہ کار ماریہ سلطان کا کہنا ہے کہ جنرل راحیل شریف کے دورہ امریکہ سے دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کا موقف سمجھنے میں مدد ملی۔ یہ ایک خوش آئند دورہ تھا اور اس کی دو تین بنیادی وجوہات ہیں، پہلی بات تو یہ ہے جو فاصلے آپ براہ راست کم کرسکتے ہیں وہ محض خط و کتابت سے نہیں ہوسکتے اور نہ ہی کسی کی زبانی ہوسکتے ہیں۔ اس لئے اس دورے نے دونوں ملکوں کے اداروں کے درمیان تعاون کو بہتر کرنے میں بڑا اہم اور کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ (بشکریہ روزنامہ جنگ)

دہشت گردی اور جنرل راحیل شریف

چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل شریف نے کہا ہے کہ قومی ایکشن پلان دہشت گردی کے خلاف جامع منصوبہ ہے۔ جس پر حکومت عملدرآمد کے لئے بھرپور کوشش کر رہی ہے، مسئلہ کشمیر کا حل ضروری ہے، پاکستان عزت کے ساتھ امن چاہتا ہے۔ جنرل راحیل

شریف نے لندن میں اپنے خطاب میں واضح کیا ہے کہ ضرب عضب میں بلاتفریق سب دہشت گردوں کو نشانہ بنا رہے ہیں، دنیا کو ہمارا ماحول سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آرمی چیف جنرل راحیل شریف امن چاہتے ہیں مگر وقار کے ساتھ، کا دوٹوک موقف قوم کے دل کی آواز ہے کیونکہ دہشت گردی کے عفریت نے پاکستان پر جو افتاد توڑی ہے اس سے ملکی سلامتی کو خدشات لاحق ہو گئے ہیں۔ اگر چہ حکومت، فوج اور سیکورٹی اداروں کی جانب سے اپنے تئیں دہشت گردی کے خاتمے کے لئے بہت سی کوششیں کی جارہی ہیں لیکن پاکستان کو ہمسایہ اور دوست ممالک کا تعاون درکار ہے۔ پاکستان کو آج جس دہشت گردی کا سامنا ہے اس کے ڈانڈے ہمسایہ ممالک بالخصوص بھارت سے جا ملتے ہیں۔ بھارت کا خبث باطن سب پر اچھی طرح سے عیاں ہے کہ اس نے پاکستان کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا اسی لئے تو آئے روز کبھی لائن آف کنٹرول پر بلا اشتعال فائرنگ کرتا ہے اور کبھی افغانستان کو دوستی کی آڑ میں استعمال کرتا ہے۔ یہ بغل میں چھری اور منہ میں رام رام پالیسی کا ہی نتیجہ ہے کہ اس نے افغانستان میں اپنے اڈے قائم کر لئے اور جب چاہتا ہے پاکستان میں دہشت گردی کرا دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض شر پسند عناصر کو مالی امداد بھی فراہم کرتا ہے۔ بلوچستان میں بھارتی مداخلت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں بلکہ اس بارے میں تو ثبوت بھی بھارتی حکام کے حوالے کئے جا چکے ہیں لیکن مجال ہے کہ بھارتی حکام یا عالمی دنیا نے اس کا نوٹس لیا ہو۔ آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے عالمی دنیا کے سامنے دہشت گردی کے شکار پاکستان کا مقدمہ جس جرأت اور بہادری کے ساتھ پیش کیا ہے اس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ عالمی برادری پر واضح کیا گیا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان اپنے حصے کا کردار طویل عرصے سے احسن طریقے سے ادا کر رہا ہے۔ اب عالمی برادری بھی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے اور اس عفریت سے نجات دلانے کے لئے تدبیر کرے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک کھلا سچ ہے کہ جب تک مسئلہ کشمیر حل نہیں ہو جاتا اس وقت تک پاک بھارت تعلقات میں بہتری کی

توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگرچہ برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون نے گزشتہ دنوں امریکی صدر اوباما سے ملاقات میں اعتراف کیا ہے کہ دنیا دہشت گردی سے تنگ ہے تو اس کے اسباب جاننے اور اسے ختم کرنے کے لئے عالمی طاقتوں کو آگے آنا چاہئے۔

آرمی چیف کے دہشت گردی کے خلاف فیصلہ کن جنگ آخری دہشت گرد کے خاتمہ تک جاری رکھنے کا عزم تو کئی بار دہرایا جا چکا ہے مگر اب واپسی کی کوئی گنجائش نہیں، ان طاقتوں کے لئے پیغام ہے جو کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا تھیں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر قربانیاں دی ہیں مگر اب عالمی برادری کو بھی اس حوالے سے کچھ کرنا چاہئے جو پاکستان کی قربانیوں کے اعتراف میں چند ٹکے دے کر اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے۔ بعض تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ سیاسی قیادت دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بارے میں موقف کو اس جرأت مندانہ انداز میں اقوامِ عالم کے سامنے نہیں پیش کرسکی جو وقت کا تقاضا تھا یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی جانب سے ہمیشہ ڈو مور اور Do better کا مطالبہ سامنے آتا رہا لیکن اب آرمی چیف کے دوٹوک اور دلیرانہ مؤقف کے بعد پاکستان اس پوزیشن میں آ گیا ہے کہ وہ عالمی برادری سے ڈو مور کا مطالبہ کرسکتا ہے جس کا اندازہ آئی ایس پی آر کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ بلوچستان کے عسکریت پسندوں کو مغربی ممالک کی حمایت حاصل ہے اس لئے ملک دشمن عناصر کو پاکستان کے حوالے کیا جانا چاہئے۔ 16 دسمبر کے سانحہ پشاور کے بعد قومی ایکشن پلان پر عملدرآمد سے دہشت گردوں کے گرد گھیرا تیزی سے تنگ ہو رہا ہے کیونکہ دہشت گرد اور کالعدم تنظیموں سے تعلق رکھنے والے افراد کی بڑی تعداد کو ملک بھر سے گرفتار کیا جا چکا ہے اور اب دہشت گردی میں ملوث افراد، تنظیموں کے بینک اکاؤنٹس منجمد کرنے میں، ملوث مدارس کے خلاف کارروائی سے اچھے نتائج ملنے کی توقع ہے حکومت کی جانب سے دہشت گردی کے خاتمے کے لئے جو اقدامات کئے جارہے ہیں وہ اس وقت تک ایک لاحاصل مشق رہیں گے جب تک ان پر صحیح معنوں میں

عملدرآمد کو یقینی نہ بنایا جائے۔ پاکستان اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہا ہے کہ ایک طرف طالبان ہیں تو دوسری طرف داعش جیسی بدنام زمانہ عالمی دہشت گرد تنظیم جو پاکستان میں امن کی کوششوں کو تہہ و بالا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جبکہ بھارت پاک فوج کو ضرب عضب میں مصروف عمل دیکھ کر سرحدوں پر بلا اشتعال فائرنگ کر کے اس کی توجہ تقسیم کرنے کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہے۔ ملک اس وقت حالت جنگ میں ہے اور ایسی کیفیت میں سخت فیصلے وقت کی ضرورت بن جاتے ہیں لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف لاتعداد قربانیاں دینے کے باوجود بھی پاکستان کو وہ اسٹیٹس عالمی برادری نے نہیں دیا جو اس کا حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی عوام میں امریکہ مخالف جذبات میں شدت آ رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمی برادری پاکستان کو امن کی خواہش کو اس کی کمزوری نہ سمجھے کیونکہ اس بہادر قوم نے سر اٹھا کر جینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اب یہ قوم بہت جلد دہشت گردوں سے اپنا چھینا ہوا پاکستان واپس حاصل کر لے گی۔ (بشکریہ روزنامہ خبریں 18 جنوری 2015ء)

قومی تاریخ کی بہترین عسکری ٹیم

سربراہ پاک فوج جنرل راحیل کی زیر صدارت کور کمانڈر کانفرنس میں ملک سے دہشت گردی، انتہاپسندی اور فرقہ واریت کے بلاامتیاز خاتمے کے عزم کا اظہار کیا گیا، عسکری قیادت نے دہشت گردی کے خاتمے کے لئے قومی ایکشن پلان پر مکمل عملدرآمد پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان سے دہشت گردی کا مکمل خاتمہ کیا جائے گا۔

عسکری قیادت کا دہشت گردی اور فرقہ واریت کے بلاامتیاز خاتمے کا عزم انتہائی قابل تحسین تھا کیونکہ یہ پہلا موقع ہے کہ دہشت گردی کے ساتھ ساتھ فرقہ واریت کے خاتمے کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ دراصل دہشت گردی کی اصل وجہ یہ فرقہ واریت ہی ہے جس کی بناء پر ایک فرقے کے لوگ دوسرے کو غلط سمجھنے لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ اسلام کے نام پر

ایک دوسرے کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ پاکستان میں فرقہ واریت کا زہر جس تیزی سے پھیلا وہ حکومت کی خصوصی توجہ کا متقاضی ہے کیونکہ حسب روایت سابق حکومتوں نے اس کی طرف توجہ دینے کی زحمت ہی نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے خود کو فرقوں میں تو بانٹ لیا لیکن سچے مسلمان نہ بن سکے۔ ہماری اسی کوتاہی اور غفلت کا فائدہ اسلام دشمن طاقتوں نے بھرپور اٹھایا اور ہمیں درجنوں فرقوں میں تقسیم در تقسیم کر کے رکھ دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ پاکستان میں ہونے والے سینکڑوں واقعات ایسے ہیں جن سے فرقہ واریت کی بو واضح طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ بحثیت مسلمان ہم ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک کتاب (قرآن کریم) پر یقین رکھتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ سنہری اسلامی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں۔ ہم عمل سے اس قدر عاری ہو چکے ہیں کہ اب تو ہمارے الفاظ بھی اپنی وقعت کھوتے جا رہے ہیں۔ سانحہ پشاور کے بعد ریاست کی جانب سے دہشت گردوں کے خلاف قومی ایکشن پلان، 21 ویں ترمیم و فوجی عدالتوں کے قیام کی منظوری کے بعد توقع کی جا رہی تھی کہ اب دہشت گردی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ شکار پور سانحے کے بارے میں بعض تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ وفاق بالخصوص صوبائی حکومت کے لئے یہ امر باعث تشویش ہونا چاہئے کہ اندرون سندھ فرقہ وارانہ دہشت گردی کی اپنی نوعیت کی پہلی واردات تھی جو اندرون سندھ میں تیزی سے مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے نیٹ ورکس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ حکومت کی جانب سے قومی ایکشن پلان پر پوری طاقت کے ساتھ عمل نہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ سخت ترین سیکورٹی اقدامات کے باوجود شرپسند عناصر اپنے مقاصد پورے کر رہے ہیں۔

اگرچہ پاک فوج ضرب غضب آپریشن اور خیبر ون میں نمایاں کامیابی حاصل کر چکی ہے لیکن دوسری طرف بعض ایسے عناصر تاحال موجود ہیں جو دہشت گردوں کے خلاف 21 ویں ترمیم اور فوجی عدالتوں کے قیام کی کھل کر مخالفت کر رہے ہیں۔ اس قسم کا طرز عمل درحقیقت آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح دہشت گردی کے ڈانڈے

امریکہ، اسرائیل اور بھارت سے ملانا دراصل اپنا چہرہ ریت میں چھپانے اور حقائق مسخ کرنے کے مترادف ہے اس لئے عوام کو گمراہ کرنے کے بجائے معاشرے کے تمام اعتدال پسند طبقات کو شدت پسندوں اور دہشت گردی کے مقابلے کے لئے باہر نکلنا ہوگا۔ پاک فوج کا دہشت گردی کے ساتھ فرقہ واریت کا بلاامتیاز خاتمے کا اعلان اس امر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ اس پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی ہے کہ جب تک دہشت گردی کی بنیاد کو ختم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک وطن عزیز میں امن وامان کی توقع کرنا عبث ہوگا۔ اسی طرح مذہبی دہشت گردوں کے ساتھ لسانی اور سیاسی دہشت گردوں کا خاتمہ بھی بے حد ضروری ہے۔ اگرچہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ دہشت گردوں کا خاتمہ تو سیکورٹی اداروں کی ذمہ داری ہے لیکن دہشت گردی کا سبب بننے والے عناصر کا پتہ چلانا حکومت یعنی انتظامیہ کے فرائض میں شامل ہے مگر 13 برس سے دہشت گردی کی بھٹی میں جلنے والے پاکستان کی خستہ حال معیشت دیکھ کر بھی ارباب اختیار کو ہوش نہ آیا کہ اس کی وجوہات کا اندازہ لگایا جائے جو انتہائی افسوسناک ہے۔ تاہم اب جبکہ فوج نے دہشت گردوں کے ساتھ فرقہ واریت کے خلاف بلاامتیاز کارروائی کا اعلان کیا ہے تو امید کی جانی چاہئے کہ سول حکومت بھی اس ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کرے گی اور تمام اسٹیک ہولڈرز پاکستان کو بچانے کے لئے اپنے حصے کا کردار انتہائی ایمانداری کے ساتھ ادا کریں گے۔ اس پر کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ پاکستان میں بسنے والی اقوام کا روشن مستقبل اسی طور محفوظ رکھا جا سکتا ہے کہ ریاست پوری قوت کے ساتھ ہر قسم کے نان اسٹیٹ ایکٹرز کے خلاف کارروائی کرے اور جو بھی اچھے یا برے شدت پسندوں کی منطقیں پیش کرے اس کے خلاف بھی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے میں مذہبی رواداری، مساوات، صبر وتحمل، بھائی چارے جیسے جذبات کو فروغ دینے میں علمائے کرام اپنے حصے کا کردار ادا کریں اور فرقہ پرستی اور فرقہ واریت کے زہر کی بیخ کنی کریں کیونکہ عالمی تجزیہ کار تو کئی برسوں سے پاکستان کے

ارباب اختیار کی توجہ اس امر کی جانب دلا رہے ہیں کہ انتہا پسندی ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارا معاشرہ تو درحقیقت دو انتہاؤں میں بٹ کررہ گیا ہے جو کسی طور بھی درست طرز عمل نہیں۔اس لئے سول حکومت کو بھی اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کرنا چاہئے اور فوج نے پہلی مرتبہ دہشت گردی کی بیماری کی تشخیص کر دی ہے تو اسے مل کر ختم کرنا ہوگا،یہی وقت کی پکار ہے۔اس کے لئے ہمیں پاک فوج کے ساتھ سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑا ہونا ہے۔اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ وطن عزیز کی تاریخ میں پہلی بار ہمیں ایسی عسکری قیادت اور عسکری ٹیم میسر آئی ہے جو ہماری جغرافیائی سرحدوں کے ساتھ ساتھ ہماری نظریاتی سرحدوں کو اس کی اصل بنیادوں پر استوار کر رہی ہے اس لئے موجودہ عسکری قیادت کو قومی تاریخ کی بہترین عسکری ٹیم قرار دیا جاسکتا ہے۔

قومی اتفاق رائے کے لئے پاک فوج کی کوششیں

یکم جنوری 2015ء کو پاک فوج کے سربراہ جنرل راحیل شریف کی زیر صدارت جنرل ہیڈ کوارٹرز میں ہونے والی 178 ویں کور کمانڈرز کانفرس میں اس عزم کا اعادہ کیا گیا ہے کہ ملک سے آخری دہشت گرد کے خاتمے تک جنگ جاری رہے گی،دہشت گردی کے خلاف وسیع سیاسی اتفاق رائے کو چھوٹے اختلافات کی نذر نہ کیا جائے،کور کمانڈرز نے قومی ایکشن پلان کی مکمل حمایت کا اعلان کیا،جنرل راحیل شریف نے سیاسی قیادت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اہم فیصلوں کی گھڑی آن پہنچی ہے،کامیابی کی کنجی قومی ایکشن پلان پر متحد ہو کر عمل کرنے میں ہے،سانحہ پشاور کے بعد پوری قوم دہشت گردوں اوران کے ہمدردوں کے خلاف جرأت مندانہ فیصلوں کے لئے سیاسی و فوجی قیادت کی طرف دیکھ رہی ہے،دہشت گردی کے خاتمہ کے لئے عسکری قیادت پوری قوم کے ساتھ ہے،دہشت گردوں سے سانحہ پشاور کا حساب لیا جائے گا،قومی ایکشن پلان پر عملدرآمد

کریں گے تا کہ قوم کو دہشت گردی کے ناسور سے چھٹکارا دلاسکیں۔ اجلاس میں ملک میں جاری آپریشنز کا جائزہ لیا گیا اور ملک کی مجموعی سیکورٹی صورتحال پر بھی تبادلہ خیال کیا گیا۔ اجلاس میں خاص طور پر نیشنل ایکشن پلان پر غور کیا گیا، کور کمانڈر نے 16 دسمبر کے سانحہ پشاور پر غمزدہ خاندانوں کے ساتھ اظہار تعزیت کیا اور قیمتی جانوں کے ضیاع پر اپنے گہرے دکھ، رنج اور غم کا اظہار کیا، کور کمانڈرز نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ دہشت گردوں کے خاتمہ تک فوجی آپریشنز جاری رہیں گے، کانفرنس کے شرکاء نے اس عزم کا اظہار کیا کہ آخری دہشت گرد کے خاتمہ تک جنگ جاری رکھی جائے گی۔ آرمی چیف نے کور کمانڈرز کانفرنس سے خطاب میں کہا کہ دہشت گردوں کے خاتمہ کے لئے نہ صرف فوجی آپریشن جاری رہیں گے بلکہ انہیں مزید مضبوط کیا جائے گا، اس وقت اہم فیصلوں کی گھڑی آن پہنچی ہے اور قوم عسکری اور سیاسی قیادت کی جانب دیکھ رہی ہے دہشت گردی کے خلاف کامیابی قومی لائحہ عمل پر متحد ہو کر عمل کرنے میں ہے، آرمی چیف نے سیاسی قیادت کو بھی خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ سیاسی قیادت نے 24 دسمبر 2014ء کو متفقہ لائحہ عمل کے ذریعہ ایک نیشنل ایکشن پلان بنایا اور 20 نکاتی ایجنڈہ سامنے آیا، آرمی چیف کا کہنا تھا کہ دہشت گردی کے خلاف فیصلہ کن جنگ شروع کی گئی ہے اس کی کامیابی کی کنجی قومی لائحہ عمل پر متحد ہو کر عمل کرنے میں ہے، سیاسی اور عسکری قیادت متحد ہو کر اس ایکشن پلان پر عمل کرے، آرمی چیف کا کہنا تھا کہ دہشت گردی کے خاتمہ کے لئے ہم قوم کی امنگوں پر پورا اتریں گے اور پوری تندہی کے ساتھ دہشٹ گردوں کو مار بھگائیں گے اور دہشت گردی کو پاکستانی معاشرے سے جڑ سے اکھاڑ دیں گے۔

کور کمانڈرز کانفرنس کے اگلے روز 2 فروری 2015ء کو وزیراعظم نواز شریف کی صدارت میں ایک اور آل پارٹیز کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں سیاسی قیادت کے علاوہ عسکری قیادت نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے کہا ہے کہ قوم کے مستقبل کا انحصار ہمارے آج کئے گئے فیصلوں پر

ہے، دہشت گردی کے خلاف جنگ فیصلہ کن موڑ پر آ گئی، خصوصی عدالتیں فوج کی خواہش نہیں بلکہ وقت کی ضرورت ہیں، صورتحال بہتر ہوتے ہی اصل نظام بحال ہو جائے گا، اے پی سی میں طے پانے والے معاملات پر فوری عملدرامد ہونا چاہئے، بحثیت ریاست اور قوم اس جنگ میں شکست کا تصور بھی نہیں کر سکتے، انشا اللہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ضرور کامیابی حاصل کریں گے، ہمیں بڑے فیصلے کرنے کی ضرورت ہے، اتفاق رائے کی فضاء قائم رہنی چاہئے، سیاسی قیادت نے جس حمایت کا مظاہرہ کیا ہے وہ ہماری طاقت ہے۔ خصوصی عدالتیں فوج کی خواہش نہیں، غیر معمولی حالات کا تقاضا اور وقت کی ضرورت ہیں۔ صورتحال بہتر ہونے پر اصل نظام بحال ہو جائے گا۔ جنرل راحیل شریف نے کہا اے پی سی میں طے ہونے والے معاملات پر فوری عملدرآمد ہونا چاہئے، قوم کے مستقبل کا انحصار آج کئے گئے فیصلوں پر ہے۔ توجہ عملدرآمد پر مرکوز رکھنا ہوگی۔ دہشت گردوں کے خلاف جنگ فیصلہ کن موڑ پر آ گئی، بحثیت ریاست اور قوم شکست کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ہم جیتیں گے انشاء اللہ۔ انہوں نے کہا کہ پہلی اے پی سی میں پیدا ہونے والی اتفاق رائے کی فضا قائم رہنی چاہئے ہمیں بڑے فیصلے کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ سیاسی قیادت نے جس سپورٹ کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان کی طاقت ہے۔

اِس اے پی سی میں فوجی عدالتوں کے قیام پر سیاسی جماعتوں کے تحفظات عسکری قیادت نے دور کر دیئے اور سیاسی جماعتوں کو اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ ان عدالتوں مین صرف ریاست دشمنوں کے خلاف مقدمات چلائے جائیں گے، دہشت گردوں کا ٹرائل ان عدالتوں میں ہوگا، عسکری قیادت کی یقین دہانی کے بعد تمام سیاسی اور پارلیمانی جماعتیں فوجی عدالتوں کے قیام پر متفق ہوئیں، جس کے بعد اس حوالے سے اے پی سی میں ان عدالتوں کے قیام کی متفقہ قرارداد منظور کی گئی۔ وفاقی حکومت کے انتہائی باخبر ذرائع نے بتایا کہ وزیراعظم نواز شریف نے اجلاس میں واضح کیا ہے کہ ان عدالتوں کا غلط استعمال

روکنے کے لئے جامع میکنزم تشکیل دیا جائے گا۔ ذرائع نے بتایا کہ کانفرنس میں اتفاق کیا گیا کہ وفاقی سیکریٹری داخلہ کی سربراہی میں ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی قائم کی جائے گی جس میں وزارت دفاع، وزارت قانون و انصاف، قانون نافذ کرنے والے اداروں اور صوبائی حکومت کے نمائندے شامل ہوں گے، یہ کمیٹی مقدمات کو اسپیڈی ٹرائل کورٹس میں بھیجنے کی منظوری دے گی، اجلاس میں حکومت اور سیاسی جماعتوں میں اس بات پر بھی اتفاق کیا گیا کہ کوئی بھی ایسا شخص جس کا تعلق کسی بھی سیاسی یا مذہبی جماعت سے ہو، اگر وہ کالعدم تنظیموں یا دہشت گرد تنظیموں کی کسی بھی سطح پر معاونت کرے گا یا اس کی سرگرمیاں ملکی مفاد کے خلاف ہوں گی تو وہ ریاست کا دشمن تصور قرار پائے گا اور اس کے خلاف بھی مقدمہ اسپیڈی ٹرائل کورٹ میں چلایا جائے گا، یہ بھی طے پایا کہ کوئی بھی شخص انفرادی طور پر یا اس کا تعلق کسی کالعدم تنظیم سے ہو، عبادت گاہوں، تعلیمی اداروں، حساس و عسکری تنصیبات اور پبلک مقامات پر دھماکوں اور سنگین واقعات میں ملوث ہوا تو اس کا ٹرائل بھی ان عدالتوں میں ہوگا۔ اجلاس میں اتفاق کیا گیا کہ وزیراعظم کی سربراہی میں ایک اعلیٰ سطح کی مانیٹرنگ کمیٹی تشکیل دی جائے گی، جس میں اہم وفاقی وزراء، پارلیمانی جماعتوں کے نمائندے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حکام شامل ہوں گے، کمیٹی عدالتوں میں بھیجے جانے والے مقدمات سے متعلق شکایات کا جائزہ اور ازالہ کرنے کے حوالے سے اقدام کرے گی تاہم اس کے قیام کا حتمی فیصلہ عسکری قیادت کی مشاورت سے ہوگا۔

21 ویں آئینی ترمیمی مسودے پر اتفاق رائے ہونے سے قبل آل پارٹیز کانفرنس میں جب ڈیڑھ گھنٹے تک آئینی اور قانونی موشگافیوں پر بحث ہوتی رہی، اعتزاز احسن اور فاروق نائیک آئینی ترمیم کی مخالفت میں دلائل دیتے رہے اور انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آرمی ایکٹ میں ترمیم سے ہی مسئلہ حل ہو جائے گا جبکہ اٹارنی جنرل اور ایم کیو ایم کے فروغ نسیم نے آئینی ترمیم کے حق میں دلائل دیئے ابھی ان کے دلائل جاری تھے کہ

سینیٹر مشاہد حسین سید نے مداخلت کی اور کہا جناب وزیراعظم صاحب ہمیں لگتا ہے کہ ہم اے پی سی میں نہیں بلکہ سپریم کورٹ کے کورٹ روم میں آ گئے ہیں جہاں وکیل دلائل دے رہے ہیں باہر لوگ انتظار کر رہے ہیں اور آپ فیصلہ نہیں کر پا رہے یہاں قومی قیادت بیٹھی ہے آپ سیاسی فیصلے کریں اور مجھے لگتا ہے کہ جو بھی یہاں بات ہو رہی ہے وہ خوف کی بنیاد پر ہو رہی ہے کسی کو خوف ہے سپریم کورٹ کا، کسی کو سول سوسائٹی کا، کسی کو میڈیا کا اور آپ بھی خوف میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اتنا بڑا سانحہ ہو گیا اور ہم یہاں قانونی بحث میں الجھے ہوئے ہیں ساتھ ہی مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین نے وزیراعظم سے مخاطب ہو کر کہا کہ وزیراعظم صاحب جرأت مندانہ فیصلے کریں چاہے غیر مقبول کیوں نہ ہوں اور ان فیصلوں کی وجہ سے آپ کی کرسی ہی چلی جائے مگر فیصلے مضبوط دلیرانہ اور جرأت مندانہ کریں چوہدری شجاعت نے شرکا سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ ذرا تصور کریں جس ماں نے اپنے بچے کو صبح تیار کر کے اسکول بھیجا تھا اس کے اسکول بیگ میں سینڈوچ رکھے تھے اور وہ دوپہر کو کھانے پر اپنے بچے کا انتظار کر رہی تھی مگر بچہ تو نہ ملا بچے کے ٹکڑے اسے ضرور ملے اگر ہم میں سے کسی کا یا کسی جج کا بچہ ہوتا تو وہ کیا آئین کی بات کرتا۔ چوہدری شجاعت حسین کی تقریر پر شرکا میں رقت طاری ہو گئی اور سارا ماحول تبدیل ہو گیا چوہدری شجاعت حیسن نے یہ بات بھی کہی کہ 24 دسمبر کو مشاہد حسین نے اے پی سی میں جو موقف اختیار کیا تھا ہم اس پر قائم ہیں کہ آئینی ترمیم ہونی چاہیئے اس کے بعد میاں نواز شریف نے چوہدری شجاعت حسین اور مشاہد حسین کا نام لے کر کہا کہ انہوں نے بہت اچھی باتیں کی ہیں اور میں ان سے متفق ہوں، کام کرنے کا یہی طریقہ ہے اور میاں صاحب کے ریمارکس کے ساتھ ہی کانفرنس کا رخ بھی تبدیل ہو گیا۔ بعد میں سابق صدر آصف علی زرداری نے اپنی پارٹی کے موقف کو مسترد کر دیا اور کہا کہ جو فیصلہ کرنا ہے میں آپ کے ساتھ ہوں آئینی ترمیم کرنی ہے تو اس کا فیصلہ کر لیں۔ مولانا فضل الرحمٰن نے کہا کہ مدارس کو نہ چھیڑیں۔ عمران خان نے

پہلے آئینی ترمیم کی مخالفت اور پھر حمایت کی، انہوں نے کہا کہ فوجی عدالتوں کے قیام کی وکیل مخالفت کریں گے اس لئے ہائی کورٹ کے ججوں کو خصوصی عدالتوں میں لگا دیا جائے جس پر مشاہد حسین سید نے عمران خان کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ آزمودہ اور ناکام فارمولا ہے اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ سابق وزیر داخلہ سینیٹر رحمان ملک نے مدرسہ ریفارمز کے سلسلے میں اتحاد تنظیمات مدارس کے ساتھ معاہدے کا مسودہ پیش کیا یہ معاہدہ ان کے دور میں طے پایا تھا اور کہا کہ مدرسہ ریفارمز میں اس سے مدد مل سکتی ہے۔ بلوچستان کی قیادت نے کھل کر فوجی عدالتوں کے قیام کی حمایت کی۔ سینیٹر میر حاصل بزنجو نے کہا کہ 20 سال سے ہم آرمی کے اور آرمی ہمارے خلاف رہی، پہلی بار دیکھ رہے ہیں کہ آرمی میں بڑی تبدیلی آئی ہے اور آرمی دہشت گردی کے خلاف بھرپور قوت سے سامنے آئی ہے یہ اچھا موقع ہے کہ ملک کو دہشت گردی سے نجات دلائی جائے اور ہم اتفاق رائے کے اقدامات کی حمایت کریں گے۔ آفتاب شیر پاؤ نے بھی سیاسی اتفاق رائے کا ساتھ دیا تو وزیراعظم نے اعلان کر دیا کہ ہم کل ہی قومی اسمبلی میں ترمیمی بل پیش کر دیں گے تاکہ فیصلوں پر پورے طریقے سے عمل کرایا جا سکے ذرائع نے بتایا کہ میاں نواز شریف نے تاریخ کے اس نازک موڑ پر قومی اتفاق رائے پر سیاسی اور عسکری قیادت کے تعاون کو سراہتے ہوئے یقین دلایا کہ حکومت اس اعتماد پر پورا اترے گی اور ملک کو دہشت گردی کے ناسور سے نجات دلائے گی وزیراعظم نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوتے ہوئے چوہدری شجاعت حسین سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا مشاہد حسین سید کو مبارکباد دی۔ آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے بھی اس موقع پر چوہدری شجاعت حسین اور مشاہد حسین کو مبارکباد دی۔ قبل ازیں آل پارٹیز کانفرنس میں وزیراعظم کے خطاب کے بعد آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے مختصر خطاب میں کہا کہ مضبوط فیصلے کریں تاکہ ہم دہشت گردی پر قابو پا سکیں بعد میں وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان نے کہا کہ کسی بھی کالعدم تنظیم کو دوسرے نام سے کام

کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور ہم دہشت گردوں کے ہمدردوں کے ساتھ زیرو ٹالرنس (قطعی عدم برداشت) کے رویے پر کام رہے ہیں انہوں نے کہا کہ تمام قانون نافذ کرنے والے اداروں کو متحرک کیا گیا ہے اسلحہ لائسنسوں کی جانچ پڑتال ہو رہی ہے مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو کنٹرول کیا جا رہا ہے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے استعدادی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔انہوں نے کہا کہ دہشت گردوں کو ہیرو بنا کر پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ چار گھنٹے سے زیادہ دیر جاری رہنے والے اس اجلاس میں جو رہنما آئینی ترمیم کی مخالفت کر رہے تھے انہوں نے بھی بالآخر ترمیم کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ذرائع کے مطابق اے پی سی میں عمران خان کا کیس ایک بار پھر پیش ہوا اور انتخابی دھاندلیوں کی تحقیقات کے لئے عدالتی کمیشن بنانے کے لئے معاملے پر وزیر خزانہ اسحاق ڈار نے تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کیا کہ مسودہ تیار کر لیا گیا ہے۔

21ویں آئینی ترمیم اور سیاسی جماعتوں کا مخمصہ

فوجی عدالتوں کے قیام کے وقت پاکستان پیپلز پارٹی عجیب مخمصے کا شکار نظر آئی، تیسری پارلیمانی کل جماعتی کانفرنس میں جنرل راحیل شریف نے یہ اعلان کر کے کہ فوجی عدالتوں کا قیام فوج کی خواہش نہیں، ہنگامی قومی حالات کا تقاضہ ہے، ان اندیشیوں کو بے بنیاد ثابت کیا کہ ان فوجی عدالتوں کے ذریعے غیر جمہوری عناصر کی طرف سے ایک مرتبہ پھر ''میرے عزیز ہم وطنو!'' کی آواز آئے گی، سابق صدر 27 دسمبر کو بے نظیر بھٹو کے یوم شہادت پر گڑھی خدا بخش میں اپنے خطاب میں ان کا کہنا تھا کہ وہ ملٹری کورٹس کے قیام کے حوالے سے قانون کی صرف اس صورت میں حمایت کریں گے کہ یہ قانون غلط استعمال نہ ہو۔ اسے سیاست دانوں، صحافیوں اور دانشوروں کے خلاف استعمال نہ کیا جائے۔ انہوں نے اس خدشے کا بھی اظہار کیا کہ کہیں وہ خود اور میاں محمد نواز شریف جیل نہ چلے جائیں

کیونکہ اس طرح کا قانون جب پہلے ایا تھا تو وہ جیل میں تھے۔

جنرل راحیل شریف کی دوٹوک وضاحت کے بعد آصف علی زرداری نے ایک بالغ نظر جمہوری سیاست دان ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ہنگامی قومی حالات کے تقاضوں کے تحت اس تیسری کل جماعتی کانفرنس کو کامیاب بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا اور فوجی عدالتوں کے قیام کے سلسلے میں قومی سطح کی سیاسی مفاہمت کو برقرار رکھنے کے علاوہ اسے نتیجہ خیز بھی بنایا۔ وفاقی وزیر اطلاعات ونشریات اور قومی ورثہ، سینیٹر پرویز رشید نے اے پی سی میں آصف علی زرداری کے کردار کی تعریف وتوصیف میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سابق صدر نے اتفاق رائے پیدا کرنے میں انتہائی مثبت اور قائدانہ کردار ادا کیا۔

سیاسی تجزیہ نگار یہاں تک کہنے پر مجبور ہو گئے کہ آصف علی زرداری ملک میں جس طرح کی اپوزیشن کر رہے ہیں یہ دنیا کے جمہوری ممالک سے ملتی جلتی اپوزیشن پاکستان میں نئی روایت ہے۔

فوجی عدالتوں کے لئے آئین میں ترمیم پر قومی قیادت متفق ہو گئی۔ پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف زرداری، تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان، جمعیت علمائے اسلام (ف) کے امیر مولانا فضل الرحمٰن مان گئے۔ ایم کیو ایم اور اے این پی نے بھی ہاں کر دی۔ خصوصی عدالتوں کے لئے آئین میں ترمیم پر سب رضامند ہو گئے ہیں۔

پرویز رشید نے اے پی سی میں ہونے والے فیصلوں کے بارے میں میڈیا کو بریفنگ دیتے ہوئے 21 ویں آئینی ترمیم کا بل قومی اسمبلی اور سینیٹ میں پیش کرنے کا اعلان کیا اور ایک بار پھر انہوں نے آصف زرداری کے کردار کو سراہا۔ 7 جنوری 2015ء کو 21 ویں ترمیم کا بل قومی اسمبلی اور بعدازاں سینیٹ میں پیش کر دیا گیا جو صرف چار گھنٹے بعد ہی بل سے ایکٹ بن گیا اور نافذ بھی ہو گیا۔ آئین کی 21 ویں ترمیم کے ذریعے بننے والی تمام فوجی عدالتیں 6 جنوری 2017ء کی رات 12 بجے خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ آئین

کی 21ویں ترمیم 7 جنوری 2017ء سے آئین کا حصہ نہیں رہے گی۔ ذرائع کے مطابق اسپیکر قومی اسمبلی وزارت پارلیمانی امور وزیر اعظم آفس ایوان صدر اور یہاں سے واپس وزیر اعظم آفس کا سفر آئین کی 21ویں ترمیم کے بل نے 4 گھنٹے میں طے کیا۔ بدھ کی صبح اسپیکر قومی اسمبلی ایاز صادق کی طرف سے آئین کی 21ویں ترمیمی بل کی سمری اور اس کا فارورڈنگ میمو وزارت پارلیمانی امور پہنچا جس میں لکھا گیا تھا کہ قومی اسمبلی اور سینیٹ کے دو تہائی سے زائد ارکان نے آئین کی 21ویں ترمیم کے بل کی منظوری دے دی ہے اس بل کو دستخطوں کے لئے صدر مملکت کو پیش کیا جائے۔ وزارت پارلیمانی امور سے ہنگامی طور پر یہ سمری وزیر اعظم ہاؤس پہنچائی گئی جسے وزیر اعظم نواز شریف نے کسی قسم کے وقت کے ضیاع کے بغیر اپنے دستخطوں کے ساتھ ایوان صدر صدر ممنون حسین کے پاس بھجوایا۔ صدر ممنون حسین نے نماز ظہر ادا کرنے سے قبل اس پر دستخط کر دیئے دستخط کرنے کے بعد انہوں نے ظہر کی نماز ادا کی۔ صدر کے دستخط ہونے سے 21واں ترمیمی بل آئین کے 21ویں ترمیمی ایکٹ کی شکل اختیار کر گیا نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد صدر کے سیکریٹری نے آئین کے 21ویں ترمیمی ایکٹ کی سمری وزیر اعظم کے سیکریٹری کو تقریباً 3 بجے بھجوادی وزیر اعظم سیکریٹریٹ نے اس کا نوٹیفکیشن متعلقہ ڈویژن سے کرانے کے لئے بعد نماز عصر بھجوادیا یہ ترمیمی ایکٹ بدھ 7 جنوری 2015ء سے پاکستان بھر میں نافذ ہو گیا ہے۔ آصف علی زرداری کے 21ویں آئینی ترمیم کی حمایت کے فیصلے پر بلاول بھٹو زرداری نے کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ پارلیمنٹ نے 21ویں ترمیم پر اپنا چہرہ بچانے کے لئے ناک کٹوالی ہے۔ سینیٹ میں 21ویں آئینی ترمیم پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے سینیٹ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے پارلیمانی لیڈر سینیٹر رضا ربانی نے (جواب سینیٹ کے بلا مقابلہ چیئرمین منتخب ہو گئے ہیں) کہا کہ مجھے 10 سال سینیٹ میں ہو چکے ہیں جتنا شرمندہ آج ہوں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا، یہ ووٹ پارٹی کی امانت تھا جو میں نے دے دیا، آئندہ کا

لائحہ عمل میرے اوپر ہے آج میں نے اپنے ضمیر کے خلاف ووٹ دیا یہ کہہ کر وہ آبدیدہ ہو کر مزید کچھ کہے بغیر بیٹھ گئے اور بعدازں وہ ایوان سے باہر چلے گئے۔

اپوزیشن لیڈر اعتزاز احسن نے کہا کہ میرے لئے بہت مشکل ہے کہ میں اس پر بات کروں۔ میرے ساتھی بھی بہت مشکل میں بات کر رہے ہیں۔ ہم نے 50 سال فوجی حکومتوں کی مخالفت کی۔ ہم جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق، جنرل یحییٰ اور جنرل مشرف کی مخالفتوں میں لگے رہے۔ فوجی عدالتوں کے قیام کے ہم سب سے پہلے مخالف تھے۔ لیکن پشاور میں معصوم بچوں کو جس انداز میں مارا گیا۔ ہم نے سوچا کہ اب بس ہو گئی ہے اب بہت کچھ ہو چکا جب فوجی عدالتوں کے قیام کی بات میرے سامنے رکھی گئی تو میں نے اس کی مخالفت کی۔ اس وقت 50 سالہ سیاسی جدوجہد سامنے آئی انہوں نے کہا کہ میں یہاں کھڑا ہوں، میں نے میاں رضا ربانی کو ووٹ دینے کے لئے کہا مگر وہ اعتزاز احسن جو سوات کا اسکول بچاتے ہوئے شہید ہو گیا تھا آج میرے دل میں موجود ہے مگر ایک اور اعتزاز احسن مر گیا ہے۔ اعتزاز احسن نے تجویز پیش کی کہ ڈی چوک کو آرمی پبلک اسکول کی پرنسپل بیگم طاہر قاضی کے نام سے منسوب کیا جائے جس پر ایوان میں تالیاں بجائیں گئیں۔

جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی نے 21 ویں آئینی ترمیم اور فوجی عدالتوں کے قیام کی حمایت نہیں کی حالانکہ مولانا فضل الرحمٰن نے تیسری آل پارٹیز کانفرنس میں آئینی ترمیم کا بل قومی اسمبلی و سینیٹ میں پیش کرنے کی حمایت کی تھی۔ دونوں ایوانوں میں جب ترمیمی بل کے لئے ووٹنگ کرائی گئی تو ان جماعتوں کے ارکان ایوان سے غائب تھے۔ آئینی ترمیم کی منظوری کے بعد پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے جے یو آئی کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن نے ترمیم کی منظوری کے حوالے سے حکومتی طرز عمل پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا کہ دہشت گردی مذہبی یا غیر مذہبی نہیں ہوتی، شکر ہے گناہ سے بچ گئے، جمہوری حکومت میں فوجی عدالتیں اور آئین میں ترمیم کے موقع پر مذہبی جماعتوں کے

تحفظات اور خدشات کو نظر انداز کر دینا درحقیقت ملک کو سیکولر نظام کی جانب لے جانے کی طرف پہلا قدم ہے لیکن یہ ملک اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور اسلام کے نام پر ہی قائم رہے گا۔ ہم ملک کی دینی قوتوں اور مذہبی جماعتوں کے ساتھ مل کر اس بین الاقوامی ایجنڈے کو کسی صورت آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ ایوان میں ترمیم پیش کیے جانے سے قبل حکومتی وزراء کی ٹیم ان کے پاس مشاورت اور آئینی ترمیم کے قانونی پہلوؤں پر ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے آئی تھی لیکن گفتگو کے دوران ہی ایوان میں ترامیم کی منظوری پر کارروائی شروع کر دی گئی۔ اس بات سے معاملات میں حکومتی طرز عمل کی سنجیدگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 21ویں آئینی و آرمی ایکٹ میں ترمیم کے حوالے سے حکومت نے ان کو اعتماد میں نہیں لیا، اس حوالے سے ہم تمام مکاتب فکر، مذہبی و سیاسی جماعتوں، مدارس کی انتظامیہ کا جلد اجلاس بلائیں گے جس میں جامع ردعمل دیا جائے گا اور ہم پاکستان کو سیکولر ریاست نہیں بننے دیں گے۔ تمام جماعتوں سے مشاورت کے بعد ردعمل دیں گے کیونکہ ملٹری کورٹس سپریم کورٹ سے ماورا ہیں، سپریم کورٹ کا کردار اہم ہے، یہ یا تو دباؤ میں کیا گیا ہے یا پھر پارلیمنٹرین جھانسے میں آ گئے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں بل کی منظوری میں حصہ لینے سے گناہ سے محفوظ رکھا۔ انہون نے کہا کہ دہشت گردی صرف دہشت گردی ہوتی ہے لیکن اس میں مذہبی دہشت گردی کی تقسیم اور امتیاز کیوں کیا جارہا ہے۔ سانحہ پشاور کو مذہبی دہشت گردی قرار دے کر ہمیں فوج کے حوالے کیا جارہا ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن نے کہا کہ نائن الیون کو دنیا نے مذہبی دہشت گردی سے منسوب کر کے اپنے مفادات کی تکمیل کی لیکن اب سانحہ پشاور پر بھی ایسی ہی باتیں کی جارہی ہیں۔ ان باتوں سے دینی مدارس اور دینی طبقوں کو کیا پیغام دیا جارہا ہے۔ نائن الیون کے مقابلے میں سانحہ پشاور ہمارے لئے زیادہ کرب، اذیت اور دکھ کا باعث ہے کیونکہ ہمارے گھر کا اور ہمارے بچوں کا سانحہ ہے لیکن اسے مذہبی طبقوں کے خلاف

کیوں استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کی جانب سے دہشت گردوں کے خلاف تیز رفتار سماعت کے لئے فوجی عدالتوں کی تشکیل کی مخالفت حیران کن ہے، جبکہ یہ مذہبی سیاسی جماعتیں ماضی میں ہمیشہ فوجی آمروں خصوصاً جنرل پرویز مشرف کا ساتھ دیتی رہی ہیں، قومی اسمبلی اور سینیٹ میں 21 ویں آئینی ترمیم اور پاکستان آرمی (ترمیمی) بل 2015ء کی منظوری کے وقت یہ دونوں جماعتیں غیر حاضر رہیں اور ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا، حالانکہ جے یو آئی اور جماعت اسلامی نے بدنام لیگل فریم ورک آرڈر 2002ء کے حق میں ووٹ دیئے تھے جو سابق صدر و آرمی چیف جنرل پرویز مشرف نے جاری کیا تھا، جبکہ پی پی اور ن لیگ نے ایل ایف او کی اس بناء پر مخالفت کی تھی کہ اس کی حمایت کا مطلب جنرل پرویز مشرف کے 1999ء کے فوجی اقتدار پر قبضے کی حمایت کرنا تھا۔ جنرل پرویز مشرف دسمبر 2003ء میں قاضی حسین احمد اور مولانا فضل الرحمٰن کو 17 ویں آئینی ترمیم کی حمایت کرنے کے لئے منانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس ترمیم کے ذریعہ لیگل فریم ورک آرڈر کو آئین کا حصہ بنا دیا گیا جو ڈکٹیٹر کے لئے بڑا ریلیف تھا۔ ترمیم کے ذریعہ آرٹیکل 270AA لایا گیا اور مشرف کے 12 اکتوبر 1999ء کے اقدام کو قانونی حیثیت دے دی گئی، پرویز مشرف نے ملاؤں کی حمایت سے اسمبلی توڑنے کا اختیار بھی حاصل کر لیا۔ ان دونوں جماعتوں نے کل جماعتی کانفرنس کے دوران دہشت گردوں پر تیزی سے مقدمہ چلانے کے لئے دیگر سیاسی جماعتوں کا ساتھ دیا تھا مگر جب دہشت گردوں کو سبق سکھانے کا وقت آیا تو مذہبی عناصر نے انتہا پسندوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔

لہو کا قرض

یکم جنوری 2015ء کو سال نو کا آغاز ہوا...... دنیا بھر میں خوشیاں منائی گئیں......

پچھلے برس کو خوشی خوشی الوداع کیا گیا اور نئے برس کی آمد پر نیک خواہشات و توقعات کا اظہار کیا گیا...... مگر ایک ملک ایسا بھی ہے جہاں نئے برس کی ابتدا آنسو بھری آنکھوں اور اپنوں کے بچھڑنے کے دکھ کے ساتھ ہوا۔ یہ کوئی اور ملک نہیں ہمارا اپنا ملک پاکستان ہے جہاں پچھلے برس کا اختتام ایک سو بتیس ننھی منی معصوم کلیوں اور مستقبل کے معماروں کو قبر میں اتار کر کیا گیا...... کہ جب سولہ دسمبر 2014ء کو پشاور میں واقع آرمی پبلک اسکول پر دہشت گردوں نے حملہ کیا اور پورے اسکول کو خون سے نہلا دیا...... پاکستان تو غم میں ڈوبا ہی مگر پوری دنیا بھی اس وحشیانہ کارروائی پر سکتے میں آ گئی۔ بہر حال دکھ ہمارا اپنا تھا اور ہم نے ہی دراصل اسے جھیلا مگر اس ایک واقعے نے تمام سیاسی جماعتوں،فوج اور عوام کو اکٹھا کر دیا۔ اس واقعے کے بعد سب نے یہی عزم ظاہر کیا کہ ملک کو بچانا ہے تو دہشت گردوں کو ہر صورت مٹانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دہشت گردی کے مکمل خاتمے کے لئے سر توڑ کوششیں کی گئیں اور مختلف اقدامات بھی اٹھائے گئے۔ وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے کہا کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لئے سب کو مل کر مشکل فیصلے کرنا ہوں گے،ایک طاقت بن کر دہشت گردوں کا مقابلہ کرنا ہوگا اور تمام سیاسی جماعتوں نے ان کا ساتھ بھی دیا ہے۔ اسی حوالے سے ایک قومی ایکشن پلان بھی مرتب کیا گیا اور آئین میں ترامیم کر کے فوجی عدالتیں بھی قائم کی گئیں، جس کے متعلق حکومت کا کہنا ہے کہ فوری انصاف کے لئے یہ اقدام ضروری تھا۔ پنجاب اور خیبر پختون خوا میں تین، تین، سندھ میں دو اور بلوچستان میں ایک فوجی عدالت قائم کر کے کام کا آغاز کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ملک بھر میں پھانسی کی سزا پر عملدرآمد کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا جسے دہشت گردی کو قابو کرنے کے لئے اہم اقدام قرار دیا گیا۔ ملک کی موجودہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے ''دہشت گردی کا مقابلہ کیسے کیا جائے''۔ اس صورت حال میں سب سے زیادہ ضرورت قوم میں اتفاق و اتحاد کی تھی سانحہ پشاور کے بعد اے پی سی (آل پارٹیز کانفرنس) کے یکے بعد دیگرے تین طویل اجلاسوں

میں 20 نکاتی، پلان آف ایکشن کی منظوری کا اعلان کرتے ہوئے وزیراعظم میاں نواز شریف نے اسے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ایک 'فیصلہ کن' لمحہ قرار دیا۔ان کے چہرے سے وہی اطمینان جھلک رہا تھا، جو 26 مارچ 1971ء کو مشرقی پاکستان سے واپسی پر، جہاں ایک دن پہلے ملٹری ایکشن کا آغاز ہوا تھا، مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے چہرے پر ہویدا تھا۔انہوں نے میڈیا سے کہا تھا: ''اللہ کے فضل سے پاکستان بالآخر بچ گیا ہے۔'' ہم میں سے وہ جو اس لمحے کے عینی شاہد ہیں، اپنی بدنصیب تاریخ میں ہر نئے فیصلہ کن لمحے کا لفظ سن کر ان کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔

1999ء میں پاکستان کو ایک ایسی جنگ میں جھونک دیا گیا جو دراصل ہماری جنگ نہ تھی۔امریکہ تو افغانستان میں اپنی جنگ ختم کر چکا مگر ہم اس حقیقت کا ادراک کیے بغیر برسر جنگ ہیں کہ صرف ملٹری آپریشن سے دہشت گردی ختم نہیں ہوگی۔یہ ایسا مرض ہے جس کا علاج سماجی واقتصادی پالیسیوں اور اچھی حکمرانی سے ممکن ہے۔اس میں کوئی تعجب نہیں کہ سانحہ پشاور قوم کے لئے ایک شدید جھٹکا ہے۔بلاشبہ یہ ایک غیر معمولی چیلنج ہے، جو ایک غیر معمولی ردعمل کا متقاضی ہے۔حکومت نے آئین کی دفعہ 232 کے تحت محدود ہنگامی صورتحال کا اعلان کرنے کے بجائے اے پی سی بلا کر ماورائے آئین اقدام کا آپشن اختیار کیا: اس طرح پارلیمنٹ کو پس پشت ڈال دیا گیا۔قوموں کی تاریخ میں فیصلہ کن لمحات آتے ہیں۔ہماری تاریخ میں بھی ایسے کئی لمحات آئے مگر افسوس یہ سب انتہائی اذیت ناک تھے۔فوجی تنصیبات اور اداروں پر بڑھتے ہوئے حملوں نے ایک مرتبہ پھر فوجی عدالتوں کی راہ ہموار کر دی۔جس کا صاف مطلب ہے کہ ملک کا عدالتی نظام اپنے پیچیدہ طریقہ کار کے تحت دہشت گردوں کے خلاف اس کے باوجود کہ انسداد دہشت گردی ایکٹ اور پاکستان تحفظ آرڈیننس موجود ہے کامیاب نسخہ نہ بن سکا۔اس لئے اس وقت عارضی طور پر ملٹری کورٹس وقت کی اہم ضرورت ہے۔اسے سانحہ پشاور کے شہید بچوں کے خون کا کرشمہ ہی

سمجھنا چاہئے کہ نہ صرف پوری قوم جاگ اٹھی بلکہ ساری قومی قیادت نے ہر قسم کے اختلافات بالائے طاق رکھتے ہوئے پوری یکجہتی کے ساتھ دہشت گردی کے سامنے صف آراء ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ایسے مواقع ہماری تاریخ میں کم کم ہی آئے ہیں۔یہ تو پہلی دفعہ ہوا کہ پارلیمنٹ کی نمائندگی کرنے والی تمام جماعتیں صرف دو ہفتوں میں تین بار مل بیٹھیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ صورت حال کی سنگینی کا احساس صرف حکومت یا پاکستان کی مسلح افواج کو نہیں، پوری سیاسی قیادت کو ہے۔بطور وزیر اعظم میاں نواز شریف کی ذمہ داری تو تھی ہی لیکن کسی بھی سیاسی جماعت نے ان کے ہاتھ مضبوط کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ آصف علی زرداری،عمران خان،سراج الحق،الطاف حسین،مولانا فضل الرحمٰن،محمود خان اچکزئی،اسفند یار ولی،حاصل بزنجو،اعجاز الحق،چوہدری شجاعت حسین،قبائلی اراکین سب نے یک زبان ہو کر دہشت گردی کے خلاف جنگ کو اپنی جنگ قرار دیا اور یہ عہد کیا کہ اس جنگ میں حکومت اور مسلح افواج کا بھرپور ساتھ دیا جائے گا۔اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایک آئینی عدالتی نظام رکھنے والی ریاست میں اس طرح کا غیر معمولی نظام اچھا نہیں لگتا۔ لیکن دلیل یہی ہے کہ اب تک ہم اپنے روایتی قانونی عدالتی نظام کے ذریعے دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ناکام رہے۔کہا جاتا ہے کہ قانون اور انصاف کا تقاضا مجرم کو سزا دینا ہوتا ہے لیکن اُس کا دوسرا اور اہم تقاضا بھی یہی ہوتا ہے کہ دوسروں کو نصیحت ہو اور وہ جان لیں کہ اس طرح کے کاموں میں کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔بدقسمتی یا ہمارے نظام کے کل پرزوں کی خامیوں کے باعث دہشت گرد من مانی کرتے رہے لیکن انہیں اپنے انجام تک پہنچانے والے اپنا کام نہ کر سکے۔جب دہشت گردی کی بھیانک وارداتیں کرنے والے قانون کے شکنجے میں نہ آسکے تو ان کا حوصلہ بڑھتا چلا گیا اور دوسری طرف قانونی نظام کی کمزوریاں بھی آشکار ہوتی چلی گئیں۔

یہی سبب ہے کہ اب فوری سماعت کی عدالتوں کا قیام ضروری سمجھا گیا۔یہ عدالتیں

ماضی کی فوجی عدالتوں سے بہت مختلف ہیں۔ عام طور پر ماضی کی عدالتیں غیر جمہوری دور میں فوجی ڈکٹیٹر قائم کرتے رہے۔ ان عدالتوں میں مخالف سیاست دانوں کو نشانہ بنایا جاتا رہا۔ پہلی دفعہ یہ عدالتیں قومی اتفاق رائے سے قائم ہونے والی آئینی اور قانونی ترامیم کے ذریعے بن رہی ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سول حکومت کسی بھی معاملے پر فوج کو اپنی مدد کے لئے بلا لیتی ہے۔ یہ اختیار خود آئین پاکستان نے بھی سول حکومت کو دے رکھا ہے۔ ماضی میں لاتعداد بار فوج کو زلزلوں یا سیلاب کے لئے بلایا گیا۔ اسی طرح اسلام آباد میں دھرنوں کے دوران بھی فوج کو آئین کے آرٹیکل 245 کے تحت بعض حساس عمارتوں کے تحفظ کے لئے طلب کیا گیا۔ آپریشن ضرب عضب بھی اسی آئینی آرٹیکل کے تحت ہو رہا ہے۔ اب کے حکومت اور آئینی ماہرین نے سوچا کہ خصوصی فوجی عدالتوں کے لئے شاید آرٹیکل 245 کافی نہیں۔ لہٰذا آئین میں ترمیم کی ضرورت محسوس کی گئی۔ لیکن دراصل معاملہ یہی ہے کہ فوج خود عدالتیں نہیں لگا رہی بلکہ ایک منتخب جمہوری حکومت فوج کو ایک خصوصی کام کی خاطر اپنی مدد کے لئے بلا رہی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ فوج یا فوجی عدالتیں اپنے طور پر کسی فرد یا تنظیم کے خلاف مقدمہ نہیں چلا سکیں گی۔ یہ اختیار وفاقی حکومت کے پاس ہے کہ وہ کونسا مقدمہ ان فوجی عدالتوں کے پاس بھیجتی ہے۔ اس کے علاوہ ان سنگین جرائم کا تعین بھی کیا گیا ہے جن کے مقدمات یہ عدالتیں سنیں گی۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ان عدالتوں کی معیاد کا آئینہ ترمیم میں ہی تعین کر لیا گیا۔ لکھ دیا گیا کہ دو سال بعد یہ عدالتیں بغیر کسی آئینی ترمیم کے خود ہی تحلیل ہو جائیں گی۔ ان شرائط سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ عدالتیں سیاسی مخالفین کے لئے استعمال نہیں ہو سکیں گی اور نہ ہی ایک خاص مدت کے بعد ہمارے آئینی نظام کا حصہ رہیں گی۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمیں اپنے موجودہ عدالتی نظام کو توانا، پولیس کو مستعد اور مجرموں کو سزا دینے کے عمل کو بہتر بنانا ہوگا۔ واقعی؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ حقائق کی یاد دہانی کے لئے کچھ

اعداد و شمار پیش خدمت ہیں: اس وقت پاکستانی عدالتوں میں تیس لاکھ سے زائد کیسز التوا کا شکار ہیں۔ صرف سپریم کورٹ میں ہی بیس ہزار سے زائد کیس موجود ہیں۔ لاہور ہائی کورٹ میں زیر التوا کیسز کی تعداد ساڑھے بارہ ہزار کے قریب ہے جبکہ پنجاب بھر کی عدالتوں میں نو لاکھ کے قریب کیسز التوا میں ہیں تو کیا محترم جج صاحبان سے اوور ٹائم لگوانے کا ارادہ ہے؟

دہشت گردی، بھتہ خوری اور اغوا برائے تاوان سے متعلق کیسز کا فیصلہ کرنے کے لئے انسداد دہشت گردی کی عدالتیں قائم کی گئی تھیں۔ اصل قانون کے مطابق یہ طے کیا گیا تھا کہ ان عدالتوں میں روزانہ کی بنیاد پر سماعت کرتے ہوئے سات دن کے اندر اندر مقدمے کو نمٹایا جائے گا۔ سندھ میں قائم شدہ انسداد دہشت گردی کی 33 عدالتوں نے گزشتہ سال 255 مجرموں کو سزا سنائی جبکہ 543 کو بری کر دیا۔ ان میں سے آٹھ عدالتوں نے پیش ہونے والے ہر ملزم کو بری کر دیا۔ اس وقت ان خصوصی عدالتوں میں بھی 2,697 کیسز التوا میں ہیں۔

پاکستان میں عدلیہ کی کارکردگی کو بہتر بنانے اور اس کا دائرہ کار بڑھانے کے لئے ایشین ڈویلپمنٹ بینک سے 350 ملین ڈالر کا قرضہ حاصل کیا گیا لیکن اس کی افسوسناک کارکردگی میں ذرہ برابر اضافہ نہ ہوا۔ میں جانتا ہوں کہ اس کام کے لئے غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں، جج حضرات اور وزارت قانون کے افسران کو بیرونی ممالک کے "اسٹڈی ٹورز" کرائے گئے لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ اقدامات ہمارے عدالتی نظام میں بہتری لانے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں۔ جس دوران ان پر کام کا دباؤ بڑھتا رہا، ہماری اعلیٰ عدلیہ نے بات بات پر سوموٹو ایکشن لینے، توہینِ عدالت کے نوٹس بھیجنے اور سیاسی کیسز کے حوالے سے میڈیا میں بلاناغہ بیانات دینے کی پالیسی اپنائے رکھی۔ کسی بھی چیف جسٹس کے امور میں شامل ہے کہ وہ ماتحت عدلیہ کی کارکردگی بڑھانے کی طرف توجہ دے، تاہم سابقہ چیف جسٹس نسبتاً غیر اہم معاملات پر ایگزیکٹو کو الجھائے رکھنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرتے دکھائی دیئے۔

یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ بات صرف آئین میں ترمیم اور آرمی ایکٹ میں تبدیلی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ دہشت گردی کے خاتمہ کے لئے یہ پہلی سیڑھی ہے۔اب ہمیں یہ ثابت بھی کرنا ہو گا کہ بحیثیت قوم ہم نے فوجی عدالتوں کے عارضی قیام کا جو فیصلہ کیا ہے وہ واقعی قومی مفاد میں ہر لحاظ سے صحیح فیصلہ تھا۔یاد رکھنے والی بات یہ بھی ہے کہ اس کے لئے مورخ اس وقت تک ہمیں معاف نہیں کرے گا جب تک زمینی حقائق امن کے حق میں تبدیل ہوتے نظر نہ آئیں۔ان دو سال میں انصاف کی جلد فراہمی سے دہشت گردی کی حوصلہ شکنی اور ان انسان کش وارداتوں میں کمی نظر آنا نہایت ضروری ہے ورنہ اس فیصلے کے ناقدین کسی کو بھی بخشیں گے نہیں۔

اتفاق واتحاد کا لازوال منظر

16 دسمبر 2014ء کو واسک روڈ پشاور کے آرمی پبلک اسکول پر دہشت گرد خودکار بندوقوں، بارودی سرنگوں اور بموں سے لیس ہو کر وحشی درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔وہ ایک ایک کلاس روم میں گئے جہاں انہوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔انہوں نے اسکول آڈیٹوریم میں دسویں جماعت کو دی جانے والی الوداعی پارٹی میں شامل طلباء کو پہلے یرغمال بنایا پھر ان کے معصوم جسموں پر سفا کی سے گولیاں برسا دیں۔طلبا اور اساتذہ سمیت 142 افراد سے ان کی زندگیاں چھین لی گئیں۔250 طلبا کو زخمی کر دیا۔انہوں نے ایک بار پھر اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا کہ ان کا اسلام تو کیا انسانیت سے بھی دور کا بھی تعلق نہیں۔

آرمی پبلک اسکول کے معصوم بچوں کی شہادت تاریخ انسانی کا ایسا دردناک اور دل خراش اپنی نوعیت کی واحد خوں چکاں داستان ہے جس نے رب العزت کے عرش کو بھی ہلا دیا ہو گا ایسے شہیدوں کا لہو بھلا کیسے رائیگاں جا سکتا ہے اسی لئے پلک جھپکتے ہی معصوم شہیدوں کی آہ و بکا جب افلاک سے ٹکرائی تو علم غیب حرکت میں آ گیا۔

ہمارے سیاست دان جنگی بنیادوں پر اکٹھے ہو گئے، ساری سیاست مٹا کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے، پوری قوم دکھ اور کرب میں مبتلا تھی۔ 17 دسمبر 2014ء کو حکومت نے پشاور میں آل پارٹیز کانفرنس طلب کی۔ تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان نے اپنا 126 دنوں کا طویل دھرنا ختم کر کے اے پی سی میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

یہ ایام پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ایک سو سے زائد معصوم بچوں کو نشانہ بنا کر دہشت گردوں نے پاکستانی قوم کے اعصاب پر جو شدید ترین حملہ کیا تھا، اسے اس طرح ناکام بنایا گیا کہ پاکستان کی سیاسی اور فوجی قیادتیں ایک نئے عزم کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے چوکس ہو گئیں۔ سولہ دن کے اندر تیسری بار ایک چھت کے نیچے جمع ہو کر نئی تاریخ رقم کر دی گئی۔ پشاور میں منعقدہ پہلے اجلاس میں جس 20 نکاتی ایکشن پلان کو آخری شکل دی گئی تھی، اس میں فوجی عدالتوں کا قیام خصوصی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ ملک بھر میں اس پر بحث کا بازار گرم رہا۔ قانون دانوں، تجزیہ نگاروں، اداریہ نویسوں اور سول سوسائٹی کے ترجمانوں کے ایک حلقے نے اسے مارشل لاء کی تمہید قرار دینا شروع کر دیا۔ ماضی کے واقعات میں مستقبل کی جھلک (دیکھنے اور) دکھانے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے سول انتظامیہ کی بالادستی دم توڑ جائے گی۔ فوجی اونٹ خیمے میں اس طرح داخل ہو گا کہ ''سیاسی بدو'' کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی، لیکن وزیراعظم نواز شریف نے لغزش نہیں دکھائی۔ آرمی چیف نے بھی غیر معمولی حالات میں غیر معمولی اقدامات کی افادیت پر زور دیا اور یوں ساری سیاسی قیادت نے قدم بڑھا لئے۔

2 جنوری کو سات گھنٹے سے زائد جاری رہنے والی کل جماعتی کانفرنس میں وکلا نے اپنے اپنے موقف کے حق میں پوری شدت سے دلائل دیئے۔ اعتزاز احسن اور فاروق نائیک کا کہنا تھا کہ آرمی ایکٹ میں ترمیم کے فوجی عدالتوں کے دائرہ کار میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سے آئین میں ترمیم کے بغیر مطلوبہ مقاصد حاصل ہو جائیں گے، جبکہ

اٹارنی جنرل سلمان بٹ اور بیرسٹر فروغ نسیم کی رائے تھی کہ آئین میں ترمیم کر کے ان اقدامات کو تحفظ دینا ضروری ہو گا وگرنہ یہ بآسانی عدالتی نظر ثانی کی نذر ہو سکیں گے۔ بحث طویل تھی لیکن سینیٹر مشاہد حسین نے یہ کہہ کر کڑا کے نکال دیئے کہ معلوم ہوتا ہے، یہ سیاسی رہنماؤں کا اجلاس نہیں، کورٹ روم ہے۔ انہوں نے سیاست دانوں کو للکار کر قائدانہ کردار ادا کرنے کے لئے کہا۔ چوہدری شجاعت حسین کی جذباتی مداخلت نے ماحول کا رنگ مزید بدلا۔ شہید ہونے والے بچوں کا ذکر ان کی زبان پر اس طرح آیا کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ (سابق) صدر آصف علی زرداری نے آگے بڑھ کر اپنی ہی جماعت کے وکلاء کے موقف کو رد کر دیا اور واضح کیا کہ وہ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہیں۔ ان کے الفاظ فیصلہ کن ثابت ہوئے، عمران خان بھی جو آئینی ترمیم کے بغیر قانونی اقدامات پر زور دے رہے تھے، اپنے آپ کو اتفاق رائے سے الگ نہ رکھ سکے۔

کل جماعتی کانفرنس میں شریک ہونے والے قانون دانوں کی طرح معاشرے کے مختلف طبقات میں بھی مختلف آراء کا اظہار ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ "پلڈاٹ" نے ایک خصوصی نشست میں ایس ایم ظفر، حامد خان، احمر بلال صوفی، اعظم تارڑ، سلمان راجہ اور عائشہ حامد صاحبان کو مدعو کیا تو ان میں بھی یہ اختلاف موجود تھا۔ فوجی عدالتوں کے قیام کی یکسر مخالفت بھی کی جا رہی تھی۔ لیکن بنیادی نکتہ یہ تھا (جو احمر بلال صوفی نے پوری شدت سے اٹھایا) کہ ہم زمانہ امن میں ہیں، یا حالت جنگ میں۔ اگر تو ہم جنگ کا آغاز کر چکے ہیں یا جنگ ہم پر ٹھونس دی گئی ہے تو پھر ہم ان قوانین کے کنویں میں نہیں ڈوب سکتے جو امن کی حالت میں لاگو ہوتے ہیں۔ حالات غیر معمولی ہوں گے تو اقدامات بھی غیر معمولی کرنا ہوں گے۔ دنیا کا کوئی آئین اور کوئی عدالت اس سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ برطانیہ کی پریوی کونسل کے فیصلے موجود ہیں اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کی عدالتوں سے بھی نظیریں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اسلامی فقہی اصولوں کے مطابق بھی حالات بدلنے سے

احکامات بدل جاتے ہیں۔ جان بچانے کے لئے وہ اشیاء کھائی جا سکتی ہیں، جو عام حالات میں جنہیں چھونا بھی گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہمارے عدالتی نظام کو کسی بھی طرح کے حالات میں اپنا کردار ادا کرنے کے قابل ہونا چاہیئے۔ سویلینز کی سربراہی میں قائم کی جانے والی خصوصی عدالتوں کو مستحکم کیا جانا چاہیئے۔ تفتیش کرنے والوں اور پراسیکیوٹ کرنے والوں کی تربیت کی طرف توجہ ہونی چاہیئے۔ قانون شہادت میں ضروری تبدیلیاں کی جانی چاہئیں، مقدموں کو لٹکانے کے وکلانہ حربوں کا سدباب کیا جانا چاہیئے، لیکن یہ سارے کام راتوں رات نہیں ہوسکتے، ان کے لئے وقت اور توجہ درکار ہے۔ تازہ ترین اقدامات مستقل نہیں ہیں، ان کو دو سال کے عرصے تک محدود کردیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان دو سال کے اندر اندر وہ سب کچھ کرلیا جائے جو سول انتظامیہ، پولیس اور عدالتی نظام کو موثر تر بنا سکے۔ دہشت گرد ہمیں کوئی مہلت دینے پر تیار نہیں ہیں، ہمیں بھی انہیں کوئی مہلت نہیں دینی چاہیئے۔ ساری توجہ اور توانائی ان کے عزائم کو چکنا چور کرنے پر لگا دینا ہی آج کا تقاضہ ہے۔ ایک انگریزی اخبار نے 21ویں آئینی ترمیم پر سیاستدانوں کی شکست بلکہ ''سرنڈر'' کی پھبتی کسی ہے۔ فاضل اداریہ نویس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بنیادی حقوق زندہ انسانوں اور زندہ معاشروں کے ہوتے ہیں۔ قبرستانوں میں ان کا بول بالا نہیں کیا جا سکتا۔ گلی گلی میں جنازے اٹھانے اور پچاس ہزار افراد قربان کردینے کے بعد بھی اگر فرقہ باز مولویوں کی طرح ہم مناظروں میں لگے رہیں گے تو پھر ہمارے ساتھ وہی ہوگا جو تاتاریوں کی فوج نے بغداد کے ساتھ کیا تھا۔ (بشکریہ۔ مجیب الرحمٰن شامی۔ روزنامہ پاکستان۔ 4 جنوری 2014ء)
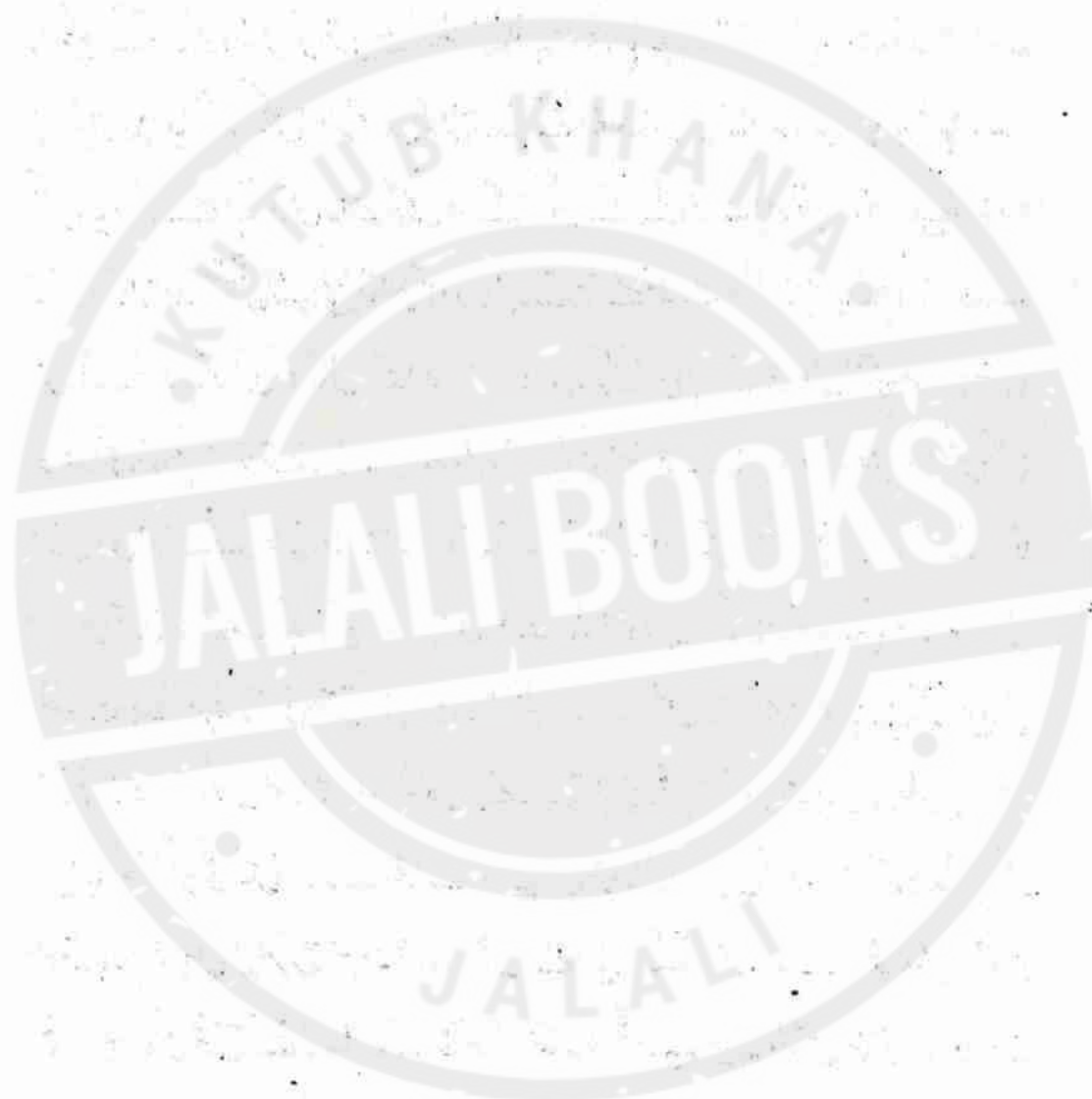
باب نمبر 2

☆......قومی ایکشن پلان

☆......اور کوئی آپشن نہیں تھا

☆......فوجی عدالتیں اور نظریہ ضرورت

☆......اعلیٰ عدلیہ اور فوجی عدالتیں

☆......اکیسویں ترمیم، مدت دو سال

☆......سینئر وکلاء کا موقف

☆......انسداد دہشت گردی ایکٹ

☆......ہنگامی حالات، ہنگامی قانون

☆......تحفظ پاکستان آرڈیننس

قومی ایکشن پلان

پشاور میں منعقدہ پہلی آل پارٹیز کانفرنس میں طویل بحث ومباحثہ کے بعد جس ''قومی ایکشن پلان'' کی منظوری دی گئی تھی اس پر سہ طرفہ غور ہوتا رہا۔ قومی ایکشن پلان کے 20 نکات کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

1- پھانسی کی سزا پر فوری طور پر عمل درآمد شروع کیا جائے گا۔

2- دہشت گردوں کو سزا دینے میں تاخیر سے بچنے کے لئے فوجی افسران کی سربراہی میں خصوصی ملٹری ٹرائل کورٹس قائم کئے جائیں گے۔ یہ کورٹس دو برس کی مدت تک کام کریں گے اور ان کے قیام کے لئے آئین میں ترامیم کی جائیں گی۔

3- کسی بھی عسکریت پسند گروپ یا ادارے کو کام کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

4- انسداد دہشت گردی کے ادارے، نیکٹا کو مضبوط، موثر اور فعل کیا جائے گا۔

5- مذہبی انتہاپسندی، مذہبی منافرت، فرقہ واریت اور عدم برداشت پر مشتمل لٹریچر، اخبارات اور میگزینز پر مکمل پابندی عائد ہوگی، کوئی بھی شخص یا ادارہ اس سرگرمی میں ملوث پایا گیا تو اس کے خلاف سخت کارروائی ہوگی۔

6- دہشت گرد اور ان کے گروپوں کی مالی معاونت کرنے والوں کے خلاف کارروائی کر کے تمام وسائل کو ختم کیا جائے گا۔

7- کوئی بھی کالعدم تنظیم نئے نام سے کام نہیں کر سکے گی۔

8- دہشت گردی کے خاتمے کے لئے دس ہزار فوجی جوانوں پر مشتمل خصوصی ٹاسک فورس تشکیل دی جائے گی۔

9- مذہبی انتہاپسندی کو روکنے اور اقلیتیوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں۔

10- تمام مدرسوں کو تصدیق اور حکومت پاکستان کے قواعد وضوابط کا پابند کر کے کام کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

11- پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا پر کسی بھی دہشت گرد یا تنظیم کا بیان شائع یا نشر کیا گیا تو اس پر بھی پابندی لگادی جائے گی۔

12- آئی ڈی پیز کی فوری طور واپسی یقینی بناتے ہوئے، قبائلی علاقوں میں اصلاحات پیدا کی جائیں گی۔

13- دہشت گردوں کے رابطہ نیٹ ورک کو مکمل طور پر مفلوج کر دیا جائے گا۔

14- حکومت، سوشل میڈیا کے ذریعے پھیلائی جانے والی دہشت گردی اور انتہا پسندی کی روک تھام کو یقینی بنائے گی۔

15- پنجاب سمیت ملک کے ہر حصے میں دہشت گردوں کے لئے جگہ تنگ کر دی جائے گی۔

16- کراچی آپریشن، مطلوبہ مقاصد کے حصول تک جاری رہے گا۔

17- وسیع تر سیاسی ہم آہنگی کے لئے اسٹیک ہولڈرز، بلوچستان حکومت کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔

18- فرقہ وارانہ عناصر کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کی جائے گی۔

19- افغان مہاجرین کی وطن واپسی کے لئے جامع پالیسی مرتب کی جا رہی ہے۔

20- حکومت، صوبائی انٹیلی جنس ایجنسی کے اداروں کو دہشت گردوں، ان کے رابطہ نیٹ ورکوں تک رسائی اور دیگر انٹیلی جنس ایجنسیوں سے بہتر روابط کی فراہمی کے لئے قانون سازی کرے گی۔

قومی ایکشن پلان کے تحت فوجی عدالتوں کے قیام کے لئے آئین میں 21ویں ترمیم کا بل 3 جنوری 2014ء کو قومی اسمبلی میں پیش کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ آرمی ایکٹ

مجریہ 1952ء میں مزید ترمیم کا بل بھی پیش کیا گیا۔ دہشت گردوں کو سزا دینے کے لئے آرمی ایکٹ کی شق ڈی میں ترمیم کی جائے گی۔ دونوں بل وزیر اطلاعات پرویز رشید نے پیش کیے۔ تاریخ بدل گئی، یہ کوئی 45 برس پہلے کا واقعہ ہے، دسمبر 1970ء کا آخری ہفتہ آج کے جنوری 2015ء کے دنوں کی طرح یخ بستہ مگر ابر کرم سے لبریز ایام میں راولپنڈی کی سابقہ ڈسٹرکٹ جیل جہاں ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر کھینچا گیا تھا، اسپیشل ملٹری کورٹ سپرنٹنڈنٹ جیل کے کمرے میں لگائی گئی تھی، یہ خصوصی فوجی عدالت ایک کرنل، میجر اور سیشن جج پر مشتمل تھی مقدمہ زیر سماعت ایک بیس سالہ نوجوان کا تھا جس پر الزام تھا کہ اس نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان کے خلاف راولپنڈی کے لال کرتی بازار میں نفرت انگیز تقریر کی تھی، اس نوجوان کا ٹرائیل ملٹری کورٹ نے راولپنڈی کنٹونمنٹ کے ویسٹرج فوجی بیرکس میں کیا تھا اور اسے سزا سنانے کے لئے عدالت خود جیل پہنچ گئی تھی، اس وقت کے پیپلز پارٹی کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل خورشید حسن میر نوجوان اسیر کے وکیل تھے نوجوان کو چھ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی تھی، آج 45 سال کے بعد یہ نوجوان ایک سینئر سیاستدان اور وزیر قانون کی حیثیت سے دہشت گردی سے نمٹنے کے لئے فوجی عدالتوں کے دائرہ کار میں توسیع اور آئین میں ترمیم کا بل قومی اسمبلی میں پیش کر رہا تھا، اور اس بل کو منظور کرانے کی ذمہ داری بھی ان پر آن پڑی ہے، یہی موسم تھا یہی دن تھے جب پرویز رشید فوجی عدالت کی سزا کاٹ رہے تھے، اس وقت سزا دینے اور لینے والے میں کسی کو پتہ نہیں تھا کہ جس شخص کو سزا دے رہے ہیں وہ ایک دن ایسی ہی فوجی عدالتوں کو قانونی جواز فراہم کرے گا، اس زمانے میں فوجی عدالتیں جمہوری آزادیوں کو سلب کرنے اور تحریر و تقریر کو پابند کرنے کے لئے لائی گئی تھیں، جبکہ آج فوجی عدالتیں جمہوریت پر دہشت گردوں کے حملے کو روکنے کے لئے لائی جا رہی ہیں، 45 سال کی اس جمہوریت جدوجہد کے سفر میں فوجی عدالتوں کے سزا یافتہ سینئر پرویز رشید تنہا نہیں تھے ان میں معراج محمد خان، طارق عزیز،

مولانا کوثر نیازی، علی احمد تالپور، افراسیاب خٹک، راجہ انور، جہانگیر بدر، قاضی سلطان محمود، مختار رانا، حاجی بلور، ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ اور ان جیسے سینکڑوں افراد اور گمنام شخصیات شامل ہیں۔ پرویز رشید کے پیش کردہ ترامیمی بلوں کے تحت دہشت گردوں کے خلاف فوجی عدالتوں میں مقدمات چلائے جائیں گے۔ قبل ازیں 3 جنوری کو وزیراعظم کی صدارت میں کئی گھنٹے تک جاری رہنے والی کل جماعت کانفرنس میں فوجی افسروں کی زیر سربراہی خصوصی عدالتوں کے قیام کے لئے آئینی ترامیم پر اتفاق کرلیا گیا۔ سیاسی قیادت نے 20 نکاتی آئینی مسودے کو بھی حتمی شکل دی، جس پر 5 جنوری کو قومی اسمبلی اور منگل کو سینیٹ میں ووٹنگ ہوئی۔ طے پایا کہ خصوصی عدالتوں میں کوئی بھی ٹرائل وفاقی حکومت کی مرضی کے بغیر نہیں ہوگا، جبکہ بل منظوری کے بعد فوری طور پر نافذ العمل ہوگیا۔ اجلاس کے اعلامیہ میں کہا گیا کہ آل پارٹیز کانفرنس نے اتفاق رائے سے 24 دسمبر کی قرارداد کے منظور کردہ 20 نکات پر تیزی سے عملدرآمد کے عزم کا اظہار کیا۔ آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دہشت گردی کے خلاف خصوصی عدالتیں فوج کی خواہش نہیں بلکہ غیر معمولی حالات کا تقاضا ہے، پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اہم اور نازک موڑ پر پہنچ چکا ہے، دہشت گردی کے خلاف جنگ بطور ریاست ہارنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

سیاسی قائدین نے خصوصی عدالتوں کے قیام کے لئے آرمی ایکٹ اور آئین میں ترمیم پر اتفاق کیا جس کے تحت خصوصی عدالتوں کو آئینی تحفظ فراہم کیا گیا جبکہ وزیراعظم میاں نواز شریف نے کہا کہ قومی اسمبلی میں خصوصی عدالتوں کے ترمیمی بل پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں، آج بھی جرأت مندانہ فیصلے نہ کئے تو قوم کا ہاتھ ہمارے گریبان پر ہوگا، دہشت گردوں پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کن لمحہ ضائع نہیں ہونا چاہئے۔

آج ریفرنڈم کرایا جائے تو قوم کی بھاری اکثریت کا فیصلہ یہی ہوگا کہ دہشت گردوں

کو عبرتناک انجام سے دوچار کیا جائے۔ قوم قومی ایکشن پلان پر عملدرآمد دیکھنا چاہتی ہے۔ اب ہم نے کمر باندھ لی ہے، اس ملک کو دہشت گردی کے گند سے صاف کرنا چاہئے۔ متحدہ قومی موومنٹ کے رہنما ڈاکٹر محمد فاروق ستار نے بیرسٹر سینیٹر فروغ نسیم کے ہمراہ آل پارٹیز کانفرنس کے بعد میڈیا کے نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ مذہبی انتہا پسندی ملک کی بقاء وسلامتی کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے، شترمرغ کی طرح آنکھیں بند کرنے سے یہ خطرہ نہیں ٹلے گا۔ قائد تحریک الطاف حسین گزشتہ 10 سالوں سے اس طرف توجہ دلاتے رہے لیکن کسی نے ان کی بات نہیں مانی لیکن آج کے اجلاس میں الطاف بھائی کی یہ بات سب کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ملک کے دشمنوں سے جنگ ہے جس نے پاکستان پر جنگ مسلط کردی ہے، یہ غیر معمولی حالات ہیں لہٰذا ملک کو بچانے کے لئے اقدام اٹھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر فاروق ستار نے کہا کہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کا جو موقف تھا یہی موقف متحدہ قومی موومنٹ کا بھی ہے جس سے آصف علی زرداری نے بھی اتفاق کیا، ہماری بات کو مانا گیا ہے کہ یہ عدالتیں سیاسی جماعتوں کے خلاف استعمال نہیں ہوں گی، فوجی عدالتوں کے قیام پر تمام جماعتیں متفق ہوگئی ہیں۔

آل پارٹیز کانفرنس میں اتفاق رائے کے بعد 4 جنوری کو خصوصی عدالتوں کے قیام کے لئے قومی اسمبلی میں آئین پاکستان میں ترمیم کا 21رواں ترمیمی بل 2015ء اور پاکستان آرمی ایکٹ 1952ء میں ترمیم کے لئے پاکستان آرمی ایکٹ ترمیمی بل 2015ء پیش کردیا گیا۔ آئین میں 21ویں ترمیم کے تحت آرمی ایکٹ کے تحت بننے والی عدالتوں کو آئینی تحفظ دیا گیا جبکہ آرمی ایکٹ 1952ء کی سیکشن 2 میں سب سیکشن شامل کی گئی ہے۔ دہشت گرد گروپ یا تنظیم سے تعلق کا دعویٰ پاکستان کے خلاف جنگ، فوج اور سول وملٹری اداروں پر حملہ، کسی مذہب یا فرقے کا نام استعمال کرنے اور اسلحہ اٹھانے والے کے خلاف کارروائی ہوگی۔

وزیر قانون وانصاف پرویز رشید نے ایوان میں دونوں بل پیش کئے۔ رول 288

کے تحت بل پیش کرنے کے لئے انہوں نے تحریک پیش کی جسے ایوان نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ اجلاس کی کارروائی صرف دس منٹ جاری رہی پاکستان آرمی (ترمیمی) ایکٹ 2015ء کے بل کے تحت پاکستان آرمی ایکٹ 1952ء کی سیکشن 2 میں سب سیکشن شامل کی گئی۔ نئی شق تین میں کہا گیا ہے کہ کوئی شخص جو یہ دعویٰ کرے کہ اس کا تعلق کسی دہشت گرد گروپ یا تنظیم سے ہے یا وہ ان سے پہچانا جاتا ہو، کسی مذہب یا مسلک کا نام استعمال کرے، اسلحہ اٹھائے، پاکستان کے خلاف جنگ کرے، پاکستان کی مسلح افواج پر حملہ کرے، قانون نافذ کرنے والے اداروں پر حملہ کرے، پاکستان میں سول اور ملٹری اداروں پر حملہ کرے، تاوان کے لئے اغوا کرے، کسی کو مار دے یا زخمی کرے، اپنے قبضے میں دھماکا خیز مواد رکھے یا اسے منتقل کرے یا تیار کرے، آتشیں اسلحہ رکھے، اسلحہ کے آلات رکھے، خودکش جیکٹ رکھے، گاڑی کو دہشت گردی کے مقاصد کے لئے استعمال کرے، ان غیر قانونی سرگرمیوں کے لئے مقامی یا غیر ملکی ذرائع سے فنڈز فراہم کرے، ایسا اقدام کرے جس سے ریاست میں، معاشرے کے کسی طبقہ میں کسی مسلک میں یا مذہبی اقلیت میں دہشت پھیلے یا پاکستان میں غیر یقینی کی کیفیت پیدا کرے، جو شخص بھی مذکورہ بالا کوئی فعل کرنے کی کوشش کرے گا چاہے پاکستان کے اندر یا باہر اس کے خلاف اس ایکٹ کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ تحفظ پاکستان ایکٹ 2014ء کے شیڈول میں سیریل نمبر ایک سے بیس تک کو بھی اس ایکٹ کا حصہ بنایا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کوئی شخص جو دعویٰ کرے یا کسی دہشت گرد گروپ یا تنظیم سے پہچانا جائے، کسی مسلک یا مذہب کا نام استعمال کرے ان کے خلاف بھی آرمی ایکٹ کے تحت کارروائی کی جاسکے گی، ہر وہ شخص جو مذکورہ بالا جرائم میں معاونت کرے گا اس سازش میں شریک ہوگا اس کے خلاف بھی آرمی ایکٹ کے تحت کارروائی کی جائے گی، مسلک سے مراد کوئی ایسی سیاسی جماعت نہیں ہے جو قانون کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ وفاقی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ مذکورہ بالا جرائم میں ملوث کسی شخص کے خلاف کیس

ٹرانسفر کرے یا پہلے سے زیر التوا کیس کو آرمی ایکٹ کے تحت ٹرائل کے لئے بھجوائے۔ ٹرانسفر کی گئی کارروائی کو اس ایکٹ کے تحت تصور کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں پہلے سے ریکارڈ شدہ گواہی کو دوبارہ ریکارڈ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بل کے اغراض و مقاصد میں کہا گیا ہے کہ اس وقت جو غیر معمولی صورتحال ہے وہ یہ تقاضا کرتی ہے کہ دہشت گردی سے متعلق جرائم کا تیزی سے ٹرائل کرنے کے لئے خصوصی اقدامات کئے جائیں۔

دستور میں اکیسویں ترمیم 2015ء بل میں کہا گیا ہے کہ ملک میں غیر معمولی حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ دہشت گردی اور پاکستان کے خلاف جنگ کا ماحول پیدا کرنے والوں کے مقدمات کی تیز ترین سماعت کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی جائیں، موجودہ حالات میں پاکستان کو غیر معمولی صورتحال کا سامنا ہے۔ اس بل کا مقصد دہشت گرد گروپوں کی جانب سے مذہب یا فرقہ کا نام استعمال کر کے ہتھیار اٹھانے کا دعویٰ کرنے جبکہ مقامی اور غیر ملکی امداد کے حصول سے غیر ریاستی عناصر کو روکنا ہے۔ اس غرض سے پاکستان آرمی سے برسرپیکار دہشت گرد گروپوں اور مذاہب کا نام استعمال کرنے والے اسلحہ بردار دہشت گردوں کے ٹرائل کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کی گئی ہیں۔ آرمی پبلک اسکول پشاور میں 16 دسمبر 2014ء کو افسوسناک سانحہ کے بعد پاکستان کے عوام نے منتخب نمائندوں کے ذریعے پاکستان سے دہشت گردی کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے غیر متزلزل عزم کا اظہار کیا ہے۔ بل میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کی سالمیت کے لئے ان اقدامات کو آئینی ترمیم کے ذریعے تحفظ دیا گیا ہے۔ اس غرض سے اعلیٰ عدلیہ کے بنیادی ڈھانچے سے متعلق آئین کے آرٹیکل 175 کی شق (3) میں ترمیم کی گئی ہے۔ جنگ کی صورت حال سے نمٹنے سے متعلق آئین کے آرٹیکل 245 کے ذریعے پاک فوج کو دیئے گئے اختیارات سے متعلق آرمی ایکٹ ترمیمی بل 2015ء میں بھی ترمیم کے لئے پیش کردہ بل میں ترمیم کے بعد کسی بھی دہشت گرد گروپ یا اس سے تعلق رکھنے والے شخص جو مذہب یا مسلک کی

بنیاد پر پاکستان کے خلاف ہتھیار اٹھائے گا یا مسلح افواج اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں پر حملہ کرے گا، کسی سول یا فوجی تنصیبات پر حملہ میں ملوث ہوگا یا اغوا برائے تاوان کے لئے کسی شخص کو قتل یا زخمی کرے گا، بارودی مواد کی نقل و حمل اور اسے ذخیرہ کرنے میں ملوث ہوگا، خودکش جیکٹس یا گاڑیوں کی تیاری میں ملوث ہوگا یا کسی بھی قسم کے مقامی یا عالمی ذرائع سے فنڈنگ فراہم یا مہیا کرے گا، اقلیتوں کے خلاف کسی قسم کی کارروائی میں ملوث ہوگا تو اس کے خلاف اس قانون کے تحت کارروائی عمل میں لائی جاسکے گی۔ اس ضمن میں فرسٹ شیڈول پارٹ ون (III) کے شیڈول کی شق پانچ کے بعد شق 6 پاکستان آرمی ایکٹ 1952ء، پاکستان ایئر فورس ایکٹ 1953ء، پاکستان نیوی آرڈیننس 1961ء اور تحفظ پاکستان ایکٹ 2014ء، 4 نئی شقیں شامل کی جائیں گی۔ یہ ترمیم دو سال تک کے لئے موثر باعمل رہے گی اور دو سال بعد یہ از خود منسوخ تصور کی جائے گی۔ قومی اسمبلی میں کی گئی اکیسویں ترمیم میں مزید ترمیم کے بعد واضح کیا گیا کہ لفظ فرقہ سے مراد مذہب کا کوئی فرقہ ہے اور اس میں قانون کے تحت منضبط کوئی سیاسی جماعت شامل نہیں۔

اکیسویں ترمیم کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں "چونکہ غیر معمولی صورتحال اور حالات ہیں، جو پاکستان کے خلاف دہشت گردی، جنگ کرنے یا بغاوت کرنے سے متعلق بعض جرائم کی فوری سماعت، مقدمہ اور مذہب یا کسی فرقہ کا نام استعمال کرنے والے کسی دہشت گرد گروپ، مسلم گروپ، دستے اور عسکری گروپ یا ان کے ارکان کی جانب سے پاکستان کی سلامتی کو خطرات لاحق کرنے والے افعال کی روک تھام کے لئے خصوصی اقدامات کئے متقاضی ہیں۔"

اکیسویں ترمیم اور پاکستان آرمی ایکٹ میں ترمیم کے بعد اب ملک میں نو فوجی عدالتیں قائم کی جاچکی ہیں۔ یہ فوجی عدالتیں مندرجہ ذیل جرائم میں ملوث افراد کو آرمی ایکٹ کے تحت سزائیں دیں گی جب کہ عدالت کا مقام اور سماعت خفیہ رکھی جائے گی۔

1- پاکستان کے خلاف جنگ کرنے والے فوج اور قانون نافذ کرنے والے

2- اداروں پر حملہ کرنے والے اغوا برائے تاوان کے مجرم

3- غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث افراد کو مالی معاونت فراہم کرنے والے

4- مذہب اور فرقے کے نام پر ہتھیار اٹھانے والے

5- کسی دہشت گرد تنظیم کے اراکین

6- سول اور فوجی تنصیبات پر حملہ کرنے والے دھماکہ خیز مواد رکھنے یا کہیں لانے لے جانے میں ملوث افراد

7- دہشت اور عدم تحفظ کا ماحول پیدا کرنے والے

8- بیرون ملک سے پاکستان میں دہشت گردی کرنے والے

آرمی ایکٹ اور اکیسویں آئینی ترمیم کی منظوری کے موقع پر ایوان میں 272 ارکان موجود تھے جن میں 247 ارکان نے رائے شماری میں حصہ لیا۔ مسلم لیگ (ن) کے 180، پیپلز پارٹی 32، ایم کیو ایم 25، مسلم لیگ (فنکشنل) 4، مسلم لیگ (ق) اور عوامی نیشنل پارٹی کے دو دو ارکان اجلاس میں شریک ہوئے۔ جے یو آئی (ف) کے 13 اور جماعت اسلامی کے چار ارکان نے آئینی ترمیم کی رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔ اس کے علاوہ آزاد اور فاٹا کے 8 ارکان نے اجلاس میں شرکت کی۔ آزاد رکن قومی اسمبلی جمشید دستی نے بھی اکیسویں آئینی ترمیم اور آرمی ایکٹ میں ترمیم کے حق میں ووٹ دیا۔

سانحہ پشاور کے بعد عسکری قیادت اور حکومت کی طرف سے دہشت گردی کے خلاف جس فیصلہ کن جنگ لڑنے کا اعلان کیا گیا تھا اس کا عملی ثبوت قومی اسمبلی سے فوجی عدالتوں کے قیام کے لئے 21 ویں ترمیم متفقہ طور پر منظور کرنے کی صورت میں دیا گیا ہے جو بلاشبہ حکومت کا اس لحاظ سے بھی لائق تحسین کارنامہ ہے کہ حکومت نے اپنی اتحادی جماعت کی ناراضگی کو بھی آڑے نہیں آنے دیا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ نہتے اور معصوم لوگوں کے

قاتل کسی رحم کے مستحق نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب یہ بل اسمبلی میں پیش کیا گیا تو ایوان میں موجود 247 ارکان نے اس کی حمایت میں ووٹ دیا اور کسی ایک رکن اسمبلی کی طرف سے بھی بل کی مخالفت نہیں کی گئی، تاہم جمعیت علمائے اسلام (ف) اور جماعت اسلامی نے اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے اسمبلی کے اجلاس میں ہی شرکت نہ کی۔ مولانا فضل الرحمٰن نے میڈیا سے بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ آئینی ترمیم اور آرمی ایکٹ میں ترمیم کے مسودات پر ہمیں اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ انہیں یہ بھی اعتراض تھا کہ ترامیم میں دہشت گردی کو اسلام کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے جبکہ دہشت گردی صرف دہشت گردی ہوتی ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن کا یہ کہنا درست سہی کہ دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کی کارروائیوں میں ملوث مشتبہ افراد کے تانے بانے کہیں نہ کہیں جا کر مدارس سے جا ملتے ہیں۔ جہاں تک ان کو ترامیم کے مسودے کی تیاری کے وقت اعتماد میں نہ لینے کی بات ہے تو یہ اس لئے درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ سانحہ پشاور کے بعد وزیراعظم نے دوبار تمام جماعتوں کی کانفرنس منعقد کی جس میں تمام جماعتوں نے قومی ایکشن پلان کی متفقہ طور پر منظوری دی تھی۔ اجلاس میں آئینی ترمیم کا مسودہ بھی پیش کیا گیا تھا جس پر بحث ہوئی، تحفظات کا اظہار بھی کیا گیا مگر بالآخر تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں بشمول جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام نے اتفاق کیا جب تمام جماعتوں کی تائید کے بعد 21 ویں ترمیم کا مسودہ قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا اور اسے اسی روز منظور بھی ہونا تھا مگر جماعت اسلامی اور مولانا فضل الرحمٰن کے تحفظات کے بعد اسے ایک روز کے لئے موخر کیا گیا اور حکومت نے مولانا فضل الرحمٰن کو آخری وقت تک قائل کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی، یہاں تک کہ بل قومی اسمبلی سے منظور ہونے کے بعد ان کے تحفظات دور کرنے کی بھرپور کوشش کی جاتی رہی۔

جمعیت علمائے اسلام (ف) اور جماعت اسلامی کو مدارس کی مانیٹرنگ اور فنڈنگ کے

حوالے سے تحفظات ہیں مگر مولانا نے بل کی منظوری کے بعد میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے اسے سیکولرازم کی طرف پہلا قدم بھی قرار دے ڈالا اور مذہبی جماعتوں کے ساتھ مل کر تحریک چلانے کی باتیں کی جانے لگیں۔ جہاں تک سیکولرازم کی بات ہے تو یہ عذر اس لئے بھی قابل قبول نہیں کیونکہ فوجی عدالتوں میں علماء کے نہیں بلکہ دہشت گردوں کے کیسز آنے تھے جن کے بارے میں مولانا پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ باقی رہی فنڈنگ کی بات تو اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دہشت گردوں کا اس وقت تک خاتمہ ممکن نہیں جب تک ان کو وسائل اور سہولت کار میسر ہوں گے۔ اگر دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پوری قوم متفق، اور متحد ہے تو ضروری تھا کہ قومی ایکشن پلان پر بھی اس قسم کے اتحاد کا مظاہرہ کیا جاتا۔ جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کے تحفظات آخری وقت تک دور نہیں ہو سکے۔ حکومتی کمیٹی نے مولانا فضل الرحمٰن سے ان کی اعتراضات پر بات چیت کے لئے ملاقات بھی کی جو بے نتیجہ رہی۔ مولانا کی یہ تجویز بھی قبول نہیں کی گئی کہ فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کا حق دیا جائے۔ منگل 6 جنوری کے اجلاس میں ان دونوں جماعتوں کے ارکان نے شرکت نہیں کی جس سے فوجی عدالتوں کے مسئلہ پر قومی اتفاق رائے کا تاثر مجروح ہوتا نظر آیا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اس مسئلہ پر تمام جماعتوں کے اپنے اپنے تحفظات موجود تھے، لیکن سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ دہشت گردوں کے مقدمات تیزی سے نمٹانے کے لئے فوجی عدالتوں کا قیام ناگزیر ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن اور سراج الحق بھی فوجی عدالتوں کے مخالف نہیں، وہ مذہب اور فرقہ کے حوالے سے چند تجاویز آئینی ترمیم میں شامل کرانا چاہتے تھے جنہیں بروئے کار لانے کی راہ نکالنی چاہئے تھی اور دونوں جماعتوں کو منا کر ایوان میں لانا چاہئے تھا۔ ان جماعتوں کو بھی دیکھنا چاہئے تھا کہ ملک اس وقت حالت جنگ میں ہے۔ وہ آئینی ترمیم کے مرحلے میں شریک ہوتیں تو قوم کو ایک اچھا پیغام ملتا۔ تاہم اب جبکہ قومی اسمبلی کی دو تہائی اکثریت

نے اس کی منظوری دے دی ہے تو اس پر عملدر آمد کے دوران جو خامیاں سامنے آئیں گی ان کے ازالے کی تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں۔ حکومت نے اپنے طور پر احتیاط برتنے کی کوشش کی ہے تا کہ یہ اقدام قومی انتشار کا سبب نہ بنے۔ مثلاً یہ طے کیا گیا ہے کہ کراچی میں لسانی بنیادوں پر قتل اور بلوچستان میں ریاستی تنصیبات پر حملوں میں ملوث باغیوں کے مقدمات فوجی عدالتوں میں نہیں چلیں گے۔ وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان نے بھی فوجی عدالتوں کو جمہوریت سے متضاد لیکن وقت کی ضرور قرار دیا ہے۔ قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ پاک فوج آئین قانون اور جنیوا معاہدے کی پابند ہے۔ قوجی عدالتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم سب کو لٹکانا چاہتے ہیں۔

قومی اسمبلی کے بعد سینیٹ نے بھی فوجی عدالتوں کے قیام کے لئے آرمی ایکٹ اور آئین میں 21 ویں ترمیم کی منظوری دے دی۔ ایوان میں حاضر کسی بھی رکن نے بل کی مخالفت میں ووٹ نہیں دیا۔ 104 ارکان پر مشتمل سینیٹ میں 78 ارکان موجود تھے اور ان سب نے فوجی ایکٹ میں ترمیم کے بل کے حق میں ووٹ دیئے۔ قبل ازیں سینیٹ میں اظہار خیال کرتے ہوئے وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ ہزاروں لوگ دہشت گردی کی نذر ہو چکے ہیں، ہماری معیشت تباہ ہو چکی جسے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، ملک میں سزا و جزا کا کوئی تصور باقی نہیں رہ گیا تھا اب قوم نے دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ کر باہر پھینکنے کا عزم کر لیا ہے۔ ملک میں دہشت گردی کی کوئی گنجائش نہیں، آخری دہشت گرد کے خاتمے تک ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ان تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین اور پارلیمانی قائدین کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اس اہم ترین بل پر اپنے مشورے دیئے اور متفقہ رائے سے یہ قانون عمل میں لایا گیا، وہ تمام ارکان کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے متفقہ طور پر اسے منظور کیا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ یہ بل کسی ایک جماعت کا نہیں تمام سیاسی جماعتوں کا ہے، اس بل سے دہشت گردی ختم کرنے میں

بہت مدد ملے گی، یہ بل قیام امن، دہشت گردی اور عام ملیشیا کے خاتمے کے لئے اہم حیثیت رکھتا ہے۔

21ویں ترمیم منظور ہونے کے بعد مولانا فضل الرحمٰن خاصے سیخ پا نظر آئے انہوں نے پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر میڈیا کے سامنے اپنے دل کی خوب بھڑاس نکالی۔ انہوں نے کہا کہ ملک کو سیکولر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ آئین میں ترمیم کے اس لب و لہجے سے قوم تقسیم ہوجائے گی۔ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ ملک بنگلہ دیش نہیں ہے، نہ ہی یہاں حسینہ واجد کی حکومت ہے کہ پاکستان کو سیکولر بنا دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ سانحہ پشاور کو مذہبی اکائیوں کے خلاف کیوں استعمال کیا جارہا ہے، آج پھر دہشت گردی اور مذہب کو جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے اور ہم اس موڑ پر کھڑے ہیں کہ ملک کو سیکولر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، سربراہ جے یو آئی نے کہا کہ تمام مکاتب فکر، مذہبی وسیاسی جماعتیں اور تمام طبقہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد دہشت گردی کے خلاف ایک ہی صف میں کھڑے ہیں، دہشت گردی ایک ہی قسم کی ہوتی ہے اور دہشت گردی مذہبی و غیر مذہبی نہیں ہوتی، دہشت گردی کو جرم قرار دے دیا جائے اور سب یکجا ہو کر اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔

وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان نے ایک پریس کانفرنس میں فوجی عدالتوں کے دائرہ کار کے بارے میں خدشات اور ابہامات کے حوالے سے تفصیل سے حکومت کا موقف واضح کیا۔ انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا کہ فوجی عدالتیں سیاستدانوں، تاجروں، میڈیا اور عام شہریوں کے خلاف استعمال نہیں ہوں گی۔ یہ صرف دہشت گردوں کے مقدمات سنیں گی۔ ملزموں کو صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو شخص فوجی عدالت میں پیش ہوا اسے سزا بھی ملے۔ سیاسی اور فوجی قیادت میں اتفاق رائے سے جس طرز کی فوجی عدالتوں کے قیام کا فیصلہ ہوا ہے وہ مارشل لاء ادوار میں بننے والی فوجی عدالتوں سے کافی مختلف اور موجودہ غیر معمولی حالات کے مطابق ہیں۔ ایسی عدالتیں

ضرورت کے تحت مسلمہ جمہوری ملکوں میں بھی قائم ہوتی رہتی ہیں۔امریکہ میں نائن الیون کے واقعے کے بعد فوجی ٹربیونل بنائے گئے تھے جن میں مشکوک افراد کے خلاف مقدمات چلائے گئے۔وزیرداخلہ کے مطابق فوجی عدالتیں قومی ایکشن پلان کا حصہ ہیں جس پر درحقیقت پہلے ہی سے عملدرآمد شروع ہو چکا ہے۔اب تک چارسو سے زیادہ آپریشن ہو چکے ہیں جن میں سو سے زیادہ دہشت گرد مارے گئے اور ڈھائی سو گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دہشت گردوں کے ہمدردوں،سرپرستوں اور مالی معاونت کرنے والوں کے خلاف بھی کارروائی شروع ہو چکی ہے۔چاروں صوبوں میں سول اور فوجی قائدین پر مشتمل اعلیٰ سطح کی بااختیار کمیٹیاں قائم کردی گئی ہیں جن کا مقصد دہشت گردوں کے خلاف تیز رفتار کارروائی میں باہمی تعاون کو موثر بنانا ہے۔اس حوالے سے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل شریف کالاہور میں حکومت اور فوج کی ایپکس کمیٹی میں اظہارخیال دلوں کو گرما دینے والا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ جنگ جیتنے کے لئے پوری قوم کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔وفاقی حکومت دہشت گردی کا کوئی بھی مقدمہ فوجی عدالتوں میں بھیج سکے گی۔حکومت نے مشکوک افراد کی نشاندہی کے لئے ہیلپ لائن 1717 قائم کردی ہے شہری کسی بھی مشکوک شخص یا خطرے سے ذمہ دار حکام کو آگاہ کرنے کے لئے اس نمبر پر کال کرکے اس جنگ میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔ماضی میں خفیہ اداروں نے کئی حملوں کی پیشگی اطلاع دی مگر صوبائی حکومتیں بروقت کارروائی کرکے انہیں روک نہ سکیں۔اب ایسی غفلت کی کوئی گنجائش نہیں۔دہشت گردوں کو پکڑنے اور انہیں فوجی عدالتوں سے سزائیں دلانے کے لئے ذمہ دار حکام کو بہت احتیاط اور عرق ریزی سے مقدمات تیار کرنا ہوں گے۔ساتھ ہی اخلاقی برتری کا بھی مظاہرہ کرنا ہوگا۔جنگیں ہتھیاروں کی علاوہ اخلاقی قوت سے جیتی جاتی ہیں۔یعنی انصاف نہ صرف ہونا چاہئے بلکہ ہوتا ہوا نظر بھی آنا چاہئے۔

اور کوئی آپشن نہیں تھا

فوجی عدالتوں کے قیام اور دہشت گردوں کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کے لئے صدر ممنون حسین نے آئین اور آرمی ایکٹ میں ترامیم کے بلوں پر دستخط کر دیئے۔ صدر کے دستخط کے بعد 21 ویں آئینی ترمیم دستور پاکستان کا باقاعدہ حصہ بن گئی۔ جبکہ آرمی ایکٹ میں ترمیم صدر کے دستخطوں کے بعد قانون کی شکل میں ملک بھر میں فوری طور پر نافذ ہو گئی۔ ”آئین میں ترمیم کے بعد سیاست دانوں نے اپنا بوجھ فوج کے کاندھوں پر ڈال دیا، اب اگر فوجی عدالتوں کے باوجود دہشت گردی ختم نہ ہوئی تو بدنامی سیاست دانوں کے نہیں بلکہ فوج کے حصے میں آئے گی، مجھے خدشہ ہے کہ بہت سے چالاک دہشت گرد فوجی منصفوں کے خلوص، سادگی اور نیک نیتی کا فائدہ اٹھا کر صاف بچ نہ نکلیں، میرے اس خدشے کی وجہ یہ ہے کہ ان فوجی عدالتوں میں فوجی منصفوں کو بے جا مقتل سجانے کا اختیار نہیں دیا گیا بلکہ انصاف کا ترازو تھما دیا ہے، فوجی ججوں نے بھی فیصلے تو قانون کے مطابق ہی کرنے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ فوجی منصفوں نے فیصلے بے خوف ہو کر کرنے ہیں ملک کی سیاسی قیادت کے لئے فوجی عدالتوں کا قیام کڑوی گولی نگلنے کے مترادف ہے، تاہم پاک فوج کے ترجمان کا کہنا ہے کہ یہ قدم عظیم تر جمہوریت کی جانب ہے۔ پاک فوج کے ترجمان میجر جنرل عاصم سلیم باجوہ نے کہا ہے کہ آپریشن ضرب عضب فوجی ہی نہیں اب قومی آپریشن بھی بن چکا ہے، خصوصی عدالتوں کے قیام سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، واحد فرق ان عدالتوں میں ملٹری نظم وضبط کی موجودگی کا ہوگا، سانحہ پشاور آپریشن سے متاثرہ طالبان کا ردعمل تھا۔ برطانوی نشریاتی ادارے کو انٹرویو میں ان کا کہنا تھا کہ انسداد دہشت گردی کے قومی لائحہ عمل پر ملک کی سیاسی جماعتوں اور عسکری قیادت کے اتفاق رائے سے ظاہر ہے کہ وہ فوج کی جانب سے ایک علاقے میں شروع کی گئی کارروائی آج ملک بھر کی لڑائی بن چکی ہے۔

اس سوال پر کہ ایک جمہوری ملک میں فوجی عدالتوں کی کیا جگہ ہے، فوجی ترجمان کا کہنا تھا کہ یہ عظیم تر جمہوریت کی جانب ایک قدم ہے۔ جس کا فیصلہ ملک کی سیاسی جماعتوں نے پاکستان کے مفاد میں کیا ہے، میجر جنرل عاصم باجوہ نے مزید کہا کہ فوجی عدالتوں کا قیام ان بیس نکات میں سے صرف ایک نکتہ ہے جو قومی ایکشن پلان کا حصہ ہیں۔ میجر جنرل عاصم باجوہ کا کہنا تھا دہشت گردوں کے خلاف قومی لائحہ عمل پر ملک کی سیاسی جماعتوں اور عسکری قیادت کا یکجا ہونا ایک بڑی بات ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جنگ پورے ملک کی جنگ بن گئی ہے اور اس جنگ کی حمایت کے لئے پوری قوم کھڑی ہوگئی ہے۔ میجر جنرل عاصم باجوہ کا کہنا تھا کہ شدت پسند تنظیموں کی قیادت کا ملک چھوڑ کر افغانستان بھاگ جانا بھی ضرب عضب کے کامیاب ہونے کی دلیل ہے۔

ملک کی اعلیٰ سیاسی قیادت خطرناک مجرموں کے مقدمات کو تیز رفتاری سے نمٹانے کے لئے آئین میں ترمیم کرنے پر رضامند ہوئیں۔ فوجی عدالتیں اب دہشت گردی اور بے امنی پر قابو پانے کے لئے خطرناک، دہشت گردوں پر مقدمات چلائیں گی۔ زیادہ تر سیاسی جماعتیں اس راستے کو اختیار کرنے پر رضامند نہیں تھیں لیکن انہیں 16 دسمبر کے بہیمانہ صورتحال کے بعد اس پر متفق ہونا پڑا۔ فوجی عدالتوں کے بارے میں ماضی میں تلخ تجربات ہونے کے باوجود وزیر اعظم نواز شریف کی قیادت میں ملکی سیاست کی تمام اعلیٰ شخصیات بشمول سابق صدر آصف علی زرداری، عمران خان اور دیگر نے صرف خطرناک دہشت گردوں کے مقدمات کے لئے پس و پیش کے ساتھ فوجی عدالتوں کے قیام کا فیصلہ کیا۔ سنجیدہ ملاقاتوں، طویل دورانیے کے تبادلہ خیال اور مشاہدات کے تبادلوں کے بعد آئین میں ترمیم کا فیصلہ کیا گیا۔ وزیر اعظم نواز شریف نے اس اتفاق رائے کے لئے شب و روز محنت کی۔ بظاہر مسئلہ حل ہوگیا لیکن اصل مسئلہ موجودہ فوجداری نظام انصاف کا نااہل اور بدعنوان ہونا ہے جو کہ جوں کا توں ہے۔ تمام سیاستدانوں نے نواز شریف کی قیادت میں

فوجی عدالتوں کے قیام کے لئے دستخط کر کے بنیادی طور پر ملک کے فوجداری نظام انصاف میں بہتری نہ کر سکنے میں اپنی ناکامی اور نااہلی کو تسلیم کیا۔ فوجی عدالتوں کے قیام کے لئے ہم نے جس قسم کا عزم دیکھا وہ اس ضمن میں ہمیشہ مفقود رہا، چاہے ہم موجودہ حکومت کی باتیں کریں یا پھر ماضی کی حکومت کی۔ بنیادی طور پر اگر موجودہ فوجداری نظام انصاف میں تبدیلیاں اور اس کی مکمل جانچ پڑتال نہ کی گئی تو فوجی عدالتوں سے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ صرف سنگین اور 'خطرناک' دہشت گردوں پر مقدمات فوجی عدالتوں میں چلائے جائیں گے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معصوم بچوں سے جنسی زیادتی اور ان کا قتل کرنے والوں پر مقدمہ کون چلائے گا۔ ٹارگٹ کلرز، قاتلوں، قبضہ اور بھتہ مافیا، بدعنوانوں اور دیگر مجرموں کو سزا کون دے گا۔ آپ سمری ٹرائل کے لئے ہر کیس فوجی عدالتوں کو بھجوا سکتے ہیں۔ حکومت کو جنگی بنیادوں پر اس کے فوجداری نظام انصاف کو بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ ایف آئی آر درج کرانے سے لے کر پولیس تفتیش، استغاثہ اور عدالتی کارروائی، پورا نظام ہی مکمل طور پر مجرموں، قانون شکنوں، بدعنوانوں اور مافیاؤں کے حق میں طاعون زدہ ہو چکا ہے۔ کچھ لوگوں کو یقین ہے کہ فوجی عدالتوں کا حل عدالتی جانچ پڑتال کا متحمل نہیں ہو سکے گا لیکن دوسرے یہ دلیل دیتے ہیں کہ عدلیہ اپنی اور فوجداری نظام انصاف کی ناکامیوں کو نظرانداز کیسے کر سکتی ہے۔ پاکستان کو شدت کے ساتھ ایک قابل عمل اور تادیر باقی رہنے والے حل کی ضرورت ہے جس کے تحت موثر، اہل اور ردعمل کا اظہار کرنے والا فوجداری نظام انصاف تشکیل دیا جا سکے۔ ہم سب کی یہ خواہش ہے کہ ہماری عدلیہ بے لاگ اور جاندار ہو لیکن اگر کھل کر بات کریں تو کہنا پڑے گا کہ مستقبل میں ایسا ہونے کا امکان نہیں۔ عدالتوں میں ہونے والی روایتی تاخیر کے علاوہ جن دہشت گردوں کو سیکورٹی فورسز گرفتار کرتی ہیں ان کی طرف سے جج صاحبان اور ان کے خلاف پیش ہونے والے وکلاء کو حقیقی خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اکثر اوقات گواہوں کو عدالتوں میں پیش ہونے سے

روک دیا جاتا ہے، گواہوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ ججوں کو دھمکیاں دی جاتی ہیں اور انہیں بم دھماکوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جیلوں کے نظام میں بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ ہم نے ماضی قریب میں دیکھا کہ دہشت گرد جیل توڑ کر اپنے ساتھیوں کو چھڑوا کر لے گئے۔ کراچی سینٹرل جیل میں سرنگ کھود کر دہشت گردوں کو فرار کراتے کی کوشش کی گئی جسے پاک فوج کے جوانوں نے بروقت ناکام بنادیا۔

ایک تشویش یہ ہے کہ فوجی عدالتیں ہوسکتا ہے کہ بے گناہ شہریوں کو سزا سنادیں کیونکہ ایسی عدالتوں میں بے گناہی ثابت کرنے کا بوجھ ملزم پر ہوتا ہے۔ سویلین کورٹس میں ریاست جرم ثابت کرتی ہے، لیکن ناقص نظام کی وجہ سے تاخیر بھی ہوجاتی اور بہت سے دہشت گرد اور مجرم رہا بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ سول عدالتیں بہت اعلیٰ معیار کی گواہی کو ہی قبول کرتی ہیں۔ تاہم جب ہمیں ایک ایسے وحشی دشمن سے واسطہ ہے جو ہماری جان کے درپے ہے تو ہمارے پاس اتنا موقع نہیں کہ آئین اور قانون کی نزاکتوں کو ملحوظ خاطر رکھنے کے لئے اپنے ہاتھ باندھ لیں تاکہ وہ ہمارے سر قلم کر ڈالے۔

یقیناً ہم سفاکیت میں طالبان کے ہم پلہ نہیں ہوسکتے، لیکن پھر بھی ہمیں اپنے دفاعی حصار کو توانا کرنا ہے۔ اگر اس کے لئے کچھ دیر کے لئے انسانی حقوق کو نظر انداز کرنا پڑے، تو اس سے بھی گریز نہیں کرنا چاہئے۔ دہشت گردوں کے خوف کے علاوہ گواہ اس لئے بھی عدالتوں میں پیش ہونے سے گریزاں رہتے ہیں کیونکہ وہاں تاریخوں پر تاریخیں دے کر کیس کو لٹکا دیا جاتا ہے۔ وکلا بھی فیس لے کر کیس آگے کراتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کرنا معمول کی بات ہے۔ معمولی سی بات پر اسٹے آرڈر دیئے جاتے ہیں، اس طرح اگر کسی نے کسی کی جگہ پر قبضہ کیا ہوا ہے تو وہ کئی عشروں تک اسٹے آرڈر کے ذریعے اس پر اپنا قبضہ برقرار رکھتے ہوئے جائیداد کے اصل مالک کو خوار کرتا رہتا ہے۔ پولیس بھی کرائے کے گواہ پیش کرتے ہوئے جس کو چاہت یہی سزا دلوا دیتی ہے۔ ان حقائق

کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ ہمارا موجودہ قانونی نظام دہشت گردی سے لڑنے کے لئے ابھی تیار نہیں ہے۔ اس سے یہ توقع کرنا زیادتی ہوگی کہ راتوں رات سپر مین بن کر یہ جرائم پیشہ افراد کا خاتمہ کر دے گا۔

فوجی عدالتوں کے قیام کی ضرورت کیوں پیش آئی اس بارے میں کوئی دو رائے نہیں ہیں۔ سب ہی جانتے ہیں کہ ملک اس وقت دہشت گردی، فرقہ واریت اور انتہا پسندی کی آگ میں جل رہا ہے کسی کی جان محفوظ ہے نہ مال جبکہ سول حکومتوں اور عدالتوں کی کارکردگی کو مایوس کن قرار دیا جارہا تھا۔ گرفتار دہشت گرد کئی کئی برسوں سے جیلوں میں بند ہیں مگر انہیں سنائی گئی سزائے موت پر عملدر آمد نہیں ہو پا رہا تھا اور یہ دہشت گرد جیلوں میں بیٹھ کر بھی اپنے نیٹ ورک چلا رہے تھے۔ دہشت گردی، فرقہ واریت اور انتہا پسندی نے نہ صرف معاشرے کے تار پور بکھیر کر رکھ دیئے ہیں بلکہ پاکستان کو کئی برس پیچھے کی جانب دھکیل دیا ہے۔ المیہ یہ تھا کہ سول حکومتوں کو معاشرے کو پر امن رکھنے کے لئے جو کردار ادا کرنا چاہئے تھا وہ نہیں کر سکیں جس کی بناء پر یہ ناسور اب گلی محلے کی سطح تک پھیل کر معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔

اس آگ نے گلشن اور گلستان کی ساتھ پھول تک جلا دیئے ہیں۔ یہ وہ حالات تھے جن میں فوجی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا فوجی عدالتوں کے بارے میں کچھ لوگ اپنے تحفظات کا اظہار کر رہے ہیں اور کوئی کچھ کہہ رہا ہے مگر اگر حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو اس وقت فوجی عدالتوں کے ذریعے ہی ملکی عدالتی نظام کو حوصلہ دیا اور بہتری لائی جاسکنے کے ساتھ خوف کی فضا سے باہر نکلا جاسکتا ہے۔ اصولی طور پر تو معاشرے کو امن وامان کا گہوارہ بنانا شہریوں کو معاشی اور سماجی تحفظ فراہم کرنا سول حکومت کی ہی ذمہ داری ہے۔ فوج بھی حکومت کا ہی ایک ادارہ ہے جس کی ذمہ داری ملک کی اندرونی اور بیرونی سرحدوں کی حفاظت ہے۔ اگر امن وامان قائم کرنے اور دہشت گردوں کو سزا دلانے کے حوالے سے

فوجی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے تو اس پر واویلا کیوں؟ ملک میں امن وامان کے ساتھ انصاف پر مبنی معاشرہ قائم ہونا چاہئے۔اس کے لئے خواہ کوئی بھی طریقہ کار اختیار کیا جائے عوام کے لئے قابل قبول ہوگا۔عوام کی زندگیاں اجیرن ہوچکی ہیں بلکہ مذہب، مسلک،عقیدے،فرقہ واریت،نسلی،لسانی تعصب کے نام پر پھیلائی گئی نفرت کی آگ جو اب حدیں اور سرحدیں کراس کرتی جارہی ہے۔اسے روکنے کی تدابیر نہ کی گئی تو یہ کرۂ ارض شاید انسانوں کے رہنے کے قابل نہ رہے۔

فوجی عدالتوں کی مخالفت دو تین حلقوں کی جانب سے ہورہی ہے۔وکلا برادری، عدلیہ کے ریٹائر ججوں کی اکثریت بشمول سابق چیف جسٹس افتخار چوہدری، بعض ہیومن رائٹس ایکٹوسٹس، فوج اور اسٹیبلشمنٹ کے لئے نسبتاً ناپسندیدہ جذبات رکھنے والے سول سوسائٹی ایکٹوسٹس اور سیاسی ورکر، سب سے بڑھ کر بعض مذہبی سیاسی جماعتیں اور دینی مدارس پر مشتمل ایک بڑا دینی حلقہ۔ یہ سب اپنی اپنی وجوہ کی بنا پر مخالفت کررہے ہیں۔ کسی کو اندیشہ ہے کہ فوجی عدالتیں ہمارے سول جوڈیشری سسٹم کی توہین اور اسے ناکارہ ثابت کرنے کے مترادف ہے، کسی کو اپیل کا حق نہ ہونے پر اصولی اعتراض ہے کہ اس سے فیئر ٹرائل ممکن نہیں ہوپائے گا، کسی کے خیال میں اس سے سویلین بالادستی کو نقصان پہنچے گا اور عملی طور پر فوج کی حکمرانی کی راہ ہموار ہوگی۔مخالفت کرنے والوں میں پیش پیش جے یو آئی فضل الرحمٰن گروپ اور ان کے حامی مسلک کے علماء، مدارس اور ان کی تنظیمیں ہیں۔انہیں خطرہ ہے کہ اس آئینی ترمیم سے مذہبی حلقوں، خاص کر انہیں نشانہ بنایا جائے گا۔آئینی ترمیم میں موجودہ فقرہ ''مذہب اور فرقے کے نام پر دہشت گردی کرنے والوں'' پر انہیں شدید اعتراض ہے۔

فوجی عدالتوں کے حامیوں کے دو تین دلائل ہیں۔ مسلم لیگ (ن) کے لیڈر اسے ناپسندیدہ آپشن قرار دیتے ہیں مگر ان کے خیال میں ملک کے ہنگامی حالات اس کے

متقاضی ہیں اور اس کے بغیر دہشت گردوں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔ اگر کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا ہو جائے تو پھر غیر معمولی اقدامات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا بھر میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ زمانہ جنگ میں زمانہ امن کے قوانین نہیں چل سکتے۔ اگر کوئی وباء بھی پھیل جاتی تو اس کے لئے بھی ہنگامی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وباء پھیل جائے تو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بہت کچھ تبدیل کرنا پڑتا ہے۔

فوجی عدالتوں کے حوالے سے دو تین تکنیکی نوعیت کے پوائنٹس بھی موجود ہیں۔ ان عدالتوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ وقت بچے گا اور دہشت گردوں کے خلاف مختصر عرصے میں فیصلہ کن کارروائی ہو سکے گی، اپیل کا حق نہ ہونے کے باعث فیصلے پر فوری عملدر آمد بھی ہو جائے گا، ہمارے ہاں وکلاء برادری جس طرح قانونی نکات اٹھا کر کیس کو لمبا کرتی اور لٹکاتی ہے، وہ نہیں ہو سکے گا۔ آرمی کورٹ کے جج کرنل کی سطح کے افسر ہوں گے، جس کی شناخت پوشیدہ رکھی جائے گی، فوج کے مخصوص ڈسپلن کے تحت ایسا ممکن بھی ہو سکے گا، ورنہ سول عدالتوں میں اگر ججز کے نام پوشیدہ رکھنے کی کوشش بھی کی جائے تو اہلکار اور ریڈرز جیسے عدالتی عملے سے چند سو روپوں کے عوض ہر قسم کی معلومات لی جاسکتی ہیں۔ فوجی عدالتوں میں تحفظ ہونے کے ناطے جج بے خوف ہو کر فیصلے دے سکیں گے ورنہ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں، جہاں انسداد دہشت گردی عدالت کے ججوں نے بعض ہائی پروفائل کیسز سننے سے انکار کر دیا۔ تیسرا اور سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ اس سے آرمی پرسنگ پرسنز کے حوالے سے دباؤ کم ہوگا اور وہ ان دہشت گردوں کو نسبتاً زیادہ قانونی فریم ورک کے تحت ہینڈل کر سکے گی۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ دہشت گرد ایک منفرد قسم کا مجرم ہے، اس کا بالعموم کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں ہوتا، اس کے جرم کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ چشم دید گواہ یا روایتی قوانین شہادت کا رول نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے اس لئے اسپیشل ضوابط کا اجراء مجبوری

بن جاتا ہے۔ ہمارا مروجہ کرمنل جسٹس سسٹم تو اس قدر کمزور ہے کہ تسلیم شدہ ہسٹری شیٹر مجرم، بدنام دہشت گرد بھی عدم پیروی، عدم ثبوت یا بعض کیسز میں جج صاحبان کو دھمکیوں کے پیش نظر باعزت بری ہوجاتے ہیں اور ''انصاف کی فراہمی'' کی واحد صورت پولیس مقابلہ ہی رہ جاتا ہے۔

فوجی عدالتیں اور نظریہ ضرورت

فوجی عدالتوں کا قیام آج کا نظریہ ضرورت ہے۔ نظریہ ضرورت کبھی نہیں مرتا۔ نظریہ ضرورت کو ایک زمانے میں بہت بدنامی ملی۔ یہی وہ نظریہ تھا جس کے تحت عسکری قیادت سیاست دانوں کے ناکام ہونے پر ملک کی باگ ڈور سنبھالتی تھی اور اس عسکری مداخلت کو ہماری عدالتیں نظریہ ضرورت کے تحت توثیق کر دیتی تھیں۔ اسی لئے جمہوریت نواز سیاستدانوں نے اپنی ناکامی کا سارا ملبہ نظریہ ضرورت پر ڈال دیا اور اتنی مخالفت کی کہ اسے زندہ دفن کرنے کے درپے ہوگئے کہ نہ نظریہ ضرورت ہوگا اور نہ اسے بنیاد بنا کر کوئی جمہوریت پر شب خون مارے گا۔ ماضی میں بھی جب جب مارشل لاء لگا تو ہماری عدالتوں نے اسی نظریے کے تحت عسکری مداخلت کو جائز قرار دیا۔ سابق چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے دومرتبہ پرویز مشرف سے گھائل ہونے کے بعد جب بحالی حاصل کی تو انہوں نے 31 جولائی 2009ء کو ایک تاریخی فیصلہ دیا جس میں جنرل پرویز مشرف کے تمام غیر آئینی اقدامات کو کالعدم قرار دے دیا اور آئندہ کے لئے بھی فیصلے میں لکھ دیا کہ کسی جرنیل نے ایڈونچر کرنے کی کوشش کی تو اس کا یہ عمل غداری ہوگا اور اس کی سزا موت ہوگی۔ جسٹس افتخار محمد چوہدری کے اس فیصلے اور اٹھارویں آئینی ترمیم کی منظوری کے بعد یہ سمجھا جانے لگا کہ نظریہ ضرورت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہوگیا۔ حالانکہ انتھروپولوجی کے اصول کے مطابق ضرورت ایسا عنصر ہے جسے انسانی زندگی میں نہ کبھی ختم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس

کا خاتمہ فطرتاً ممکن ہے۔ حالات ایسے پلٹا کھاتے ہیں کہ غیر ضروری عنصر بھی ناگزیر بن جاتا ہے۔ کوئی بھی ضرورت کسی بھی وقت درپیش ہوسکتی ہے۔ نظریہ ضرورت کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوسکتی۔ ملک میں فوجی عدالتوں کے قیام کے فیصلے کی بنیاد اسی نظریے پر قائم ہے۔ سب جانتے ہیں کہ فوجی عدالتوں کا قیام متوازی عدالتی نظام لانے کے مترادف ہے۔ سپریم کورٹ شیخ لیاقت کیس میں فوجی عدالتوں کے خلاف مفصل فیصلہ دے چکی ہے۔ کچھ ساست دان فوجی عدالتوں کے قیام کو سوفٹ مارشل لاء سے تعبیر کررہے ہیں۔ سابق چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری بھی کہہ چکے ہیں کہ فوجی عالتوں کا قیام غیر آئینی ہوگا ان عدالتوں کے قیام کے لئے کوئی آئینی ترمیم بھی کی گئی تو وہ بھی غیر آئینی ہوگی کیونکہ آزاد عدلیہ کے ہوتے ہوئے کسی فوجی عدالت کی ضرورت نہیں۔ لیکن افتخار محمد چوہدری کا یہ کہنا بھی نظریہ ضرورت اور موجودہ ملکی حالات کے تناظر میں بالکل غلط ثابت ہوا۔ افتخار چوہدری ان فکر انگیز اور پریشان کن حقائق کو بھول گئے کہ اعلیٰ عدلیہ اور ماتحت عدالتوں میں دہشت گردی سے متعلق کتنے مقدمات زیر التواء ہیں وہ یہ بھی بھول گئے کہ آج اگر ملکی عدلیہ دہشت گردوں کے مقدمات میں جنگی بنیادوں پر کام کررہی ہوتی تو شاید سولہ دسمبر جیسے سانحے کی نوبت نہ آتی۔ مثال کے طور پر انسداد دہشت گردی کے قانون میں درج ہے کہ دہشت گردی کا مقدمہ سات روز میں نمٹایا جائے گا۔ لیکن ہماری عدالتی تاریخ میں شاید ہی کسی انسداد دہشت گردی کی عدالت نے اس قانون پر عمل کیا ہو۔ نتیجہ یہی ہے کہ جو آج ہم دیکھ رہے ہیں بلکہ بھگت رہے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عدالتیں دہشت گردوں کے خلاف مقدمات نمٹانے سے قاصر رہیں اسی لئے ایک متوازی عدلیہ یعنی فوجی عدالتوں کی ضرورت پیش آئی۔

آج پوری قومی قیادت نے متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ فوجی عدالتیں بنیں گی تو دہشت گرد پھانسی چڑھیں گے ورنہ سول عدالتوں پر معاملہ چھوڑا گیا تو پھر کبھی بھی اپیلوں سے آگے بات نہیں بڑھے گی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ آئین کوئی قرآنی صحیفہ نہیں کہ اس کی روح کو

تبدیل نہ کیا جا سکے۔ آج اکیسویں آئینی ترمیم کے ذریعے دو سال کے لئے فوجی عدالتوں کو آئینی تحفظ دیا جا رہا ہے۔ اور آرمی، ایئر فورس اور نیوی کے متعلقہ قوانین اور تحفظ پاکستان ایکٹ کو آئین کے شیڈول اوّل میں شامل کر کے تحفظ دیا جا رہا ہے تا کہ ملک کی کوئی عدالت ان قوانین کو دو سال کے لئے غیر آئینی نہ قرار دے سکے۔ اب جن عدالتی فیصلوں میں یہ لکھا گیا تھا کہ نظریہ ضرورت دفن کر دیا گیا ہے وہ تحریریں غلط ثابت ہوئیں۔ نظریہ ضرورت دفن ہونے کے باوجود زندہ ہے۔ اور ہم نے اگر قومی اور ملکی سطح پر غلط فیصلے کئے تو آئندہ بھی یہ نظریہ ہمیں اپنی اہمیت کا احساس دلاتا رہے گا بلکہ جتاتا رہے گا۔ نظریہ ضرورت کی بجائے ہمیں اپنی کوتاہیوں کو دفن کرنا چاہیئے۔

اگر ہمارا نظام عدل موثر اور فعال ہوتا اور بنچ و بار اپنی ذمے داریاں عوام کی توقعات کے مطابق پوری کر رہے ہوتے تو فوجی عدالتوں کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے جج صاحبان اور وکلاء اپنی کارکردگی پر افسوس کا اظہار تو کریں۔ پاکستان میں فوجی آمر طویل مارشل لاء نافذ کرتے رہے۔ وکلاء اور سول سوسائٹی نے عمومی طور پر ان غیر آئینی اور غیر جمہوری حکومتوں کو قبول کیا مگر ان کو آئینی اور جمہوری نظام کے اندر رہتے ہوئے فوجی عدالتوں کا قیام قبول نہیں ہے۔ جمہوری حکومتیں اگر ناکام نہ ہوتیں اور عوام میں اپنا بھرم قائم رکھتیں تو افواج پاکستان کو اپنی آئینی حدود سے تجاوز کی ترغیب ہی نہ ملتی۔

سیاست دان، وکلاء، جج اور انسانی حقوق کے علمبردار بتائیں کہ گزشتہ دس سالوں کے دوران کتنے دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچایا گیا۔ اب اگر آئین کے اندر رہتے ہوئے دہشت گردوں کا قلع قمع کرنے کی صورت نکالی جا رہی ہے تو انسانی جانوں کے تحفظ کے لئے ان کوششوں کی حمایت کیوں نہ کی جائے۔ بڑے قومی مقصد کے لئے سیاسی اور فوجی قیادت میں اشتراک اور اتفاق کی جو صورت پیدا ہوئی ہے وہ حوصلہ افزا ہے۔ اعتراضات پر آنے والے دن ماضی کے کوڑے دان میں دفن ہوتے چلے جائیں گے۔ مگر کارکردگی اور

مطلوبہ نتائج کے حوالے سے پاکستانی عوام ہی نہیں پوری دنیا کی نظریں ان عدالتوں پر مرکوز رہیں گی پارلیمنٹ میں آئین ترمیم کے ذریعہ بننے والی عدالتوں کو پوری قوم کی تائید کی سرخروئی حاصل ہوگئی ہے۔ دعا کرنی چاہئے مطلوبہ نتائج کے حوالے سے ان کی کارکردگی نتیجہ خیز ثابت ہو ملک حقیقی معنوں میں امن کا گہوارہ بن جائے۔ فوج ایک انتہائی منظم ادارہ ہے۔ ہر رینک کا فوجی ڈسپلن کا پابند ہوتا ہے اس لئے یہ اعتماد ویقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ فوجی جج متعینہ آئینی وقانونی حدود سے تجاوز نہیں کریں گے سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جمہوری حکومت اور سیاست دان کوئی متبادل حل تلاش نہیں کر سکے اور دہشت گردی کے خاتمہ کے لئے فوجی عدالتیں ہی نسخہ کیمیا تسلیم کر لی گئیں ہیں تو پھر سیاست دانوں کا اس تسلیم و رضا کے حوالے سے مجبوری کا تاثر کیا جواز رکھتا ہے یعنی جب ناچ لئے پھر گھونگھٹ کیسا؟

وزیراعظم نواز شریف بھی موجودہ عدلیہ کے کردار پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ عدلیہ درست انداز میں کام کر رہی ہوتی تو فوجی عدالتوں کی ضرورت نہ پڑتی، مقدمات زیر التواء رہنے سے بدامنی بڑھی، عدلیہ کارکردگی کا مظاہرہ کرے، فوجی عدالتیں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے نہیں بلکہ جمہوری حکومت نے بنائی ہیں، عدلیہ کی آزادی کے ساتھ عدلیہ کی کارکردگی بھی ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ فوجی عدالتیں کراچی کے مقدمات بھی سنیں گی، شمالی علاقوں میں کوہ پیماؤں کا قتل اور ملالہ یوسف زئی پر حملے کا مقدمہ فوجی عدالتوں میں چلایا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ آئندہ نسل کے رہنے کے لئے پرامن، اور مستحکم پاکستان بنانا چاہتے ہیں، دھرنے نہ ہوتے تو معیشت مزید بہتر ہوتی۔ ان خیالات کا اظہار وزیراعظم نواز شریف نے 14 جنوری 2015ء کو ایوان صدر میں تاجر برادری کے وفد سے گفتگو، صدر مملکت ممنون حسین سے ملاقات اور نیشنل ایکشن پلان پر عملدرآمد کے حوالے سے اجلاس میں کیا۔

وزیراعظم نواز شریف کا کہنا تھا کہ وہ خود بھی فوجی عدالتوں کے حق میں نہیں ہیں۔

عدلیہ درست انداز میں کام کر رہی ہوتی تو آج فوجی عدالتوں کی ضرورت نہ پڑتی۔

اعلیٰ عدلیہ اور فوجی عدالتیں

سپریم کورٹ کے جج صاحبان کی جانب سے وزیراعظم کے اس بیان پر سخت ردعمل سامنے آیا۔ چکوال کے ایک شہری کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ مقدمہ یہ تھا کہ پولیس نے اسے طویل عرصہ سے مقدمے میں الجھا رکھا ہے۔ اس مقدمے کی سماعت عدالت عظمیٰ کے سینئر جج جناب جسٹس جواد ایس خواجہ اور جناب جسٹس سُرمد جلال عثمانی کر رہے تھے۔ دورکنی بنچ کے سربراہ جسٹس جواد ایس خواجہ نے وزیراعظم نواز شریف کے بیان پر سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ریمارکس دیئے کہ عدالتوں میں مقدمات کے زیر التوا رہنے کی ذمہ دار عدالتیں نہیں، خود سرکار ہے، حکومت خود کو نااہل قرار دے کر بھی تمام تر الزامات عدالتوں پر تھونپ دیتی ہے۔ ایک طرف سرکار کہتی ہے کہ ان کی اپنی نااہلی ہے کہ وہ موثر قانون سازی نہیں کر سکتی، دوسری طرف کہہ رہی ہے کہ عدالتیں اپنا کام نہیں کرتیں، جب ملزمان کے خلاف شہادتیں اکٹھی نہیں ہوں گی۔ چالان مکمل نہیں ہوں گے تو ملزمان عدالتوں سے بری ہوتے رہیں گے۔ بنچ کے دوسرے فاضل رکن جناب جسٹس سرمد جلال عثمانی نے ریمارکس دیئے کہ فوجی عدالتیں بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیا فوجی عدالتوں میں بیٹھے ہوئے جج موجودہ اعلیٰ عدلیہ میں بیٹھے ججوں سے زیادہ ذہین فرض شناس اور قابل ہیں کہ وہ سارے مسائل کا خاتمہ کر دیں گے۔

اسی مقدمے کی سماعت کے دوران ایک مرحلے پر جناب جسٹس جواد ایس خواجہ کا کہنا تھا کہ عوام کو انصاف فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ عدالتیں اپنا کام کریں یا حکومت کا بھی کام کریں، اگر حکومت نے اپنا کام نہیں کرنا تو عدالت کو ہی حکومت کرنے کا اختیار بھی دے دے۔ انہوں نے کمرہ عدالت میں موجود ایڈووکیٹ جنرل اور پراسیکیوٹر جنرل پنجاب

سے کہا کہ آپ سرکار کے نمائندے ہیں، انہیں جا کر بتائیں کہ وہ اپنا کام کرے، ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔ تفتیش شفاف، منصفانہ اور ایماندارانہ طریقے سے کی جائے تو معاملات بہتر ہو سکتے ہیں۔

جیلوں میں قیدیوں کی حالت زار سے متعلق از خود نوٹس کے ایک مختلف مقدمے کی سماعت کے دوران جسٹس آصف سعید کھوسہ نے بھی اپنے ریمارکس میں وزیراعظم کے بیان کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ وزیراعظم کی جانب سے عدلیہ کے بارے میں بیان پڑھ کر دکھ ہوا، جبکہ عدلیہ میں ججوں کی قلت کا یہ عالم ہے کہ ملک بھر کی مختلف عدالتوں میں سترہ لاکھ مقدمات زیر التوا ہیں، جن کی سماعت کے لئے صرف 24 سو جج ہیں۔ زیر التوا مقدمات کی وجہ عدالتیں نہیں، حکومت، تفتیش اور استغاثہ کی کوتاہی ہے۔ عدلیہ اپنی استعداد سے بڑھ کر کارکردگی دکھا رہی ہے۔ ناقص تفتیش کی وجہ سے لوگ بری ہو جاتے ہیں۔ تفتیش درست انداز میں کی جائے تو ملزمان سزا سے نہیں بچ سکتے لہٰذا نظام کی تمام خرابی کا بوجھ عدلیہ پر نہ ڈالا جائے۔

اسے محض اتفاق نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ایک ہی دن ملک کی سب سے بڑی عدالت کے تین جج صاحبان نے ایک ہی طرح کے خیالات کا اظہار کیا، بلکہ اس ''اتفاق رائے'' سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نظام عدل کیسے حالات سے دوچار ہے اور یہ کہ مقدمات کے جلد اور منصفانہ فیصلوں کی راہ میں عدالتوں کے سامنے کس قدر رکاوٹیں ہیں۔ افسوس! کہ ان مشکلات کو سمجھنے اور انہیں دور کرنے کی کبھی کوشش نہیں ہوئی۔ ہمارا تفتیشی و عدالتی نظام سامراجی دور کے خطوط پر استوار ہے۔ غیر ملکی آقاؤں کے تقاضے مختلف تھے، سماجی حالات مختلف تھے۔ جرائم کی تعداد بہت کم تھی۔ پولیس میں کرپشن نے رواج نہیں پکڑا تھا۔ مجرم عدالتوں کو چیلنج کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ آج پولیس میں حد درجہ کرپشن ہے اور اوپر سے ذہانت سے بھی بعید۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں اگر عدلیہ اور انصاف مجبور ہیں تو اس

پر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہئے۔

سپریم کورٹ کے تینوں فاضل جج صاحبان نے ملٹری کورٹس کے حوالے جن ریمارکس کا اظہار کیا ہے اسے انتباہ سمجھ لینا چاہئے۔ سیاسی و عسکری قیادت کو دہشت گردوں کو سزا دینے کے لئے کسی اور میکنزم پر ابھی سے غور کر لینا چاہئے۔ لگتا یہ ہے کہ کسی مرحلے پر اگر اداروں کے درمیان تصادم جیسی کیفیت پیدا ہوگئی تو اس کا فائدہ لازمی طور پر دہشت گرد اٹھائیں گے۔

وزیراعظم کے بیان کو ملٹری کورٹس کے معاملے میں سپریم کورٹ پر دباؤ ڈالنے کی ایک چال کے طور پر دیکھا گیا۔ 21 ویں ترمیم کو چیلنج کرنے کے لئے سات پٹیشنز پہلے ہی دائر کی جا چکی ہیں۔ لاہور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کی جاب سے دائر درخواست میں اکیسویں آئینی ترمیم اور فوجی ایکٹ میں ترمیم کو کالعدم قرار دینے کی استدعا کی گئی ہے۔ درخواست میں موقف اختیار کیا گیا ہے کہ آئینی ترامیم کے ذریعے آزادی اظہار پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ یہ ترامیم آئین کے بنیادی ڈھانچے اور بنیادی حقوق سے متصادم ہیں۔ پارلیمنٹ نے عدلیہ کی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی پارلیمنٹ ایسا قانون نہیں بناتی جو بنیادی اصولوں کے خلاف ہو۔ عدلیہ نے ساڑھے آٹھ ہزار ملزمان کو موت کی سزا سنائی لیکن پاکستانی حکومت نے امریکہ اور یورپی یونین کی خاطر آٹھ سال تک سزائیں التواء میں رکھیں۔ درخواست میں شیخ لیاقت حسین کیس کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وزیراعظم اور اتحادی جماعتوں نے فوج کے دباؤ میں آکر ترامیم کیں اور یہ اقدام حلف کی خلاف ورزی ہے اس لئے ارکان پارلیمنٹ کے خلاف آرٹیکل 6 کے تحت کارروائی کی جائے۔ لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی درخواست سماعت کے لئے منظور کر لی گئی ہے اور اس کے لئے چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس ناصر الملک کی سربراہی میں تین رکنی بنچ مذکورہ درخواست کی سماعت کر رہا ہے۔

اس دوران وکلا برادری کی اکثریت اس ترمیم اور ساتھ ہی ملٹری کورٹس کی مخالفت کر رہی ہے۔ اگرچہ اس سے گریز کیا جا سکتا تھا لیکن سپریم کورٹ نے اپنے ججوں کے مشاہدات کے ذریعے لفظوں کو توڑے مروڑ بغیر جواب جاری کر دیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک معزز جج نے یہ تک کہہ دیا کہ ”ملٹری کورٹس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ بظاہر 21 ویں آئینی ترمیم کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ سپریم کورٹ کے ججوں کے بیان کے کچھ ہی گھنٹوں بعد، یعنی اسی دن، آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے لندن میں ایک تقریب کے دوران کہا کہ ملٹری کورٹس عوام کی خواہشات کے مطابق قائم کی گئی ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ پاکستان حالت جنگ میں ہے، اور حکومت اور مسلح افواج دہشت گردوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے پرعزم ہیں کیونکہ آرمی پبلک اسکول کے حالیہ واقعہ نے وہ حد ظاہر کر دی ہے جہاں تک دہشت گرد جا سکتے ہیں۔ یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے سپریم کورٹ کے ججوں کے جواب میں بیان دیا لیکن ان کے بیان کا وقت بہت دلچسپ ہے اور سپریم کورٹ کے ریمارکس کا جواب سمجھا جا سکتا ہے۔ آرمی چیف کے بیان سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پوری قوم، فوج، حکومت اور پارلیمنٹ ملٹری کورٹس کی حمایت کر رہے ہیں۔ ایسی صورت حال تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے اور اگر اسے سمجھداری کے ساتھ نہ نمٹایا گیا تو اداروں کے مابین تصادم کی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ حکومت اور فوج کے پاس ملٹری کورٹس کے قیام کی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن سپریم کورٹ حتمی طور پر جس بات کا فیصلہ کرے گی اسے سب کو قبول کرنا ہو گا۔

ممتاز آئینی ماہر بیرسٹر فروغ نسیم نے کہا ہے کہ فوجی عدالتوں کے قیام کے لئے اسمبلی میں پیش کی گئی آئینی اور قانونی ترامیم کو سپریم کورٹ میں ضرور چیلنج کیا جائے گا۔ فوجی عدالتوں کے قیام کے لئے آرٹیکل 175 میں ترمیم کا عدالت میں دفاع کرنا حکومتی ٹیم کا کڑا امتحان ہو گا۔ حکومت کو اصل چیلنج سپریم کورٹ میں پیش آنے کا امکان ہے کیونکہ فوجی

عدالتوں کی تشکیل کے لئے آئین میں ترمیم سے متعلق تمام احتیاطی تدابیر کرنے کے باوجود ترمیم دستور کے بنیادی ڈھانچہ کی خلاف ورزی ہے۔ جو سپریم کورٹ میں چیلنج کی جاسکتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار آئین وقانون کے ماہرین نے کیا تاہم بعض ماہرین قانون کا کہنا ہے کہ ملک حالت جنگ میں ہے اور غیر معمولی حالات کا سامنا ہے اس لئے غیر معمولی اقدامات کی ضرورت ہے جبکہ فوجی عدالتوں کا قیام عمومی عدالتی نظام کے متوازی نہیں ہے تاہم سپریم کورٹ اس معاملے میں مداخلت نہیں کرے گی۔ فوجی عدالتوں کے حامی ماہرین کا کہنا ہے کہ فوجی عدالتیں خصوصی مقاصد کے لئے قائم کی جارہی ہیں لہٰذا وہ موجودہ عدالتی نظام کے اختیارات کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ سابق وزراء قانون ایس ایم ظفر، احمد بلال صوفی کا کہنا ہے کہ غیر معمولی حالات میں فوجی عدالتیں چیلنج نہیں ہوں گی۔ سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس (ر) وجیہہ الدین احمد کا کہنا ہے کہ بنیادی تبدیلی آرمی ایکٹ میں متعارف کرائی گئی ہے کیونکہ فوج کو دہشت گردوں کے خلاف سماعت کا اختیار دیا گیا ہے۔ ان کا موقف تھا کہ اس ترمیم کو تیار کرنے والے قانونی ماہرین نے ان تمام خامیوں کو دور کرنے کی اپنی پوری کوشش کی ہے جو سپریم کورٹ میں چیلنج ہوسکتی ہیں تاہم وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئے ہیں کہ آئین کے بنیادی ڈھانچے کے خلاف کوئی چیز موجود نہیں ہوسکتی اور سپریم کورٹ اس کو کالعدم و منسوخ کرسکتی ہے۔ یہ معاملات اس وقت حل ہوسکتا ہے جب سپریم کورٹ کو نظر ثانی کا اختیار دے دیا جائے۔ معروف آئینی ماہر اور سابق وزیر قانون احمد بلال صوفی کا کہنا ہے کہ اگر فوجی عدالتیں سخت گیر دہشت گردوں کے خلاف سماعت تک محدود رہتی ہیں تو سپریم کورٹ اس کا نوٹس نہیں لے سکتی، تاہم اگر ملٹری کورٹس اپنے طے شدہ اختیارات سے تجاوز کرتی ہیں تو سپریم کورٹ ایکشن لے سکتی ہے۔ سابقہ فوجی عدالتوں کو چیلنج کیا گیا تھا اور سپریم کورٹ نے انہیں کالعدم قرار دے دیا تھا کیونکہ وہ زمانہ امن تھا جبکہ اس وقت ملک حالت جنگ میں ہے اور سپریم کورٹ کو اس کا احساس ہے۔ معروف ماہر قانون ایس ایم

ظفر، بلال صوفی کے خیالات سے متفق ہیں کہ ملک حالت جنگ میں ہے۔ان کا کہنا تھا کہ پہلے انسداد دہشت گردی عدالت، انتظامی ٹریبونل، سمیت 4 نظام تھے جو عمومی عدالتی نظام کے متوازی کام کر رہے تھے اور سپریم کورٹ نے انہیں کالعدم قرار نہیں دیا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ یہ چاروں نظام حالت امن میں تشکیل دیئے گئے مگر اکیسویں ترمیم غیر معمولی حالات اور مخصوص مقاصد کے لئے متعارف کرائی گئی ہے جو سول عدالتوں کے اختیار کو منسوخ نہیں کریں گی۔

28 جنوری 2015ء کو سپریم کورٹ آف پاکستان نے 21ویں آئینی ترمیم کے ذریعے فوجی عدالتوں کے قیام کے خلاف دائر آئینی درخواستوں کی سماعت شروع کر دی۔ پہلی سماعت کے دوران عدالت عظمیٰ نے اٹارنی جنرل، ایڈووکیٹ جنرل اسلام آباد اور چاروں صوبوں کے ایڈووکیٹ جنرلز کو نوٹس جاری کرتے ہوئے ان سے درخواستوں کے بارے تفصیلی جواب طلب کر لیا جبکہ عدالت نے فوجی عدالتوں کا قیام روکنے کی درخواست پہلی ہی سماعت پر خارج کر دی۔ درخواست گزار کی جانب سے تحریک انصاف سے تعلق رکھنے والے وکیل حامد خان نے دلائل دیتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ فوجی عدالتوں کا قیام بنیادی حقوق کی خلاف ورزی اور آئین سے متصادم ہے۔ 21ویں ترمیم سے پورا آئینی ڈھانچہ متاثر ہوا ہے۔ لاہور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر شفقت چوہان نے عدالت سے استدعا کی ملٹری کورٹس کے کام کرنے پر پابندی لگائی جائے یا کیس کی جلد از جلد سماعت کو یقینی بنایا جائے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا کہ درخواست میں اٹھائے جانے والے آئینی سوالات اہم نوعیت کے ہیں۔ یہ ترمیم عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کو متاثر اور اسے کمزور کرنے کا باعث بنے گی۔ اٹارنی جنرل، پانچوں ایڈووکیٹ جنرلز درخواستوں میں جواب جمع کرائیں۔ چیف جسٹس ناصر الملک کی سربراہی میں جسٹس گلزار احمد اور جسٹس مشیر عالم پر مشتمل تین رکنی بنچ نے لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن (لاہور بنچ) کے صدر اور

دیگر کی طرف سے 21ویں آئینی ترمیم اور آرمی ایکٹ میں ترامیم کے خلاف دائر درخواستوں کی سماعت کی تو درخواست گزار لاہور ہائیکورٹ بار کی جانب سے حامد خان ایڈووکیٹ پیش ہوئے اور دلائل دیتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ 21ویں آئینی ترمیم پر پارلیمنٹ میں مناسب بحث نہیں کی گئی یہ آئین کے آرٹیکلز 175(3)2,-8,A اور 9 سمیت بہت سے آرٹیکلز سے متصادم ہے، جسٹس گلزار نے کہا کہ آپ کی جماعت نے بھی تو اس ترمیم کی حمایت کی تھی جس پر حامد خان نے کہا کہ میں یہاں لاہور ہائیکورٹ بار کی جانب سے پیش ہو رہا ہوں اور اسمبلی کا رکن بھی نہیں ہوں، اس کے علاوہ ترمیم کی منظوری کے روز ہماری پارٹی کے 34 ارکان نے اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا تھا بلکہ وہ غیر حاضر تھے، ان کا کہنا تھا کہ 16 دسمبر 2014ء کو آرمی پبلک اسکول پر حملہ ہوا اور 24 دسمبر کو آل پارٹیز کانفرنس ہوئی 2 جنوری کو دوسری آل پارٹیز کانفرنس ہوئی پہلی کانفرنس میں ملٹری کورٹس کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور دوسری میں اس کی منظوری دی گئی۔ انہوں نے کہا کہ میں خصوصی کمیٹی کا ممبر تھا اور میں نے حکومت کے اس فیصلہ کی مخالفت کی تھی، جس کی وجہ سے دوسری آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ حامد خان نے کہا کہ جس دن قومی اسمبلی نے اس ترمیم کو پاس کیا اسی دن سینیٹ نے بغیر کسی بامعنی بحث کے آئین میں 21ویں ترمیم کے ذریعے آرمی ایکٹ میں ترمیم کو منظور کر لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ترمیم سے پورا آئینی ڈھانچہ متاثر ہوا ہے، آئین کا آرٹیکل 175(3) عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کی ضمانت دیتا ہے جو اس ترمیم سے متاثر ہوا ہے جبکہ اس ترمیم نے آئین کے بنیادی جزو بنیادی شیڈول کو بھی متاثر کیا ہے حالانکہ اس شیڈول میں گزشتہ 39 سال سے کوئی ترمیم نہیں ہوئی، اس میں پہلی ترمیم 1976ء میں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس ترمیم نے آئین کے آرٹیکل 2-A کو بھی متاثر کیا ہے جس کے ذریعے عدلیہ کو مکمل تحفظ حاصل ہے اور عدالت عظمیٰ نے عاصمہ جیلانی کیس میں بھی اس ضمن میں واضح حکم دے رکھا ہے۔ حامد خان نے

کہا کہ اس آئینی ترمیم کے عدالتوں کے اس عمل پر سنگین اثرات مرتب ہوں گے، جس کے تحت وہ احکامات جاری کرتی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی بھی ایسا قانون جو آئین سے متصادم ہوا سے عدالت کالعدم قرار دے سکتی ہے اور ریاست ایسا کوئی قانون نہیں بنا سکتی جو بنیادی حقوق سے متصادم ہو۔ اس کے علاوہ اس ترمیم کے ذریعے آرٹیکل 8 کو بھی تبدیل کر دیا گیا ہے جو عدلیہ کو نظر ثانی کا اختیار دیتا ہے اور نظر ثانی کے اس اختیار کے ذریعے ہی انصاف تک رسائی ممکن ہے۔ انہوں نے کہا کہ مذکورہ ترامیم عدلیہ کو اپنے دائرہ اختیار سے باہر کر دیں گی، جبکہ اس نے عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کے عمل کو بھی روک دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ملٹری کورٹس کا قیام بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ جسٹس مشیر عالم نے اُن سے استفسار کیا کہ آرٹیکل 239 سے متعلق آپ کیا کہتے ہیں جو آئینی ترمیم کو کسی بھی عدالت میں چیلنج کرنے سے روکتا ہے، تو فاضل وکیل نے کہا کہ وہ اس حوالہ سے بعد میں دلائل پیش کریں گے کہ کسی بھی ترمیم میں آئین کے بنیادی ڈھانچہ کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ دوران سماعت لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن (لاہور بنچ) کے صدر شفقت چوہان نے عدالت سے استدعا کی کہ وہ فوجی عدالتوں کے کام کرنے پر پابندی لگائے یا دوسری صورت میں عدالت کیس کی جلد از جلد سماعت کو یقینی بنایا جائے، جس پر چیف جسٹس نے کہا کہ ہم مسول علیہان کو جواب داخل کروانے کے لئے مہلت دیں گے۔ بعد ازاں عدالت نے مختصر فیصلہ جاری کیا کہ درخوات گزار نے اپنی درخواست میں اہم آئینی نکات اٹھائے ہیں اور کہا ہے کہ 21 ویں آئینی ترمیم کے ذریعے فوجی عدالتوں کو سول افراد کو سزائیں دینے کا اختیار دیا گیا ہے، جبکہ یہ ترمیم عدلیہ کو بھی کمزور کرنے کا باعث بنے گی، اس کے علاوہ یہ عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی کو بھی متاثر کرتی ہے، درکواست میں جو آئینی سوالات اٹھائے گئے ہیں وہ اہم عوامی نوعیت کے ہیں اس لئے اٹارنی جنرل، پانچوں ایڈووکیٹ جنرلز کو نوٹس جاری کئے جاتے ہیں کہ وہ دو ہفتوں کے اندر تفصیلی جواب جمع کرائیں۔ اس کے علاوہ درخواست

میں بنائے گئے تمام جواب گزاروں کو بھی نوٹس جاری کئے جاتے ہیں، کیس کی سماعت 21 فروری تک ملتوی کردی گئی۔ (رپورٹ: روزنامہ جنگ کراچی مورخہ 29 جنوری 2015ء)

13 فروری 2015ء کو وکلا کی اس درخواست کی دوبارہ سماعت ہوئی۔ سپریم کورٹ میں جس وقت سماعت ہو رہی تھی عین اسی وقت دہشت گرد پشاور میں معصوم لوگوں پر ایک اور حملہ کرنے کے لئے پہنچ چکے تھے۔ اس مرتبہ ان کا نشانہ حیات آباد میں ایک مسجد اور امام بارگاہ تھی جس کا تفصیلی ذکر اگلے صفحات پر موجود ہے۔ دوران سماعت سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ اس بات کا تعین کیا جانا ضروری ہے کہ پارلیمنٹ کو ملک کے آئین کے بنیادی ڈھانچے میں ترمیم کرنے کا اختیار حاصل ہے یا نہیں۔ چاہتے ہیں اٹھارویں اور اکیسویں ترمیم کا معاملہ ایک ساتھ نمٹا دیں۔ عدالت عظمیٰ نے فوجی عدالتوں کے قیام اور 21 ویں آئینی ترمیم کے خلاف دائر درخواستوں کی سماعت کرتے ہوئے فوجی عدالتوں کے قیام سے متعلق 21 ویں آئینی ترمیم اور 18 ویں ترمیم کا زیر التوا کیس ایک ساتھ منسلک کر کے سماعت کرنے اور فل کورٹ تشکیل دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ عدالت نے 18 ویں ترمیم کے فریقین کو نوٹس جاری کرتے ہوئے چیف جسٹس نے ریمارکس دیتے ہوئے کہا کہ اس بات کا تعین کیا جانا ضروری ہے کہ پارلیمنٹ کو ملک کے آئین کے بنیادی ڈھانچے میں ترمیم کرنے کا اختیار حاصل ہے یا نہیں۔ چاہتے ہیں اٹھارویں اور اکیسویں ترمیم کا معاملہ ایک ساتھ نمٹا دیں۔ چیف جسٹس ناصر الملک کی سربراہی میں 3 رکنی بنچ نے 21 ویں آئینی ترمیم کے خلاف درخواستوں کی سماعت کی۔ سماعت شروع ہوئی تو خیبر پختونخوا حکومت کی جانب سے 21 ویں آئینی ترمیم کے حوالے سے جواب داخل کرا دیا گیا تاہم وفاق اور تین صوبوں کی جانب سے جواب جمع نہیں کرایا گیا۔ اٹارنی جنرل نے استدعا کی کہ جواب جمع کرانے کے لئے مزید وقت چاہیے جس پر چیف جسٹس ناصر الملک نے کہا کہ پہلے ہی کافی وقت

دے چکے ہیں۔ اٹارنی جنرل نے کہا کہ اکیسویں ترمیم کے خلاف مزید درخواستیں بھی آئی ہیں، سب کا ایک ساتھ جواب دینا چاہتے ہیں جس پر چیف جسٹس نے کہا کہ تمام درخواستوں میں ایک جیسا موقف اختیار کیا گیا، اٹھارویں ترمیم کا معاملہ بھی عدالت میں چار سال سے زیر التوا ہے۔ لاہور ہائیکورٹ بار کے وکیل حامد خان نے کہا کہ کیس کے حقائق مختلف ہیں، 19 ویں ترمیم کے ذریعے عدالت کے عبوری حکم پر عمل ہو چکا ہے، حامد خان نے کہا کہ 18 ویں اور 21 ویں ترمیم میں فرق ہے جس پر چیف جسٹس نے کہا کہ اگرچہ دونوں کے سبجیکٹ مختلف ہیں مگر قانونی نکات ایک جیسے ہیں جب جوابات آجائیں گے تو کیس فل کورٹ میں لگایا جائے گا۔ چیف جسٹس نے کہا کہ اٹھارویں ترمیم کے خلاف درخواستوں میں بھی بنیادی ڈھانچے کی بات کی گئی ہے دیکھنا ہوگا کہ پاکستان کے آئین کا کوئی بنیادی ڈھانچہ ہے بھی کہ نہیں؟ اگر ہے تو کیا پارلیمنٹ اس میں ترمیم کر سکتی ہے یا نہیں؟ چیف جسٹس نے کہا چاہتے ہیں کہ اٹھارویں او اکیسویں ترمیم کا معاملہ ایک ساتھ نمٹا دیں۔ عدالت یہ بھی جائزہ لے گی کہ کیا عدالت ان ترامیم کا جائزہ لے سکتی ہے اور یہ ترمیم آئین کے بنیادی ڈھانچے سے متصادم ہیں یا نہیں۔ درخواستوں میں آئین کے بنیادی ڈھانچے کے متاثر ہونے کا نکتہ اٹھایا گیا ہے اس لئے ان معاملات کے تعین کے لئے فل کورٹ تشکیل دیا جائے گا۔

سماعت کے بعد سپریم کورٹ کی وکیل اور انسانی حقوق کی علمبردار عاصمہ جہانگیر نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ آئین میں ترمیم کا اختیار پارلیمنٹ اور تشریح کا اختیار سپریم کورٹ کو ہے۔ عدالت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دیکھے کہ کوئی ترمیم بنیادی حقوق سے متصادم تو نہیں۔ پارلیمنٹ نے 21 ویں آئینی ترمیم کے ذریعے آرمی ایکٹ کو تحفظ دیا ہے۔ اب عدالت کو یہ دیکھنا ہے کہ پارلیمنٹ کے اس اقدام سے انسانی حقوق پر قدغن نہیں لگے گی۔

ہمارے ہاں ابھی تک یہ بات واضح نہیں کہ آیا آئین سپریم ہے یا پارلیمنٹ؟ فوجی عدالتوں کی بحث نے اس بات کو دوبارہ سے ایک نئے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ کیونکہ شیخ لیاقت حسین کیس کے بعد اب فوجی عدالتوں کو عام قانون کے ذریعے سول علاقوں میں جورس ڈکشن نہیں بنانے دی جاسکتی۔ وہ اس لئے کہ پارلیمنٹ ایک قانون عام قرارداد سادہ اکثریت سے بنا سکتی ہے اور وہ قانون آئین کے تابع ہوتا ہے اور اس لئے آئین کے تناظر میں جسٹس اجمل میاں کی سربراہی میں سپریم کورٹ کی فل بنچ نے فروری 1999ء کو (PLD 1999 SC 504) شیخ لیاقت حسین کیس کا فیصلہ سنایا تھا۔

ہاں یقیناً یہ کام آئین میں ترمیم کر کے کیا جاسکتا ہے اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ پارلیمنٹ سپریم ہے نہ کہ آئین۔

آئین کا (5) 239 کہتا ہے کہ پارلیمنٹ کی طرف سے کی ہوئی کسی بھی آئینی ترمیم کو کورٹ میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ سپریم کورٹ میں 21 ویں آئینی ترمیم اور فوجی عدالتوں کے قیام کے خلاف دائر درخواستوں پر وفاقی حکومت کی طرف سے اٹارنی جنرل نے جواب داخل کرایا جس میں حکومت نے کہا ہے کہ شدت پسندی کے واقعات سے نمٹنے کے لئے وفاقی حکومت کے پاس فوجی عدالتوں کے قیام کے سوا کوئی آپشن نہیں تھا کیونکہ گزشتہ کچھ عرصے میں کراچی بنوں اور ڈیرہ اسماعیل میں جیل توڑنے کے واقعات پیش آئے۔ کراچی سینٹرل جیل کے نیچے کھودی گئی سرنگ پکڑی گئی جو قریبی آبادی کے ایک مکان میں کھودی گئی۔ سرنگ 45 فٹ طویل کھودی جا چکی تھی اور یہ سرنگ جیل کی حدود میں داخل بھی ہو چکی تھی۔

بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کی جیلوں سے شدت پسند قیدیوں کو فرار کرانے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ فرار ہونے والے شدت پسندوں نے ملک بھر میں پرتشدد کارروائیاں جاری رکھیں جو آج بھی جاری ہیں۔ 21 ویں آئینی ترمیم سے بار کونسلوں کا

کوئی بنیادی حق متاثر نہیں ہوا۔ اٹارنی جنرل نے یہ دلیل بھی پیش کی کہ پاکستان کے آئین کا کوئی بنیادی ڈھانچہ نہیں ہے۔ پاکستان اور بھارت کے آئین میں بہت فرق ہے۔ بھارتی عدالتوں کے فیصلوں کا پاکستان میں من وعن اطلاق نہیں ہوسکتا۔ ایسا کرنا ہمارے آئین کی روح کے منافی ہوگا۔ 21ویں آئینی ترمیم آئین سے متصادم نہیں ہے۔ آئینی ترمیم اور فوجی عدالتوں کے خلاف درخواست نا قابل سماعت ہیں۔

اٹارنی جنرل سلمان اسلم بٹ نے 21ویں ترمیم اور فوجی عدالتوں کے قیام سے متعلق کیس میں وفاقی حکومت کا 43 صفحات پر مشتمل جواب سپریم کورٹ میں جمع کرادیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اکیسویں ترمیم اور فوجی عدالتوں کے قیام سے بار کونسلز کا کوئی بنیادی حق متاثر نہیں ہوا۔ اس حوالے سے درخواستیں نا قابل سماعت ہیں، انہیں خارج کیا جائے۔ اٹارنی جنرل کا کہنا ہے کہ پاکستان کی آئین کا کوئی بنیادی ڈھانچہ نہیں ہے۔ عدالتوں نے بھی اپنے فیصلوں میں بھی آئین کے بنیادی ڈھانچے کو تسلیم نہیں کیا۔ پارلیمنٹ کو آئین کے آرٹیکل 238 کے تحت اختیار حاصل ہے کہ وہ آئین میں ضروری ترامیم کرسکے، پارلیمنٹ کی ترمیم کو آرٹیکل 239 کے تحت کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا، دنیا کے دستور میں بھی آئین کے بنیادی ڈھانچے کا کوئی تصور نہیں ملتا، اگر کسی ملک کے آئین کا بنیادی ڈھانچہ ہے بھی تو اس کا باقاعدہ ذکر کیا گیا ہے۔ بھارتی عدلیہ کے فیصلوں کے حوالوں پر اٹارنی جنرل کا کہنا ہے کہ پاکستان اور بھارت کے آئین میں بہت زیادہ فرق ہے، بھارتی عدالتوں کے فیصلوں کا پاکستان میں من وعن اطلاق نہیں ہوسکتا۔ ایسا کرنا ہمارے آئین کی روح کے منافی ہوگا، عوام اور ادارے اہم موڑ پر کھڑے ہیں، ملک کو دہشت گردی کا سامنا ہے، دہشت گردی کے خاتمے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے دہشت گرد گروپ آئین کو تسلیم نہیں کرتے، اسلحے کے زور پر اپنا راج قائم کرنا چاہتے ہیں، دہشت گرد عناصر کو قانون کے کٹہرے میں لانا چاہتے ہیں۔

سپریم کورٹ آف پاکستان نے فوجی عدالتوں کی قیام اور 21ویں آئینی ترمیم کے خلاف دائر درخواستوں کی سماعت غیر معینہ مدت تک ملتوی کر دی ہے جبکہ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے مذکورہ درخواستوں کی سماعت کے لئے سپریم کورٹ کا بڑا بنچ تشکیل دیا جائے گا۔ اس ضمن میں چیف جسٹس آف پاکستان سے لارجر بنچ کے قیام کی استدعا کر دی گئی ہے۔ مذکورہ درخواستوں کی سماعت کرنے والے تین رکنی بنچ کے سربراہ جسٹس انور ظہیر جمالی نے دوران سماعت یہ ریمارکس دیئے ہیں کہ 18ویں ترمیم اور اب موجودہ 21ویں آئینی ترمیم کے خلاف دائر مقدمے میں ایک ہی طرح کے سوالات اٹھائے گئے ہیں جن کا آئینی و قانونی جواب درکار ہے۔ موجودہ تحریر تک سپریم کورٹ کے فل بنچ کی تشکیل نہیں ہو سکی اس لئے 18ویں اور 21ویں ترامیم اور آئین کے بنیادی ڈھانچے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔

اکیسویں ترمیم، مدت دو سال

آئین کا اکیسواں ترمیم بل پاس ہونے کے چار گھنٹے بعد ہی قانون بن گیا اور اس کا اطلاق بھی ہو گیا۔ یہ ترمیم دو سال کے بعد خود بخود تحلیل ہو جائے گی۔ آئین کا آرٹیکل 239(5) کہتا ہے کہ پارلیمنٹ کی طرف سے کی ہوئی کسی بھی آئینی ترمیم کو کورٹ میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ 1973ء کا آئین سپریم نہیں بلکہ سپریم پارلیمنٹ ہے۔ موجودہ آرمی ایکٹ اور اس قانون میں ترمیم میں بھی فوجی عدالتوں سے سزا پانے والوں کو اعلیٰ سول عدالتوں میں اپیل کرنے کا حق نہیں ہے لیکن چیف جسٹس کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے ایک بنچ نے فیصلہ دیا ہے کہ نا صرف عدالت عظمیٰ بلکہ تمام ہائیکورٹس فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کر سکتے ہیں۔ چیف جسٹس ناصر الملک کے مطابق فوجی عدالتوں کے فیصلے میں بدنیتی، حدود سے تجاوز، ضابطے کی خلاف ورزی اور رنگین مشقوں کے پہلو نظر آنے پر مداخلت کی جائے گی اور اپیلوں کی سماعت کی جائے گی۔

موجودہ سپریم کورٹ ہی نہیں بلکہ ایک لمبے عرصے سے عدالت عظمیٰ کا بھی یہ موقف رہا ہے اور جسٹس حمود الرحمٰن ملک کے پہلے چیف جسٹس تھے جنہوں نے اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات کے معاملے پر فیصلہ دیا تھا، جس کے مطابق اعلیٰ عدالتوں کو فوجی عدالتوں اور فوجی اپیلٹ ٹریبونلز کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کا اختیار دیا گیا تھا۔ ہائیکورٹس اور سپریم کورٹ کا ہمیشہ ہی موقف رہا ہے کہ اگر فوجی عدالتوں میں مقدمے کی کارروائی اور فیصلہ دینے کے دوران قانون کی پیروی نہیں کی گئی ہو تو اعلیٰ عدالتوں کو اس کے خلاف اپیل سننے کا اختیار ہے۔ اگر اعلیٰ عدلیہ کے موجودہ فیصلے کو مدنظر رکھا جائے تو چاہے آئین و قانون میں کوئی بھی تبدیلی کی جائے فوجی عدالتوں کے فیصلے اعلیٰ سول عدالتوں میں چیلنج کیے جائیں گے۔ آئینی و قانون ماہر کرنل (ر) انعام الرحیم کا کہنا ہے کہ 1973ء میں تین صحافی مجیب الرحمٰن شامی، الطاف حسن اور اعجاز حسن کو مہینے کی 10 تاریخ کو گرفتار کیا گیا تھا اور فوجی عدالت نے ان کے مقدمے کی سماعت 15 تاریخ کو مقرر کی تھا، جبکہ لاہور ہائیکورٹ نے بھی ان کی گرفتاری کے خلاف اپیل سننے کی وہی تاریخ مقرر کر دی تھی، فوجی عدالت نے ان کے مقدمے کی سماعت 15 کے بجائے 13 تاریخ کو مقرر کر دی اور ان سب کو 5 سال قید کی سزا سنائی۔ بعدازاں سپریم کورٹ نے ان صحافیوں کی اپیل سماعت کے لئے منظور کر لی اور اس وقت چیف جسٹس حمود الرحمٰن نے فوجی عدالت کے غیر قانونی اور غیر آئینی احکامات کو منسوخ کر دیا۔ فوجی عدالت کے جج کو بھی عدالت میں طلب کیا گیا اس کا موقف تھا کہ اس نے اس مہینے کی 13 تاریخ کو احکامات جاری کئے تھے کیونکہ ملزمان فوجی عدالتوں کی قانونی حیثیت تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ بعد میں ایف بی علی کیس (PLD 1975 SC506) میں سپریم کورٹ نے واضح طور پر فیصلہ دیا تھا کہ جب بھی مقدمات کی کارروائی میں تین پہلو سامنے آئیں گے اعلیٰ عدلیہ مداخلت کرے گی اور فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرے گی، وہ تین پہلو (1) بدنیتی پر مبنی فیصلہ دیا جانا (2) اختیار سے

تجاوز، (3) خلاف ضابطہ ہونا ہیں۔ سیف الدین کیس (PLD 1977 LHR 1174) میں فوجی عدالتوں کے مشہور شاعر احمد فراز کے خلاف فیصلے کو جسٹس افضل ظلہ نے منسوخ کیا تھا۔ انعام الرحیم کے مطابق ملازمت سے متعلق معاملات کے کیس میں عبدالباسط (وفاق بخلاف عبدالباسط PLD 2012 جسٹس ناصر الملک نے ایف بی علی کیس کے تین نقطوں کی وضاحت کے ساتھ 'رنگین مشق' کے لفظ کا بھی اضافہ کر دیا۔ جسٹس ناصر الملک کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے بنچ نے فیصلہ دیا کہ جب بھی اعلیٰ عدلیہ کو فوجی عدالتوں کی جانب سے مقدمات کی کارروائی میں بدنیتی، حدود سے تجاوز، ضابطوں کی خلاف ورزی یا مقدمے کی کارروائی کے دوران کو رنگین مشق نظر آئے گی تو اس کی جانب سے مداخلت کی جائے گی، عدالت اپیلوں کی سماعت کر کے انصاف فراہم کرے گی۔ انعام الرحیم کا کہنا تھا کہ جسٹس ناصر ملک نے اپنے فیصلے میں کہا کہ فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرنا ہائیکورٹس کی ذمہ داری ہے۔ 2013ء میں رانا نوید بخلاف وفاق کیس کے مطابق فوجی اپیلٹ ٹریبونل نے لیفٹیننٹ جنرل (ر) جاوید عالم پر سمجھوتا کیا اور جنرل پرویز مشرف کے حکم پر تین بریگیڈیئرز کی عمر قید کی سزا پھانسی میں بدل دی، جبکہ فوجی عدالت نے عامر سہیل کو 10 سال کی سزا دی تھی۔ عدالت عظمیٰ نے مقدمے کے خلاف اپیل کی سماعت کرتے ہوئے فوجی عدالت کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے مطابق ان افراد کے معاملے میں فوجی عدالت کو بدنیتی واضح طور پر نظر آتی ہے اور دوسرے مقدمات میں سزا پانے والون کی صورت حال بھی ایسی ہے تو ان کے مقدمات پر بھی نظر ثانی کی جانی چاہئے، تاہم ایسا نہ ہوسکا۔ 2014ء میں وفاق بخلاف میجر طاہر کیس میں سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کی جانب سے فوجی عدالت کے فیصلے کو منسوخ کرنے کے حوالے سے حکومت کی اپیل خارج کر دی تھی۔ سپریم کورٹ کے جج جسٹس اعجاز افضل نے موقف اختیار کیا تھا کہ اس مقدمے میں قانون کے تقاضے پورے نہیں کئے گئے لہٰذا فوجی

حکام کی جانب سے دی جانے والی سزا غیر قانونی، غیر آئینی اور غیر منصفانہ ہے۔ میجر طاہر جنرل مشرف کے ہاتھوں ریٹائر ہوئے تھے اور جب انہوں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی تو انہیں برطرف کر دیا گیا تاہم عدالت عظمیٰ نے ان کی برطرفی کا فیصلہ منسوخ کر دیا تھا۔ 1956ء کے آئین کے آرٹیکل 170 کے مطابق ہر شہری کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ فوج سمیت کسی بھی حکومتی ادارے کے خلاف عدالت سے رجوع کر سکتا تھا۔ انعام الرحیم کے مطابق 1962ء کے آئین میں آمر ایوب خان نے آرٹیکل 93(3)(A) کا اضافہ کیا جس کے تحت سول عدالت کو بھی فوجی افسر کو اس کے ملازمت سے متعلق معاملات پر طلب کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ 1962ء کے آئین میں ایوب خان نے ایک اور اضافہ کیا جس کے تحت ملٹری ٹریبونلز کے فیصلوں کو بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میاں نواز شریف نے اپنے پچھلے دور حکومت میں بھی فوجی عدالتیں قائم کی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کراچی کا مسئلہ اسی طرح حل ہو سکتا ہے۔ تاہم اس وقت اس اقدام کی کافی مذمت کی گئی تھی اور سپریم کورٹ نے اس اقدام کو خلاف قانون قرار دے دیا تھا۔ عدالت عظمیٰ نے جو فیصلہ دیا اس میں فوجی عدالتوں کو غیر آئینی اور بغیر کسی منطق کے قائم کی جانے والی قرار دیا تھا۔ فیصلے میں کہا گیا تھا کہ ملک میں متوازی عدالتی نظام کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی آئین ایسی چیز کی اجازت دیتا ہے۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بعد اس وقت کی قومی اسمبلی نے دہشت گردی کے مقدمات کی عدالتوں کا قانون منظور کیا تھا۔ عدالت عظمیٰ کا یہ فیصلہ پی ایل ڈی 1999ء سپریم کورٹ 504 کہلاتا ہے۔ یہ فیصلہ دینے والوں میں اس وقت کے چیف جسٹس اجمل میاں، سعید الزماں صدیقی، ارشاد حسن خان، راجہ افراسیاب خان، محمد شبیر جہانگیری، ناصر اسلم زاہد، منور احمد مرزا، مامون قاضی اور عبدالرحمٰن خان شامل تھے۔ اسی بنیاد پر آج بعض سیاسی رہنماؤں اور قانون دانوں کا کہنا ہے کہ حال ہی میں فوجی عدالتوں کے قیام کے بارے میں کی جانے والی قانون سازی کو

عدالت عظمیٰ آئین سے متصادم اور غیر قانونی قرار دے سکتی ہے۔

سینئر وکلا کا موقف

سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے سابق صدر یٰسین آزاد ایڈووکیٹ کے موقف کا حوالہ دینا بھی ضروری ہے۔ اکیسویں ترمیم کی پارلیمنٹ سے منظوری کے بعد روزنامہ جنگ کے زیرِ اہتمام ہونے والے ایک مذاکرے میں جناب یٰسین آزاد کا کہنا تھا کہ اکیسویں ترمیم، آئین کے آرٹیکل 175 کے تحت کی گئی ہے۔ یہ آرٹیکل عدالت کے قیام سے متعلق ہے لیکن اس میں کہیں بھی ملٹری کورٹس کے قیام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ 1988ء کی بات ہے کہ جب پہلی مرتبہ، ملٹری کورٹس کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا اور 1999ء میں سپریم کورٹ نے فوجی عدالتوں کو کالعدم قرار دے دیا تھا۔ اس وقت یہ پٹیشن لیاقت حسین صاحب نے داخل کی تھی جس کے جواب میں نہ صرف فوجی عدالتیں کالعدم قرار پائی تھیں بلکہ سپریم کورٹ نے پہلے سے موجود انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کی حوالے سے ایک لائن آف ایکشن بھی جاری کیا تھا۔ یہ ترمیم اسمبلی نے پاس کی ہے اور اس کی مدت دو برس مقرر کی گئی ہے۔ میں بہت افسوس سے عوام کو یہ بات بتانا چاہوں گا کہ آرٹیکل 175 میں ترمیم کر کے بنیادی ڈھانچے کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چار سے پچیس تک آئین کے بنیادی حقوق کے آرٹیکلز کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اسی میں آرٹیکل (A) 2 آزاد عدلیہ کی ضمانت دیتا ہے جب کہ آرٹیکل (A) 10 شفاف ٹرائل کا حق دیتا ہے۔ مگر اکیسویں ترمیم تمام بنیادی حقوق کو دباتے ہوئے، آئین کے بنیادی ڈھانچے کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ جوں ہی اس ترمیم کی بازگشت سنائی دی پاکستان بار کونسل اور سپریم کورٹ کا اجلاس بلایا گیا۔ اس اجلاس میں تمام صوبوں کے چیف جسٹس صاحبان شریک ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ روزانہ کی بنیاد پر کیسوں کو چلایا جائے گا۔ اس کے علاوہ سپریم کورٹ کے دو ججوں

کے ماتحت اور ہر صوبے میں مانیٹرنگ سیل قائم کیئے جائیں گے اور وہ کیسز جو عرصہ دراز سے فائلوں میں پڑے ہیں انہیں بھی کھولا جائے گا۔ بار بار یہی کہا گیا کہ ہم اپنا کام کر رہے ہیں اور مزید کام کرنے کو تیار ہیں لہٰذا ہمارے کام میں مداخلت نہ کی جائے۔ اس کے باوجود متوازی کورٹس بنا دی گئیں ہیں۔ بے شک آرمی پبلک اسکول کا سانحہ پشاور، ایک عظیم سانحہ ہے اور فوجی عدالتیں اسی بات کو توجیہہ بنا کر قائم کی جا رہی ہیں کہ ہم حالت جنگ میں ہیں۔ میں یہ عرض کروں گا کہ ہم پچھلے بیس برس سے حالت جنگ میں ہی ہیں مگر کسی بھی دور میں فوجی عدالتیں نہیں بنائی گئیں چاہے وہ ڈکٹیٹر مشرف کا دور حکومت ہو یا پیپلز پارٹی کی حکومت، کبھی بھی فوجی عدالتیں بنانے کی نوبت نہیں آئی۔ بڑے سے بڑا سانحہ ہو گیا مگر فوجی عدالت کی کسی نے بات نہیں کی۔ آل پارٹیز کانفرنس کے بیس نکات سامنے آئے ہیں۔ ہم نے ان میں سے انیس نکات کی پورے دل سے حمایت کی ہے۔ مگر ہم فوجی عدالتوں کی حمایت کسی صورت نہیں کر سکتے۔ ہم کھل کر یہ کہتے ہیں ملٹری کورٹس آئین سے منحرف ہیں۔ اب کہا جا رہا ہے کہ پارلیمنٹ نے اسے منظور کیا ہے مگر بنیادی حقوق کو متاثر کیا ہے۔ اس کی مثال میں آپ کو دیتا ہوں کہ فوجی عدالتوں کے فیصلے کے خلاف اپیل کا حق نہیں دیا گیا۔ اگر فوجی عدالت سے سزا پانے والا کوئی شخص، سپریم کورٹ میں آ کر یہ کہے گا کہ آرٹیکل 10 (A) کے تحت فری ٹرائل کا موقع نہیں دیا گیا۔ عدلیہ پر الزام لگا دیا گیا کہ عدالت فیصلے نہیں دیتی۔ میں یہ بتا دوں کہ عدلیہ نے سات سے آٹھ ہزار کیسز کے فیصلے دیئے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کیا گیا اور یہ حکومت کی نااہلی ہے۔ تمام سیاسی جماعتوں نے مل کر فیصلہ دیا ہے مگر یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ ان کا یہ فیصلہ کیا رنگ لائے گا۔ میں یہ کہتا ہوں کسی بھی سیاسی جماعت نے اکیسویں ترمیم کی مخالفت نہیں کی۔ مولانا فضل الرحمٰن نے پہلی اے پی سی میں دعا کرائی اور اس کے بعد یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ ترمیم میں مذہب کا ذکر کر کے ہماری بات نہیں مانی گئی۔ وہ بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے فوجی عدالتوں کی مخالفت کی ہے بلکہ

انہوں نے تو اپنی بات نہ مانے جانے پر مخالفت کی ہے۔ میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ سپریم کورٹ، فوجی عدالتوں کو غیر قانونی قرار دے سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں صرف وہی ہوتا ہے۔ جو طاقتور فورس چاہتی ہے۔ کوئی سیاسی جماعت ان کا دباؤ برداشت نہیں کر پاتی اور متوازی عدالتیں بنادی جاتی ہیں۔ یہ آئین کی خلاف ورزی ہے، یہ عدلیہ کی آزادی کے خلاف ایک قدم ہے۔ اس مرتبہ جو بھی بحران پیدا ہوگا وہ تمام سیاسی جماعتوں کے اس باہمی فیصلے کا کیا دھرا ہوگا۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ 1999ء کے فوجی عدالتوں کے خلاف سپریم کورٹ کے فیصلے کو پڑھ لینا چاہیے۔ آرٹیکل 245 کے تحت ملک میں قانون کی پاسداری، گواہان اور جج صاحبان کے تحفظ کی خاطر وفاق، فوج سے مدد طلب کرسکتا ہے مگر فوجی عدالتوں کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ ملک میں انسداد دہشت گردی کی عدالتیں موجود ہیں۔ ہمارے کتنے وہی وکلا مار دیئے گئے ہیں لہٰذا ان کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ دو برس کی مدت میں دہشت گردی پر قابو پالیا جائے گا۔ اگر قابو نہیں پایا گیا تو وہ اس مدت میں اضافے کا مطالبہ کریں گے اور پھر دباؤ میں آ کر مدت میں اضافہ کردیا جائے گا۔ پھر یہ نکتہ بھی پریشان کن ہے کہ فوجی عدالتیں، سزا کا طریقہ کار تو اختیار کریں گی مگر ان کے دیئے گئے فیصلوں کی کوئی فائنڈنگز نہیں ہوں گی۔ جو فیصلہ دے دیا، وہی دے دیا، وجوہات کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی وکیل کو مریض کا آپریشن کرنے کو کہہ دیا جائی، بہتر یہی کہ جس کا کام ہے وہی وہ کام کرے۔ ہمارے کئی وکلا مختلف سیاسی جماعتوں سے منسلک ہیں۔ انہوں نے بھی اکیسویں ترمیم کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ غلط ہے مگر پولیٹیکل پارٹی ایکٹ کے تحت ہم اس بات تک محدود ہیں کہ جو پارٹی کہے، وہی کریں۔ اسی طرح سے میں تو رضا ربانی کے اسمبلی میں آبدیدہ ہونے سے بالکل بھی متاثر نہیں ہوا۔ میرے خیال میں رضا ربانی اس وقت ہیرو بنتے کہ جب آئین کی خاطر، پارٹی سے مستعفی ہوجاتے لیکن غیر آئینی اقدام کی حمایت میں

ووٹ نہ دیتے۔انیس سوتہتر کا آئین تو افواج پاکستان کی سربراہ تک کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ووٹ ڈال سکتا ہے تو اس آئین سے انحراف جائز نہیں ہے۔ جہاں تک یہ سوال ہے کہ اکیسویں ترمیم کے حوالے سے اسمبلی اور سینیٹ میں بحث نہیں کرائی گئی تو حقیقت یہ ہے کہ اے پی سی میں مسودے کی تیاری کے ساتھ ہی تمام جماعتوں کو یہ باور کرادیا گیا تھا کہ دونوں ہاؤس میں کوئی بحث نہیں کی جائے گی اور اسے منظور کرایا جائے گا۔ہم پاکستان بار کونس کے بائیس ممبران جو کوئی قانون بناتے ہیں تو اس میں آئین کی ہر شق کا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ تو ملک کا معاملہ تھا جس آئین میں غیر آئینی ترمیم کی گئی ہے اس سے دہشت گردی پر قابو پانے کے بھی کوئی خاص امکانات نہیں ہیں۔ انہوں نے اس ترمیم سے صرف اور صرف عدالت کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور یہ بات سب لوگ بھول گئے کہ اسی عدالت نے بلوچستان بدامنی کیس چلایا، کراچی بدامنی کیس چلایا اور لاپتہ افراد کا کیس بھی بہت اچھے سے چلایا۔ جن کو لاپتہ افراد کیس میں جواب دہ کیا گیا، انہوں نے سول عدالتوں کو اپنی رکاوٹ سمجھ لیا اور اکیسویں ترمیم کرالی۔ آئین کے آرٹیکل 199 کے تحت کسی بھی فوجی کے خلاف کوئی کیس سول عدالتوں میں چلانے کی اجازت نہیں ہے تو فوجی عدالتوں کو بھی عام شہریوں کے حوالے سے یہ اجازت نہیں دی جاسکتی۔ آخر میں، میں یہی کہوں گا کہ سیاسی جماعتوں نے آئینی حدود پھلانگ کر خود اپنے لئے مسائل کھڑے کئے ہیں کوئی اس کی جتنی بھی توجیہات پیش کردے، وکلا برادری کبھی بھی اس غیر آئینی اقدام کی حمایت نہیں کرے گی اور اس کے خلاف ہم عدالت عالیہ میں پٹیشن بھی دائر کرچکے ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ)

جناب ایس ایم ظفر پاکستان کے سابق وزیر قانون ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف اور آئین و قانون کے ماہر ہونے کی وجہ سے ان کی رائے اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ انہوں نے 21ویں ترمیم اور فوجی عدالتوں کے قیام کے حوالے سے اپنے خیالات کا

اظہار روزنامہ ایکسپریس کے فورم پر کیا۔ ان کی خیالات ملاحظہ فرمائیے......! ایس ایم ظفر فرماتے ہیں......

16 دسمبر کو واقعہ ڈیفائنگ مومنٹ بن گیا، اس میں تشدد کی انتہا ہوگئی بچوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا اور دہشت گردوں نے یہ کوشش کی کہ کوئی زندہ بچ کے نہ جائے۔ جب یہ صورت حال دیکھی تو سب نے کہا کہ دہشت گردی کی انتہا ہوگئی ہے اور جب معاملات ایسے ہوجائیں تو پھر اقدامات کرنا پڑتے ہیں۔ پارلیمنٹ نے اپنی ایک ذمہ داری اگرچہ بہت دیر سے پوری کی لیکن اس سانحہ کے بعد اس نے بالآخر یہ نتیجہ نکال ہی لیا ہے کہ ہم حالت جنگ میں ہیں۔ گویا سوچ میں ایک بہت بڑی تبدیلی آ گئی اور اسی کے نتیجے میں پارلیمان نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ہمیں اس سلسلے میں خود ایسے اقدامات کرنا پڑیں گے جس سے دہشت گردی کا خاتمہ ہو۔ ضرب عضب سے نتائج کا پتہ چل رہا تھا کہ آئندہ کیا صورت حال ہوگی، چنانچہ یہاں پارلیمنٹ پر یہ فرض آتا تھا اور انہوں نے اسے نبھاتے ہوئے اکیسویں ترمیم کا قانون بنا دیا جس سے فوجی عدالتوں کے ذریعے سے "اسپیڈی ٹرائل" ہوسکے گا۔ اب ہمیں بھی بطور قوم اپنی سوچ کو تبدیل کرنا ہوگا اور اپنے آپ کو ایک آئینی دور سے نکال کر جنگ کے دور میں لانا ہوگا اور دہشت گردی کو اپنا مخالف سمجھ کر اس کے خلاف جنگ کرنا ہوگی۔ میرے نزدیک اب جب یہ فیصلے ہوگئے اور حکومت نے نیشنل سیکورٹی پالیسی بنالی تو اب اسے چاہیے کہ پورے عزم کے ساتھ اپنے کام پر گامزن ہوجائے۔ کیونکہ جنگ ہمیشہ ایک ایسے عزم اور ارادے سے جیتی جاتی ہے جس مین کوئی خم نہ آئے اور جس کے بارے میں یقین محکم ہو کہ ہم نے جو کیا ہے وہ درست ہے۔ ہمارے کچھ پارلیمنٹ نے پارلینٹ کے اندر اور باہر یہ اظہار کیا کہ ہم نے اپنے ضمیر کے خلاف ووٹ ڈالا، ہم نے مجبوراً ووٹ ڈالا ہے اور کڑوی گولی لی ہے۔ میرے نزدیک جب تک انہوں نے ووٹ نہیں ڈالا تھا تب تک تو وہ ایسا کہہ لیتے لیکن جب انہوں نی ووٹ ڈال دیا تو اس پلڑے میں خود کو

پالیا تو اب اس میں اگر مگر اور کیڑے نکالنے کا وقت نہیں رہ گیا۔ اب وہ پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ چلیں اور ایسے مشورے دیں جس سے یہ معاملہ آگے بڑھ سکے۔ اس وقت یہ دو سوچوں کا ٹکراؤ ہوا، ایک سوچ یہ کہ ہماری قوم کو اس چیز کی ضرورت ہے۔ دوسری سوچ یہ کہ آئین کو اُس کی ضرورت ہے، بہت سے لوگوں نے قوم کی بقاء، ملکی سالمیت اور ضرورت کی سوچ کو زیادہ اہم سمجھا۔ لہٰذا میری یہ رائے ہے کہ اسے ضمیر کا بوجھ نہ سمجھا جائے۔ ملک وقوم کو اس کی ضرورت ہے لہٰذا آپ اسے اپنی سوچ کا حصہ بنالیں۔ اگر دیکھا جائے تو ان ہی کی رائے درست تھی جو کہتے تھے کہ آئین مضبوط ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس رائے کو سامنے رکھتے ہوئے درمیانی اور صحیح راستہ اختیار کیا گیا کیونکہ ہمیشہ درمیانی راستہ ہی بہتر ہوتا ہے اور اس معاملے میں یہ درمیانی راستہ نکالا گیا کہ یہ ترمیم صرف دو سال کے لئے کی گئی۔ یہ آئینی ترمیم اور قانون مستقل نہیں بنایا گیا، میرے نزدیک یہ دانشمندی کی نشانی ہے اور ایک صحیح قدم ہے۔ لہٰذا ایک صحیح قدم اٹھانے کے بعد اس پر قائم رہنا زیادہ ضروری ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اب ارادہ باندھ لیں کیونکہ جنگ میں جانے کے بُعد شکست کا کوئی پہلو نہیں ہوتا، شکست ہمارے ملک میں اب سخت نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور اب تو سوائے کامیابی حاصل کرنے کے کوئی دوسرا راستہ نہیں رہ گیا۔ میرے نزدیک اس سب میں فوج کو یقیناً سہولت ملے گی کہ وہ ان دو سالوں میں دہشت گردی کو قابو کر سکے اور یہ دورانیہ دہشت گردی میں رکاوٹ کا باعث بنے گا۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ترامیم یا فوجی عدالتوں کا قیام آخری فیصلہ نہیں ہے، اس میں سول حکومت کو پوری طرح شامل ہونا ہوگا۔ یہ جنگ عسکری قوت اور سول حکومت نے مل کر جیتنی ہے اور اگر جیت گئے تو اس کا سہرا دونوں کے سر ہوگا۔ حکومت کو اس دوران میں اپنے آپ کو تیار کرنے کا موقع ملا ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ اس عرصے میں نظام عدل کو درست کرے، ججوں اور گواہوں کو سیکورٹی دے اس کے لئے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرے۔ اس کے علاوہ فرانزک معاملات کو بھی بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے

نزدیک یہ دو سال معاملات کو درست کرنے کے لئے ملے ہیں۔ حکومت کو اس معاملے کو ''سلور بلٹ'' نہیں سمجھنا چاہئے اور اسے اپنی ترجیحات تبدیل کرنا ہوں گی۔ حکومت کو تعلیم، صحت اور بیروزگاری کو دور کرنے کی جانب توجہ دینی چاہئے اور الیکشن سے پہلے قوم سے جو وعدے کئے تھے ان دو سالوں میں انہیں پورا کرنے کی کوشش کرے۔ اس وقت ہمارا نوجوان تبدیلی کے لئے تیار ہے، حکومت کو چاہئے کہ ان کے لئے اقدامات کرے اور انہیں تعلیم اور روزگار کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ سب سے اہم یہ ہے کہ حکومت کو گڈ گورننس کی طرف توجہ دینی چاہئے اور اسے چاہے کہ جلد فیصلے کرنے کی عادت ڈالے۔ اس کے علاوہ حکومت پوری قوم کو دہشت گردی کے بارے میں آگاہ کرے اور اسے یہ بتایا جائے کہ اس سے کیسے نمٹا جاسکتا ہے کیونکہ اب قوم کو اس میں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ دہشت گرد تو مرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں انہیں ان سزاؤں سے فرق نہیں پڑتا لیکن اس میں کمی ضرور آئے گی اور اس وقت فوجی عدالتوں کی ضرورت بھی ہے۔ امریکہ میں جب سول وار شروع ہوگئی تو ابراہیم لنکن نے آئین کے کچھ حصوں کو ایگزیکٹو آرڈر سے معطل کر دیا اور اس میں کانگریس کو بھی شامل نہیں کیا۔ جب لوگوں نے شور مچایا تو انہوں نے کہا کہ میرے لئے میرا ملک اہمیت رکھتا ہے، حالت جنگ میں میرے پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور مجھے اپنے قوانین بنانے ہیں۔ 9/11 کے بعد امریکہ نے گوانتاناموبے جیسے متعدد ٹارچر بیس بنائے اور وہاں جن دہشت گردوں کو رکھا گیا انہیں ان کے رشتہ داروں، وکلاء سے ملنے کی بھی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی انہیں عدالت تک رسائی حاصل تھی۔ سب سے پہلے ان کے صدر نے کہا کہ ہم حالت جنگ میں آگئے ہیں اور ہمیں دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنی ہے اور پھر ان کی قوم نے بہت سارے ضرورت کے معاملات کو تسلیم کیا۔ برطانیہ نے بھی ایسا ہی کام کیا، پھر بھارت نے بھی کچھ اسی قسم کے قوانین بنائے اور پوری قوم ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ لہٰذا اب ہماری پوری قوم کو اپنا ذہن تبدیل کرنا ہوگا۔ ایسے حالات میں آئین کی

بالادستی یا ملکی سلامتی میں سے ایک سوچ کو چننا ہوتا ہے اور ان پر سمجھوتا بھی کرنا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک موجودہ صورت حال میں پارلیمنٹ اور حکومت نے درست قدم اٹھایا ہے اور جو تبدیلی آئین میں کی گئی ہے وہ عارضی ہے لہٰذا اس عارضی تبدیلی کا پورا فائدہ اٹھائیں اس میں کیڑے نہ نکالیں اور اس صبح کا انتظار کریں جب دو سال بعد ہم یہ اطمینان سے کہہ سکیں گے کہ اب ہم بہتر حالات اور بہتر پاکستان میں آ گئے ہیں۔ (بشکریہ۔ روزنامہ ایکسپریس)

انسداد دہشت گردی ایکٹ

ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ 16 سال قبل سپریم کورٹ کی جانب سے دی گئی تجاویز پر عمل نہ کرنا فوجی عدالتوں کے قیام کا جواز بنا، سپریم کورٹ کی 9 تجاویز پر عمل کر کے انسداد دہشت گردی عدالتوں کی کارکردگی بڑھائی جا سکتی تھی، دہشت گردوں کو سزا دینے کے لئے اگرچہ ملک تیزی سے فوجی عدالتوں کی قیام کی جانب چلا گیا مگر آج تک انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کی استعدادِ کار بڑھانے کے لئے سپریم کورٹ کی جانب سے 16 سال قبل دی گئی 9 ہدایات میں سے ایک پر بھی عمل نہیں کیا گیا۔ 1999ء میں میاں نواز شریف کے دور میں قائم ہونے والی فوجی عدالتوں کو منسوخ کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں کہا تھا کہ فوجی عدالتیں انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کی نا اہلی اور کام کی زیادتی کے باعث فوجی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، لہٰذا انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کی استعدادِ کار بڑھانے کے لئے انقلابی اقدامات کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے 9 سفارشات پیش کی تھیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ 1999ء کے بعد سے اب تک سب سے لمبے عرصے تک پرویز مشرف نے حکمرانی کی ہے جبکہ پیپلز پارٹی نے 5 اور نواز شریف جو جاری ہے نے ڈیڑھ سال حکمرانی کی ہے لیکن کسی بھی حکومت نے انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے اور دہشت گردی کے خاتمے کے لئے مطلوبہ اہداف حاصل

کرنے کے لئے سپریم کورٹ کی ہدایات پر عملدرآمد کی کوشش نہ کی جس کے باعث فوجی عدالتوں کی گنجائش پیدا ہوئی، مطلوبہ اہداف کے حصول کے لئے سپریم کورٹ نے آئین کے آرٹیکل (3)184 کے تحت مندرجہ ذیل ہدایات دیں۔

(i) دہشت گردی سے متعلق مقدمات ان خصوصی عدالتوں کے حوالے کئے جائیں جو پہلے سے قائم ہیں یا انسداد دہشت گردی کے ایکٹ (آگے اس ایکٹ کا حوالہ ATC کے طور پر دیا جائے گا) یا محرم علی اور دیگر بخلاف وفاق پاکستان کیس PLD 1998 SC) (1445 میں اس عدالت کے فیصلے کی رو سے کسی قانون کے تحت قائم کی جائیں گی:

(ii) خصوصی عدالت کو ایک وقت میں ایک ہی مقدمہ دیا جائے اور اس مقدمے کے فیصلے کے اعلان تک اسے کوئی دوسرا مقدمہ سماعت کے لئے نہ دیا جائے۔

(iii) متعلقہ خصوصی عدالت روزانہ کی بنیاد پر اس مقدمے کی سماعت کرے اور سات دن کے اندر جیسا کہ ATA میں پہلے ہی طے کیا جا چکا ہے، یا پھر کسی دوسرے قانون میں دی گئی گنجائش کے مطابق فیصلہ کرے۔

(iv) خصوصی عدالت کے سامنے چالان پوری تیاری کے ساتھ اور اس امر کو یقینی بنانے کے بعد پیش کیا جائے کہ متعلقہ خصوصی عدالت کو جب اور جیسے بھی ضرورت ہوگی تمام گواہوں کو پیش کیا جائے گا۔

(v) خصوصی عدالت کے حکم/ فیصلے کے خلاف اپیلٹ فورم میں اپیل کا فیصلہ، اپیل دائر کئے جانے کے دن سے، سات یوم کے اندر کیا جائے گا۔

(vi) تفتیش کرنے والی یا مقدمے کی پیروی کرنے والی ایجنسیوں کی طرف سے اگر تاخیر کی جائے گی تو قابل اطلاق قانون کے مطابق ان کے خلاف فوری تادیبی کارروائی کی جائے گی۔

(vii) متعلقہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سماعت پر نظر رکھنے اور اس بات کو یقینی

بنانے کے لئے کہ مقدمات/ اپیلوں کو انہی رہنما اصولوں کے مطابق نمٹایا جارہا ہے ہائی کورٹ کی ایک یا ایک سے زیادہ جج مقرر کریں گے۔

(viii) چیف جسٹس آف پاکستان، مذکورہ بالا رہنما اصولوں پر عمل درآمد کا جائزہ لینے کے لئے سپریم کورٹ کا ایک یا اس سے زیادہ جج مقرر کرسکتے ہیں۔ یہ ایک یا ایک سے زیادہ جج صاحبان اس امر کو بھی یقینی بنائیں گے کہ اگر مہلت یا مہلت کی اپیل کے ساتھ کوئی پٹیشن دائر کی جاتی ہے تو سپریم کورٹ میں کسی تاخیر کے بغیر اس کو نمٹایا جائے۔

(ix) ATA کے سیکشن 4 اور 5 کی رو سے مسلح افواج کی مدد طلب کرنے کے علاوہ، جرم اور سزا کی میعاد کے بارے میں عدالت کے فیصلہ کرنے کے عمل کو چھوڑ کر، سزا پر عمل درآمد تک پریذائیڈنگ افسر، ایڈووکیٹس اور مقدمے میں پیش ہونے والے گواہوں کے تحفظ سمیت ہر مرحلے پر آئین کے آرٹیکل 245 کے تحت مسلح افواج سے مدد کی درخواست کی جاسکتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس وقت انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کے پاس عملے کی کمی اور کام کا بوجھ ہے۔ سینئر وکلاء کا کہنا ہے کہ ''کراچی میں انسداد دہشت گردی کی 10 عدالتیں ہیں جن کے پاس 1850 مقدمات ہیں۔ اتنے سارے مقدمات کو سات دن میں نمٹانا انسان کے بس سے باہر ہے۔'' انہوں نے وضاحت کی کہ مقدمات کی اتنی زیادہ تعداد کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسداد دہشت گردی کی عدالتوں پر ایسے سنگین جرائم کے مقدمات کا بھی بوجھ ہے، جو دہشت گردی کے زمرے میں نہیں آتے۔

اب فوجی عدالتوں کے بارے میں متنازع سفارشات کی طرف آتے ہیں۔ حکومت اور اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے دہشت گردی پر قابو پانے میں ناکامی کا سارا بوجھ عدلیہ پر ڈالا جارہا ہے۔ فوجی عدالتوں کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جارہی ہے کہ بیشتر کیسوں میں دہشت گرد بری ہوجاتے ہیں اور اگر انہیں سزا ہوجاتی ہے تو عدالتوں میں اپیل کا طویل طریقہ کار، سیکورٹی ایجنسیوں کی طرف سے پکڑے جانے والے دہشت گردوں کے حق میں

ہوتا ہے۔ عدلیہ اور غیر جانب دار قانونی ماہرین اس کا الزام ناقص استغاثہ اور مقدمات کو نامناسب طریقے سے پیش کرنے پر عائد کرتے ہیں۔ اعلیٰ عدلیہ کے ایک ریٹائرڈ جج کا کہنا ہے کہ ''ناکافی شواہد Forensic سہولتوں کا فقدان، ملزم کے حامیوں کے خوف کی وجہ سے گواہوں کو منحرف ہو جانا اور قانون سقوم، انسداد دہشت گردی عدالتوں کے لئے ملزم کو سزا دینا اور بھی مشکل بنا دیتا ہے۔'' سندھ ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس مقبول باقر نے ''فوجداری نظام عدل کی بہتری، دہشت گردی کا سدباب'' پر اپنے ایک مقالے میں یہ بتایا تھا کہ 11-2008ء میں انسداد دہشت گردی کی عدالتوں نے دہشت گردی کے 42 مقدمات میں 25 ملزموں کو بری کر دیا اور 17 کو سزا سنائی گئی۔ اگرچہ سپریم کورٹ نے 1999ء میں لیاقت حسین بخلاف وفاق پاکستان کیس میں فوجی عدالتیں قائم کرنے کی اجازت دینے سے انکار کرتے ہوئے واضح رہنما اصول دیئے تھے مگر ان پر کبھی عمل نہیں کیا گیا۔ پچھلے پندرہ سالوں کے دوران اگر مختلف حکومتوں اور اعلیٰ عدلیہ نے ان رہنما اصولوں پر عمل کیا ہوتا تو فوجی عدالتوں کے قیام کا یہ متنازع سوال ہرگز دوبارہ نہ اٹھتا۔ آج بھی ان رہنما اصولوں کا حوالہ دینا مناسب ہے تاکہ اس فیصلے کو صحیح پس منظر میں دیکھا جا سکے جس پر تمام سیاسی جماعتوں نے دہشت گردوں کی طرف سے پشاور کے دلخراش سانحہ کے بعد بھرپور ردعمل کے طور پر رضامندی ظاہر کی ہے۔

حکومت نے اجتماعی انداز میں طویل غور و خوض کے بعد، دہشت گردی سے نمٹنے کے لئے جو پالیسی تیار کی ہے اس کے صرف دو ہی نئے پہلو ہیں، باقی سب کچھ وہی ہے جس کا اعلان جولائی 2013ء میں کیا گیا تھا۔ جولائی میں جو حکمت عملی پیش کی گئی تھی وہ اس لئے غیر موثر ثابت ہوئی کہ اس پر عمل درآمد ہی نہ ہو سکا۔ حکومت خود کو عمران خان اور ان کے فرشتوں کے اس خطرے سے بچانے میں الجھی رہی جس نے تقریباً اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ دہشت گردی جو سب سے سنجیدہ مسئلہ تھا نظرانداز کر دیا گیا اور دہشت گردی کے

ہولناک واقعات کے بعد اس معاملے کو فوج نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ترجیح کے اعتبار سے اب حکومت نے اس پالیسی میں یہ دو اہم اضافے کئے ہیں: پہلی بار یہ کہا جا رہا ہے کہ ملک میں کسی بھی عسکری گروپ کو، خواہ وہ ریاست کے خلاف لڑ رہا ہے یا دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کے خلاف جہاد میں مصروف ہے، کام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اور دوسرا نیا پہلو دہشت گردوں کے خلاف مقدمات چلانے کے لئے فوجی عدالتیں قائم کرنے کی غرض سے آئین میں ترمیم کا اختلافی فیصلہ ہے۔ کوئی بھی مہذب ملک اپنی خارجہ پالیسی کو آگے بڑھانے کے لئے جہادی گروپوں کو قائم اور ان کی پرورش کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا اور جو ملک میں امن دیکھنا چاہتا ہو، اس کے لئے حکومت کے یہ بیانات کہ تمام عسکریت پسند گروپوں کا بوریا بستر لپیٹ دیا جائے گا، ایک ایسی کیفیت ہے کہ کہیں خوشی سے مر ہی نہ جائیں۔

افغانستان میں روپوش تحریک طالبان پاکستان (TTP) کی قیادت کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کرنے کے لئے جنرل راحیل شریف کا دورہ کابل اس امر کا اشارہ تھا کہ بالآخر پاکستان نے تسلیم کر لیا ہے کہ افغان طالبان کی بغاوت کی حمایت کرنے کی پالیسی پاکستان کے لئے منفی نتائج کی حامل اور خطرناک ہے۔ تاہم اس نئی پالیسی کی نیک نیتی کا اصل امتحان لشکر طیبہ، جیش محمد اور اس قسم کی لاتعداد دوسری ایسی جہادی تنظیموں کو جن کا رخ بھارت کی طرف ہے ختم کرنا ہوگا۔ حکومت نے یہ عزم بھی ظاہر کیا کہ وہ کالعدم تنظیموں کو نئے نام سے کام کرنے کی اجازت نہیں دے گی اور ان تنظیموں کے لیڈروں کو پڑوسی ملکوں کے خلاف مشکلات پیدا کرنے سے روکا جائے گا۔

ہنگامی حالات کے لئے ہنگامی قانون

اس صدی کی ابتدا میں جب نیویارک کی دو جڑواں اونچی عمارتوں کو بظاہر دہشت گردی کی واردات میں زمین بوس کر دیا گیا تو امریکی قوم حرکت میں آ گئی اور سب سے پہلا

فیصلہ یہ کیا گیا کہ کرائم کے خلاف قوانین اتنے سخت بنائے جائیں کہ دہشت گرد گروپ یا "Wolf"} Lone یعنی تنہا بھیڑیے کسی طریقے سے بھی بچ نہ پائیں۔ قانون ساز اداروں کے سارے منتخب افراد سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور چند ہفتوں میں کانگریس نے فوری طور پر صرف دس انگریزی کے حرف پر مشتمل ایک "Patriot Act" منظور کر ڈالا۔ کانگریس میں اس ایکٹ کے حق میں 357 اور مخالفت میں 66 ووٹ پڑے۔ اس کے بعد سینٹ میں اس ایکٹ کے حق میں 98 اور مخالفت میں صرف ایک ووٹ پڑا۔ 11 ستمبر 2001ء کو دہشت گردی کا حملہ ہوا اور 26 اکتوبر 2001ء کو امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے کانگریس کے ایکٹ پر دستخط کر کے اس کو ایک قانون کی شکل بھی دے دی۔ امریکہ میں سیاسی مخالفین اور اس قانون کے معترضین نے ان شقوں پر بہت شور مچایا جو سیکورٹی ایجنسیوں کو کسی کو بھی پکڑ کر غیر معینہ مدت کے لئے زیر حراست رکھنے کا اختیار دیتی ہیں۔ کسی بھی شخص کے گھر کی اس سے پوچھے بغیر تلاشی لی جاسکتی ہے۔ دہشت گردوں اور ان کے ساتھیوں کا تعاقب کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں رہی۔ کسی بھی امریکی شہری یا امریکہ میں رہنے والے دوسرے ممالک کے شہریوں کے ٹیلی فون ٹیپ کئے جاسکتے ہیں، ان کے اکاؤنٹ پر حکومتی ایجنسیاں نظر رکھ سکتی ہیں اور ان کے کسی بھی ریکارڈ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ بہت سارے پہلے سے موجود قوانین بدل دیئے گئے اس قانون میں یہ شق تو ضرور تھی کہ چار سال کے بعد 2005ء میں اس قانون کا کافی حصہ غیر موثر کر دیا جائے گا۔ اس کو Sunset شق کہتے ہیں لیکن حالات کی نزاکت کی بدولت امریکی صدر اوباما نے کانگریس کی منظوری سے اس سن سیٹ کلاز میں مزید توسیع بھی کر دی۔ جب انسانی حقوق کی علمبردار تنظیموں نے Act) (Patriot پیٹریاٹ ایکٹ کو کالا قانون کہا تو حکومت اور قانون دانوں نے جواب دیا کہ انسانی حقوق ہمیں بہت مقدم ہیں لیکن ریاست کی سلامتی افراد اور ان کے حقوق سے بھی بہت زیادہ اہم ہے اس لئے جنگی حالات میں انسانی حقوق معطل ہو جاتے ہیں۔ پاکستان

میں پچھلے بارہ برسوں کی فرقہ واریت، لسانیت، سیاسی غنڈہ گردی، اغوا برائے تاوان، جی ایچ کیو اور ہوائی اڈوں پر حملے، دہشت گردی کی انسانیت سوز وارداتوں اور قتل وغارت کے باوجود جب ایک بھی مجرم تختہ دار پر لٹکتا نظر نہیں آیا تو پوری قوم چیخ اٹھی اور سب نے زور دے کر کہا کہ خدا کے لئے سخت ترین قوانین بنائے جائیں، ججز کو تحفظ دیا جائے گواہوں کی جانوں کی حفاظت ہو اور مقدمات کی سماعت جلدی اور سزائیں مثالی ہوں جیسے سعودی عرب اور متحدہ عرب ریاستوں میں ہے۔ اب جب تحفظ پاکستان قانون سامنے آیا ہے تو وہی لوگ جو طالبان سے مذاکرات کے بجائے وزیرستان پر ہوائی اور زمینی فوجی حملے کرنے کا درس رہے تھے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس میں بہت سارے بے گناہ لوگوں کا خون ہوگا اور لاکھوں لوگ نقل مکانی پر مجبور ہوں گے اب کہہ رہے ہیں کہ دہشت گردوں کے خلاف عبرتناک ٹارگٹڈ آپریشن کرنے کے لئے موجودہ تحفظ پاکستان کا قانون انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ یہ کالا قانون ہے ہم اس کو رد کرتے ہیں، یہ عاقبت نااندیش لوگ ہیں یہ صرف ملکی مفادات داؤ پر لگا کر سیاست چمکانے والی بات ہے۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایک فرد کے دہشت گرد ہونے کا آپ کو جتنا بھی مضبوط شک کیوں نہ ہو آپ اس کو قانون کے حوالے کئے بغیر گولی کیسے مار سکتے ہیں یہ ایک معقول سوال ہے لیکن مثال کے طور پر ایک ادارہ جس میں ہزاروں بچے زیر تعلیم ہیں اس کے گیٹ پر اگر ایک مشکوک گاڑی آ کر رکتی ہے اور ڈرائیور گولی چلائے بغیر اندر گھسنے پر مصر ہے اور وہاں سے کچھ فاصلے پر عمارت کی چھت پر کھڑے سیکورٹی گارڈ کو یہ مضبوط شک ہے کہ ڈرائیور نے خودکش جیکٹ پہنی ہوئی ہے اور گاڑی میں کئی من بارود کی موجودگی کا قوی امکان ہے حالات بھی ایسے ہیں کہ پوری ریاست دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے اور آئے دن ایسی لرزہ خیز وارداتیں ہو رہی ہیں، ہم حالت جنگ میں ہیں ایسی صورت حال میں دور کھڑا سیکورٹی گارڈ انسانی حقوق کی پامالی کے اندیشے میں اگر مشتبہ شخص کو ہلاک نہیں کرتا تو ہزاروں طلبا کی جانیں خطرے میں پڑ

جائیں گی۔ تو کیا ایسی صورت حال میں گولی چلانے کی بجائے ہمیں انسانی حقوق کی پامالی کو ترجیح دینی ہوگی یا ان بچوں کی زندگی بچانے کی فکر ہوگی جن کو دہشت گردوں نے نشانے پر لیا ہوا ہے۔

تحفظ پاکستان آرڈیننس 2014ء

(جواب قومی ایکشن پلان کا حصہ ہے)

تحفظ پاکستان کا بل قومی اسمبلی نے پے در پے ہونے والے دہشت گردی کے واقعات اور ٹارگٹ کلنگ سے نمٹنے کے لئے پیش کیا تھا۔ اس قانون کو بنیادی انسانی حقوق کے سراسر منافی قرار دینے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اس بل کا مقصد پاکستان کو اس کے خلاف چھیڑی گئی جنگ یا بغاوت سے محفوظ رکھنا اور ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنانا ہے جو ملک کی سلامتی کے لئے خطرہ بن سکتی ہیں۔

چونکہ یہ ضروری ہو چکا ہے کہ پاکستان کی خلاف جنگ یا اس کے خلاف بغاوت سے ملک کو محفوظ کیا جائے اور ایسی کارروائیوں کی موثر روک تھام کی جائے جو پاکستان کی سلامتی کے لئے خطرہ ہوں اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے تمام جرائم کی تیزی کے ساتھ سماعت یقینی بنائے جائے جو متعلقہ شیڈول میں درج یا اس سے متعلق ہیں۔

اسی لئے درج ذیل قانون نافذ کیا جا رہا ہے۔

1- قانون کا مختصر نام، اس کا دائرہ کار اور اطلاق کا آغاز۔

2- اس قانون کے دائرہ کار میں پورا پاکستان شامل ہوگا۔

3- یہ قانون فوری طور پر نافذ العمل ہو جائے گا۔

یہ قانون اپنے نفاذ کی تاریخ سے 2 سال کے عرصے تک نافذ رہے گا۔

2- تعریفات

اس ایکٹ کے تحت مندرجہ ذیل الفاظ کی تعریف وہی ہوگی جو یہاں درج کی جارہی ہے، علاوہ اس کے کہ اس متن ہی میں کوئی بات اس مفہوم سے متصادم نہ ہو۔

(a) مسلح افواج

مسلح افواج کا مطلب ہے پاکستان کی بری، بحری اور فضائی افواج اور ان کی ریزرو فورسز۔

(b) ''سول آرمڈ فورسز'' سے مراد ہے پولیس، فرنٹیئر کانسٹیبلری، فرنٹیئر کور، پاکستان کوسٹ گارڈز، پاکستان رینجرز اور دیگر کوئی سول آرمڈ فورس جس کا حکومت اعلان کرے۔

(c) ضابطہ (کوڈ)

کوڈ کا مطلب ہے ضابطہ فوجداری مجریہ 1898، Code of Criminal Procedure Act 5 of 1898) 1898

(d) غیر ملکی دشمن۔ اس کا مطلب ہوگا عسکریت پسند۔

(a) ایک ایسا شخص جسے پاکستان کے کسی علاقے سے گرفتار کیا جائے تو وہ اس علاقے سے اپنی وابستگی کا کوئی دستاویزی یا ٹھوس ثبوت فراہم نہ کر سکے، اس شق کا اطلاق اس صورت میں بھی ہوگا جب گرفتار شدہ کو جس مقام سے حراست میں لیا گیا ہو، وہ اس کے علاوہ پاکستان کے کسی اور علاقے کو اپنی سکونت کا مقام قرار دے لیکن اپنے اس دعوے کی تائید میں بشمول دستایوزی ثبوت کوئی ٹھوس شہادت نہ پیش کر سکے۔

(b) ایک ایسا شخص جس نے پاکستان کی شہرت حاصل کی تھی لیکن پاکستان سٹیزن شپ ایکٹ مجریہ 1951 (1951 کے قانون کے حصہ II کے تحت) اسے پاکستان کی شہریت سے محروم کر دیا گیا ہو۔

(e) حکومت سے مراد ہے وفاقی حکومت

(f) عسکریت پسند سے مراد وہ شخص ہوگا جو پاکستان کی خلاف جنگ یا بغاوت کرے۔

جو پاکستان اس کے شہریوں مسلح افواج یا سول آرمڈ فورسز کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔

جو پاکستان کے خلاف جنگ یا اس کے خلاف پر تشدد کارروائیوں کی حمایت کرے، ہتھیار اٹھائے، دوسرے لوگوں کو اس حرکت پر اکسائے، ان کارروائیوں کی حمایت کرے یا کسی بھی انداز میں پاکستان کی خلاف ان سرگرمیوں کی حمایت کرے۔

پاکستان کی وحدت اس کی سلامتی اور اس کے دفاع کے خلاف کوئی کارروائی کرے، اس کی کوشش کرے یا اس کی دھمکی دے۔

شیڈول میں درج کسی بھی جرم کا ارتکاب کرے اس کا عہد کرے یا اس کی دھمکی دے، ان میں درج ذیل جرائم شامل ہوں گے۔

ہر وہ شخص جو پاکستان کی سرحدوں کے باہر کوئی اوپر درج کارروائیوں میں سے کوئی کارروائی کرے لیکن اس کی تیاری کے لئے پاکستان کی سرزمین کو استعمال کرے وہ بھی عسکریت پسند قرار دیا جائے گا اور اس شخص پر اس قانون کا اطلاق ہوگا بیرون ملک میں اس کی ایسی کارروائی پر اس قانون کا اطلاق ہوگا جو اس ملک کے قانون کے تحت جرم ہو جہاں اس کا ارتکاب کیا گیا ہے، ان کارروائیوں میں مدد اور ان میں سے تعاون کرنے والا شخص بھی مجرم ہوگا۔

(i) ہر وہ شخص جس کے خلاف اس بات کا کافی مواد موجود ہو کہ وہ پاکستان کی کسی غیر ملکی دشمن کے ساتھ (پاکستان کیخلاف) کسی سازش میں شریک ہے، اس دشمن کی ہدایت پر عمل پیرا ہے یا غیر ملکی دشمن کے منصوبوں کو آگے بڑھانے اور ان پر عملدر آمد میں معاونت کر رہا ہے۔

(g) پولیس

پولیس میں وہ عام پولیس فورسز شامل ہیں جو وفاقی حکومت یا صوبائی حکومتوں کے حکم پر تشکیل دی گئی ہوں۔

(h) شیڈول میں درج کسی جرم کے ارتکاب کی تیاری کرنا، اس کا مطلب ہے کہ ہر وہ

اقدام جو کسی جرم سے قبل کیا جائے، اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اگر کوئی شخص جرم سے قبل خود کو ایسی چیزوں سے لیس کرے جو جرم کا ارتکاب کرنے کے لئے ضروری ہوں تو وہ بھی اس قانون کے دائرہ کار میں آئے گا اور اس کے تمام اقدامات جرائم شمار ہوں گے، ان جرائم میں دھماکہ خیز مواد کو اپنے قبضے میں رکھنا، ان کا ذخیرہ کرنا، ان میں اپنی ضرورت کے مطابق تبدیلی کر کے دھماکہ خیز اشیاء بنانا، آتشیں اسلحہ، ان سے متعلق آلات، خود کش جیکٹس، اس کام کے استعمال کے لئے مختص کی گئی گاڑیاں اپنے پاس رکھنا اور ان اشیاء کی نقل وحمل کرنا بھی شامل ہے جو اوپر درج کئے گئے مقاصد کے لئے استعمال کرنا مقصود ہو۔

(آئی) پراسیکیوٹنگ ایجنسی

اس سے مراد وہ پراسیکیوٹنگ ایجنسی ہے جو اس ایکٹ کے دائرے میں آنے والے جرائم کے خلاف کارروائی کے لئے حکومت نے تشکیل دی ہو۔

(جے) پراسیکیوٹر جنرل

پراسیکیوٹر جنرل سے مراد وہ شخص ہے جسے حکومت نے اس ایکٹ کی دفعہ نمبر 12 کے تحت مقرر کیا ہو۔

(کے) شیڈول۔ شیڈول سے مراد اس ایکٹ سے منسلک شیڈول ہے۔

(ایل) شیڈول جرائم سے مراد وہ جرائم ہیں جو شیڈول میں دیئے گئے ہیں۔

(ایم) تحفظ پاکستان...... اس کے وہی معانی ہوں گے جیسا کہ آئین کے آرٹیکل 260 میں بیان کئے گئے ہیں۔

(این) خصوصی عدالت...... خصوصی عدالت سے مراد اس ایکٹ کی شق 8 کے تحت قائم کی گئی عدالت ہے اور

(او) خصوصی جوڈیشل مجسٹریٹ سے مراد خصوصی مجسٹریٹ ہے جس کو اس ایکٹ کی شق 8 کے تحت مقرر کیا گیا ہو۔

3-شیڈ ولڈ جرائم کو روکنے کے لئے مسلح افواج سول مسلح افواج کا استعمال۔

(1) پولیس۔ مسلح افواج یا سول مسلح افواج کا گریڈ 15 کا افسر جسے کسی علاقے میں تعینات کیا گیا ہو۔ شیڈ ولڈ جرائم کے ارتکاب کے معقول شواہد کی بنا پر مناسب وارننگ دینے کے بعد جرائم کو روکنے کے لئے ضروری طاقت کا استعمال کر سکتا ہے اور مسلح افواج۔ سول آرمڈ فورسز کے افسر کو پولیس افسر کے تمام اختیارات حاصل ہوں گے۔

(2) پولیس۔ مسلح افواج یا سول مسلح افواج کا گریڈ 15 کا افسر حالات و واقعات کا اندازہ کرتے ہوئے جرم کے مرتکب کسی مشتبہ شخص کو پیشگی وارننگ دے کر گولی مار سکتا ہے یا مارنے کا حکم دیا جا سکے گا۔

تاہم گولی مارنے یا چلانے کا حکم دینا آخری چارہ کار کے طور پر دیا جائے گا اور اس کے مقصد جرم کو روکنا ہے اور ضرورت سے زیادہ نقصان پہنچانا مقصود نہیں ہو گا۔

فائرنگ سے ہونے والی اموات یا شدید زخم آنے والے کیسوں کی انٹرنل انکوائری کی جائے گی اور انکوائری وہ شخص کرے گا جسے متعلقہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کا سربراہ مقرر کرے گا۔

مزید برآں حالات و واقعات کی روشنی میں فائرنگ سے ہونے والی اموات کی عدالتی تحقیقات بھی کرائی جا سکتی ہے۔ یہ انکوائری ایک ایسا شخص کرے گا جس کو وفاقی حکومت نے مقرر کیا ہو۔

تشریح: معقول خدشہ کہ ہلاک یا شدید زخمی درج ذیل وجوہات کی بنیاد پر ہوا۔

(i) ایسے شخص کے بارے میں پیشگی اطلاع ہو جس کی جائے وقوعہ پر شناخت ہو یا جس پر ایسا شخص ہونے کا شبہ ہو۔ یہ شخص گرفتاری کی مزاحمت کرے یا ہتھیار ڈالنے کا حکم نہ مانے اور اس کے عمل سے ہلاکت یا زخمی ہونے کا نتیجہ نکلے۔

(ii) پیشگی اطلاع مگر کسی علاقے میں فرد (افراد) کی واضح شناخت نہ ہو جو شیڈول

جرائم کی منصوبہ بندی، عملدرآمد یا مالی مدد میں ملوث ہوں یا ایسے جرم میں جس کا ذکر (i) پیراگراف میں آیا۔

(iii) ایسے حالات ہوں کہ کوئی شخص نقصان پہنچا سکتا ہو اور صورتحال سنگین رخ اختیار کر سکتی ہو۔

(iv) ایسے شخص کی نقل وحرکت سے خطرہ ہو جس کے پاس آتشیں اسلحہ ہو یا جو آتشیں اسلحہ کی طرف بڑھ رہا ہو تا کہ قانون نافذ کرنے والے اہلکار کسی عوامی نمائندے کو نشانہ بنا سکے۔ جس کا نتیجہ ہلاکت یا شدید زخمی ہونے کی صورت میں ہو۔

(v) ایسی پیشگی اطلاع ہو یا موقع پر اندازہ ہو جائے کہ کوئی شخص ایسے اشارے یا خود دھماکہ خیز مواد کو اڑا دے جس سے نقصان ہو یا کوئی شخص ایسے جرم میں مدد دے رہا ہو جس سے ہلاکت یا زخمی ہونے کا احتمال ہو۔

(بی) بلا وارنٹ ایسے شخص کی گرفتاری جو شیڈول جرم کا مرتکب ہو یا جس کے بارے میں معقول شبہ یا ٹھوس اطلاع ہو کہ اس نے یہ جرم کیا ہے یا کرنے والا ہے۔

(سی) بلا وارنٹ کسی بھی ایسے احاطے میں داخل ہو کر گرفتاری کے لئے تلاشی یا آتشیں اسلحہ، بارود، ہتھیار، گاڑی، آلات کو قبضے میں لینا جو شیڈول جرائم میں استعمال ہوئے ہوں، ہونے کا امکان ہو یا ہو سکتے ہوں، بشرطیکہ ایسی تلاشی کے بعد حالات و واقعات اس کا جواز پیش کرتے ہوں۔ برآمد شدہ اشیاء تلاشی لینے والا آفیسر دو روز میں اسپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ کے روبرو پیش کرے گا۔

5: تفتیش

(1) تمام جرائم قابل دست اندازی پولیس اور نا قابل ضمانت ہوں گے۔

(2) ایسے تمام جرائم جہاں مسلح فورسز/سول مسلح فورسز سول اتھارٹی کی معاون کے طور پر کام کر رہی ہیں ان کی انکوائری اور تفتیش مشترکہ تحقیقات ٹیم کرے گی جو ایک گزیٹڈ پولیس

افسر اور دو مسلح/سول مسلح فورسز کے افسران پر مشتمل ہوگی۔ مشترکہ تحقیقاتی ٹیم کا سربراہ مذکورہ بالا پولیس افسر ہوگا۔

(3) جب بھی کسی شخص کو سیکشن 3 کے سب سیکشن 2 کی شق بی اور سی کے تحت گرفتار کیا جائے گا یا حراست میں لیا جائے گا اور انکوائری یا تفتیش 24 گھنٹے میں مکمل نہیں ہو سکتی ہوگی، تو مشترکہ تحقیقاتی ٹیم کا سربراہ یا ان کے ماتحت کام کرنے والا کوئی دوسرا افسر اس شخص کو اس جگہ جہاں سے اسے حراست میں لیا گیا ہو وہاں سے عدالت تک کے سفر کا وقت منہا کر کے اسے اسپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ کے روبرو پیش کرے گا اور پولیس یا کسی دوسری تحقیقاتی ایجنسی کی حراست میں رکھنے کے لئے ملزم کے ریمانڈ کی استدعا کر سکتا ہے۔

(4) اسپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ ملزم کا وقتاً فوقتاً ریمانڈ دے سکتا ہے اگر وہ 60 دن کی زیادہ مدت کو مناسب نہیں سمجھتا۔

اسپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ اس سیکشن کے تحت ملزم کا ایک بار کے لئے پندرہ روز سے زیادہ ریمانڈ نہیں دے گا۔

اس سے زیادہ ریمانڈ لینے کے لئے پبلک پراسیکیوٹر کے ذریعے تمام رپورٹس جمع کرانا ہوں گی۔

(5) اس ایکٹ کے سیکشن 2 کی شق ڈی کے گرفتار شخص کو اجنبی دشمن سمجھا جائے گا اور سیکشن 15 کے تحت اسے پاکستان کے خلاف بغاوت یا جنگ تصور کیا جائے گا۔

6: انسداد حراست

(1) حکومت تحریری حکم نامے کے ذریعے کسی بھی شخص کی حراست کو خاص مدت تک کے لئے قانونی قرار دے سکتی ہے جو 90 دن سے زیادہ نہیں ہوگی، اگر حکومت کے پاس ٹھوس وجوہ ہوں گی کہ یہ شخص پاکستان کے دفاع، سیکورٹی اور خود مختاری کے خلاف کام کر رہا ہے۔

اس شخص کی حراست آئین کے آرٹیکل 10 کی دستیابی کے مطابق ہوگی۔

مزید یہ کہ کسی بھی تعصب کے بغیر آرٹیکل 10 کے تحت اس اجنبی دشمن کو حکومت کی جانب سے زیر حراست رکھا جا سکے گا تا کہ اسے مذکورہ بالا سرگرمیوں سے دور رکھا جا سکے جس کا تعین وہ خود کرے گی۔

وضاحت:

ایک شخص جوان جرائم کے سرزد کرنے یا کوشش کرنے یا تیاری کرنے کے ساتھ منسلک ہوگا یا ایک شخص اجنبی دشمن کی ہدایات کے تحت کام کر رہا ہوگا یا ایک شخص جو سیکشن 5 کے سب سیکشن 5 کے تحت آتا ہو اسے مذکورہ بالا سرگرمیوں میں ملوث سمجھا جائے گا۔

(2) ایسے علاقے جہاں وفاقی یا صوبائی حکومت نے مسلح افواج کو آئین کے آرٹیکل 245 کے تحت سول حکومت کی مدد کے لئے طلب کر رکھا ہو یا جہاں وفاقی یا صوبائی حکومت کی جانب سے انسداد دہشت گردی ایکٹ 1997ء (xxvil of 1997) کے تحت سول حکومت کی مدد کے لئے سول آرمڈ فورس کو طلب کیا ہو تو یہ فورسز کسی بھی اجنبی دشمن یا جنگجو کو حراستی مرکز میں قید رکھ سکتی ہیں۔

ایسے شخص کی حراست آئین کے آرٹیکل 10 کے تحت ہوگی۔

(3) اس نوٹیفکیشن کے جاری ہونے کے بعد کسی بھی وقت یا اس کی واپسی پر مذکورہ شخص کو رسمی تفتیش کے لئے پولیس یا کسی بھی دوسری تفتیشی ایجنسی کے حوالے کیا جائے گا۔

(4) وفاقی حکومت ان حراستی احکامات، حراستی مراکز، میکنزم، ان مراکز کی عدالتی حیثیت کے حوالے سے سیکشن 9 کے سب سیکشن 2 کے تحت قانون سازی کرے گی۔

(5) کوئی بھی شخص جسے مسلح افواج یا سول مسلح فورسز نے گرفتار کیا ہو اور تحفظ پاکستان ترمیمی آرڈیننس 2014ء کے نافذ العمل ہونے سے پہلے حراست میں رکھا گیا ہو اسے اسی ایکٹ کے تحت ہی گرفتار تصور کیا جائے گا، اگر وہ شخص ایسے جرائم میں ملوث رہا جو ایک

ایکٹ کے تحت آتے ہوں گے۔

7: رپورٹ

تحقیقات کے مکمل ہونے پر مشترکہ تحقیقاتی ٹیم پبلک پراسیکیوٹر کے ذریعے رپورٹ خصوصی عدالت کے روبرو پیش کرے گی۔

ہر چند کہ جو کچھ بھی قانون شہادت، 1984ء (P.O.10 of 1984)، یہ رپورٹ کوڈ کے سیکشن 173 کے معنی میں ایک شہادت کے طور پر استعمال کی جائے گی۔

:8 خصوصی عدالتوں کا قیام وغیرہ۔

(1) حکومت ایک ایکٹ کے تحت جتنی خصوصی عدالتیں چاہے بناسکتی ہے۔

(2) حکومت متعلقہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کی مشاورت سے کسی بھی ایسے شخص کو جو پاکستان کے کسی بھی صوبے میں سیشن جج رہ چکا ہو یا کم از کم دس سال تک کسی بھی ہائیکورٹ کے وکیل کے طور پر کام کر چکا ہو یا 70 سال سے زائد عمر کا نہ ہو، اسے اس ایکٹ کے تحت قائم کی جانے والی خصوصی عدالت کا جج مقرر کرسکتی ہے۔

(3) خصوصی عدالت کے جج کو سیشن کورٹ کے جج کے تمام اختیارات حاصل ہوں گے۔

(4) مجوزہ ایکٹ کے تحت تعینات ہونے والے خصوصی عدالت کے جج کو حکومت اس کی مدت ملازمت کے حوالے سے مکمل سیکورٹی فراہم کرے گی۔

(5) حکومت متعلقہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سے مشاورت کے بعد فرسٹ کلاس کے اسپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ کا تقرر کرے گی جو ماتحت عدلیہ میں خدمات انجام دے رہا ہو، یا وہ پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس یا صوبائی مینجمنٹ سروس میں گریڈ 18 سے کم کا افسر نہ ہو، یا وہ ہائیکورٹ کے وکیل کی حیثیت سے گزشتہ پانچ سال سے پریکٹس کر رہا ہو۔

(6) اسپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ کے پاس فرسٹ کلاس کے مجسٹریٹ کے تمام

اختیارات ہوں گے۔

(7) خصوصی عدالت کسی بھی جرم یا معاملے کی کوئی آگاہی نہیں لے گی سوائے اس کے جو معاملہ سیکشن 7 کے تحت اس کے روبرو ہو۔

(8) انکوائری، تفتیش اور ٹرائل کے مقامات۔

(1) حکومت پراسیکیوشن کرنے والی ایجنسی کی رپورٹ پر مجرم کے حراستی مقام، اس سے تفتیش یا جرم کے ٹرائل کے لئے ملک بھر میں کہیں بھی جگہ کا تعین کرے گی۔

(2) آئین سے متعلق

(a) حکومت، مشترکہ تحقیقاتی ٹیم، مسلح افواج اور سول آرمڈ فورسز اپنے اہلکاروں، یا مجرم کی حفاظت کی پیش نظر سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے سوا کسی کو بھی حراستی مراکز، قیدیوں کے حراستی مقامات کی معلومات دینے کے پابند نہیں ہوں گے۔ ایک جج یا ججز صاحبان کو اس حوالے سے قیدیوں کے ٹھکانوں کی معلومات دی جائے تو وہ عوامی مفاد میں اس سے بطور اپنے استحقاق کے سلوک کرے۔

(b) حکومت عسکریت پسندوں اور ملک دشمنوں کے حراستی مقامات یا قیدیوں یا ملزموں کے متعلق کوئی معلومات ملکی سلامتی کی خاطر افشا نہیں کرے گی۔

(3) اگر کسی شخص کو شیڈول جرم میں سزا دی جاتی ہے تو حکومتی ہدایت کے مطابق حکومت پاکستان ایسے مجرمان کو وفاقی یا صوبائی حکومت کی قائم کردہ کسی بھی جیل میں رکھ سکے گی۔

10۔ عوام کو خصوصی عدالت کی سماعت سے دور رکھنا:

کسی تعصب کے بغیر خصوصی عدالت اپنے اختیارات کے مطابق وقتی طور پر اس قانون کا نفاذ کرے گی جس کے مطابق عوام کو اس کی کارروائی سے دور رکھا جائے گا۔ کسی بھی ملزم کے ٹرائل کے دوران پراسیکیوشن کی جانب سے ٹرائل کے دوران درخواست دی جائے

گی کہ کسی بھی شواہد یا بیانات کی اشاعت عوامی تحفظ کے لئے ضرر رساں ہوگی۔ اس وجہ سے ٹرائل کے تمام مراحل عوامی رسائی سے پرے ہی ہونے چاہئیں لیکن خصوصی عدالت اپنا فیصلہ اوپن کورٹ میں سنائے گی۔

11- مدعی ایجنسی کا قیام:

حکومت پراسیکیوٹر جنرل کی سربراہی میں ایک آزاد مدعی ایجنسی کا قیام عمل میں لائے گی جو تفتیشی ادارے کو قانونی ہدایات دے گی اور مقدمات کی پیروی بھی کرے گی۔

12- پراسیکیوٹر جنرل:

(1) حکومت ایسے شخص کا بطور پراسیکیوٹر جنرل تقرر کرے گی جو گزشتہ دس سال سے عدالت عالیہ کے وکیل کے طور پر کام کر رہا ہو اور اس کی عمر 45 سال سے کم نہ ہو۔

(2) پراسیکیوٹر شیڈول جرائم کی ٹھوس تفتیش اور موثر پراسیکیوٹر کے لئے تفتیشی ادارے کو قانونی ہدایات دے گا۔

(3) پراسیکیوٹر جنرل حکومت کی پیشگی اجازت سے خصوصی عدالت میں زیر سماعت کسی بھی کیس میں پیروی سے رک سکتے ہیں یا تفتیش رکوا سکتے ہیں۔ اس طرح پراسیکیوٹر جنرل کی طرف سے ایسی درخواست پر عدالت ملزم کے خلاف الزام ختم کر دے گی یا اسے بری کر دے گی۔

13- جج صاحبان، پراسیکیوٹرز اور گواہوں کا تحفظ:

حکومت گواہوں، تفتیشی افسران، پراسیکیوٹرز، اسپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ اور جج کی سیکورٹی کے لئے خصوصی اقدامات کرے گی اس مقصد کے لئے حکومت کسی بھی جگہ عدالتوں کے ساتھ ہائی سیکورٹی جیلیں قائم کرے گی۔

14- مشترکہ ٹرائل:

(1) ایک کیس کے ٹرائل کے دوران خصوصی عدالت کسی دوسرے ملزم کا بھی ٹرائل

کر سکے گی جو سی سی پی 1898ء کے تحت شیڈول جرم ہو۔ اس طرح اگر جرم سے متعلق ہی کوئی معاملہ ہے تو اس کا بھی مشترکہ ٹرائل ہو سکے گا۔

(2) اگر کیس کے ٹرائل کے دوران پتہ چلتا ہے کہ اس ملزم نے اس جرم سے متعلق کوئی اور بھی جرم سرزد کیا ہے تو خصوصی عدالت اسے اس جرم میں بھی اس کا ٹرائل کر سکے گی اور سزا دے سکے گی۔

15: ثبوت:

(1) ایک عسکریت پسند جس پر ایک شیڈول جرم میں تفتیش چل رہی ہو یا وہ جو حراست کے دوران یا کوئی جرم کرتا ہے تو اس کا یہ اقدام ملک کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا جب تک کہ وہ شخص اس جرم کے حوالے سے اپنی بے گناہی کو خصوصی عدالت میں ثابت نہیں کر دیتا۔

(2) کوئی بھی شخص جو شیلڈ ولڈ جرم کی تیاری، کوشش یا ارتکاب کے دوران پکڑ آ گیا اور اس سے کوئی ایسا ہتھیار، مواد، گاڑی، دستاویز یا کوئی آلہ برآمد ہوا جو بم دھماکے، خودکش دھماکے، ٹارگٹ کلنگ یا شدید نقصان پہنچانے کے لئے بنایا گیا ہو یا ان جرائم کے لئے استعمال ہوا ہو یا ان جرائم کے ارتکاب میں معاون ثابت ہو سکتا ہو، ایسا شخص شیڈ ولڈ جرم کی تیاری، ارتکاب یا جو بھی صورتحال ہو، کا قصوروار سمجھا جائے گا۔

وضاحت: ایک سیل فون یا کوئی دوسرا عنصر جس پر کالز اور پیغامات یا دیگر ڈیٹا بطور ثبوت موجود ہو جس سے شیڈ ولڈ جرم کی تیاری، کوشش یا ارتکاب میں معاونت ظاہر ہوتی ہو، اسے ''آلہ'' تصور کیا جائے گا اور اس پر موجود ریکارڈ بطور شہادت قابل قبول ہو گا۔

16: سزا

پاکستان پینل کوڈ یا کسی بھی دوسرے مروجہ قانون سے متصادم نہ ہونے کی صورت میں، شیلڈ ولڈ جرم کی سزا 20 سال تک قید، جرمانہ اور جائیداد کی ضبطگی ہو گی، یہاں تک کہ خصوصی عدالت مجرم کو شہریت سے محروم کر سکتی ہے۔

17: کیسز کی منتقلی

(1) ایسی صورت میں جب ایک خصوصی عدالت کے سامنے کیس پیش کیا جاتا ہے اور عدالت سمجھتی ہے کہ یہ جرم ''شیلڈولڈ'' جرم کے زمرے میں نہیں آتا اور اس کیس کی سماعت اس کے دائرہ اختیار میں نہیں آتی تو خصوصی عدالت اس کیس کو عام عدالت میں دائر کرنے کے لئے پراسیکیوشن ایجنسی کو واپس کر دے گی۔

(2) پراسیکیوٹر جنرل، حکومت کی منظوری اور معقول وجوہات (جو ریکارڈ کی جائیں گی) کی بناء پر خصوصی عدالت میں زیر سماعت کسی بھی کیس کو، کسی بھی مرحلے میں، اس عدالت کی اجازت سے واپس لے سکتا ہے اور اسے اس ایکٹ کے تحت قائم کسی دوسری خصوصی عدالت میں پیش کر سکتا ہے۔

(3) حکومت قانون کی کسی بھی عدالت یا ٹربیونل سے جہاں کوئی ایسا مقدمہ زیر سماعت ہو جو ''شیڈولڈ'' جرم کی زمرے میں آتا ہو، اسے خصوصی عدالت کو ٹرانسفر کرنے کی درخواست کر سکتی ہے۔ اس صورت میں کوئی دوسری عدالت یا ٹربیونل ایسا کیس خصوصی عدالت کو منتقل کرے گی جبکہ خصوصی عدالت کے لئے یہ لازمی نہیں ہوگا کہ وہ اس کیس سے متعلق کسی گواہ کو دوبارہ طلب کرے یا پہلے سے ریکارڈ کردہ شہادتیں دوبارہ ریکارڈ کرے۔

18: قانون کی بعض شقیں نا قابل اطلاق۔

اس قانون کے سیکشن 439,439A,491,496,497,498,374,426,435 اور 561A کی شقوں کا ''شیڈولڈ'' جرم پر اطلاق نہیں ہوگا۔

19: اپیل

(1) خصوصی عدالت کے حتمی فیصلے کیخلاف اپیل ہائیکورٹ میں کی جا سکے گی۔

(2) خصوصی عدالت کے فیصلے کی نقل ملزم اور پبلک پراسیکیوٹر کو فیصلے کے روز ہی فراہم کی جائے گی۔

(3) متاثرہ شخص یا حکومت کی جانب سے خصوصی عدالت کے فیصلے کے 30 روز کے اندر اپیل دائر کی جاسکے گی۔

20: تحفظ

پولیس، مسلح افواج یا سول آرمڈ فورسز کے کسی بھی رکن کو، جس نے سول اتھارٹی، پراسیکیوٹر جنرل، پراسیکیوٹر، اسپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ یا خصوصی عدالت کے جج کی معاونت کی ہو، وہ فرائض کی انجام دہی میں نیک نیتی سے کئے جانے والے کسی بھی ایکشن پر جوابدہ یا قصوروار نہیں ہوگا۔

21: قواعد بنانے کا اختیار

(1) اس قانون پر عملدرآمد کے سلسلے میں قواعد بنانے کا اختیار حکومت کو حاصل ہوگا۔

(2) ''شیڈولڈ'' جرائم کی روک تھام اور حکومت کی معاونت کے لئے طاقت کے استعمال کے دوران پولیس، مسلح افواج یا سول آرمڈ فورسز کے لئے ایسے قواعد گائیڈ لائنز کی حیثیت کے حامل ہوں گے۔

(3) ایسے قواعد کو نوٹیفکیشن کی صورت میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کیا جائے گا۔

22: شیڈول میں ترمیم

حکومت آفیشل گزٹ میں نوٹیفکیشن جاری کر کے شیڈول کے کسی حصے میں ترمیم، اضافہ یا کوئی حصہ حذف کر سکتی ہے۔

23: اختیارات

وفاقی حکومت نوٹیفکیشن کے اجراء کے ذریعے کسی بھی صوبائی حکومت کو اس قانون کے تحت اختیارات کے استعمال کی اجازت دے سکتی ہے۔

24: اوور رائیڈنگ ایفیکٹ

(1) ایسی شرائط جو حکومت آفیشل گزٹ میں جاری نوٹیفکیشن میں واضح کرے گی، اس قانون کی شقیں کسی بھی مروجہ قانون کے لحاظ سے موثر ہوں گی۔

(2) اگر اس قانون کی شقیں کسی دوسرے مروجہ قانون سے متصادم ہوں گی تو اس صورت میں اس قانون کی شقیں ہی موثر ہوں گی۔

25: مشکلات کا ازالہ

(1) اگر اس قانون کی کسی شق کے اطلاق میں کوئی مشکل پیش آتی ہے تو صدر مملکت اس مشکل سے نجات کے لئے حکم جاری کر سکتے ہیں بشرطیکہ ایسا حکم اس قانون کی شقوں سے متصادم نہ ہو۔

(2) سب سیکشن (1) کے تحت ایسا حکم جاری ہونے کے بعد پارلیمنٹ کے ہر ایوان کے پہلے اجلاس میں پیش کیا جائے گا۔

توثیق

6 جون تک تمام دہشت گرد واقعات کی تفتیش و تحقیقات اور قانونی کارروائی کی توثیق کی جاتی ہے، اس تاریخ تک ہونے والی دہشت گردی کے ملزمان کو سزا ملے گی یا عدالتی کارروائی چلائی جائے گی، اس حوالے سے نوٹیفکیشن کے بعد قواعد وضوابط وضع کئے جائیں گے۔

شیڈول [سیکشن 2(1)]......

شیڈولڈ جرائم: (1) اس ایکٹ کے تحت پاکستان یا قومی سلامتی کے خلاف جنگی مقصد یا بغاوت کے زمرے میں کیا جانے والا ہر اقدام شیڈولڈ جرائم میں آئے گا، جن کی تفصیل یوں ہے۔

(A) نسلی، مذہبی، سیاسی بنیادوں پر یا اقلیتوں کے خلاف کئے جانے والے جرائم، بشمول امتیازی سلوک، نفرت انگیزی یا عقیدے کی بناء پر کوئی جرم۔

(B) آتش گیر مادہ رکھنا، بم چلانا، خودکش حملے، کیمیائی و کیمیکل ہتھیاروں اور نیوکلیئر

اسلحہ کا استعمال، پلاسٹک کا دھماکہ خیز یا کوئی ایسا مواد جس سے دھماکہ کیا جا سکے، بم سازی کا سامان رکھنا یا ایسی کارروائی جس کا مقصد لوگوں کو ہلاک و زخمی کرنا یا اثاثوں کو تباہ کرنا ہو۔

(C) آتش گیر مادے اور بموں کا مقامی مقامات، سرکاری املاک، عبادت گاہوں، تاریخی مقامات، کاروباری مراکز یا دیگر جگہ پر استعمال کرنا اور شہری ہلاکتوں یا زخمیوں خطرہ پیدا کرنا۔

(D) ارکان پارلیمنٹ، ججوں، حکام، میڈیا اور دیگر اہم شخصیات یا کسی بھی دیگر شخص کا قتل، اغواء، بھتہ خوری یا قاتلانہ حملہ۔

(E) سرکاری افسران و ملازمین، بشمول مسلح افواج اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں کا قتل، اغوا، بھتہ خوری یا قاتلانہ حملہ۔

(F) غیر ملکی حکام، سرکاری مہمان، سیاح دوسرے ملک کے شہری یا کسی عالمی شخصیت وغیرہ کا قتل، اغوا، بھتہ خوری یا قاتلانہ حملہ۔

(G) سماجی و فلاحی کارکنوں، بشمول ہیلتھ ورکرز، امدادی کارکنوں اور رضا کاروں کا قتل، اغوا، بھتہ خوری یا قاتلانہ حملہ۔

(H) مواصلاتی نظام، رابطے کے ذرائع، آلات، گرڈ اسٹیشنز یا کسی انتظامی تنصیب پر تخریب کاری یا حملہ۔

(I) توانائی کے ذرائع، بشمول ڈیمز، بجلی کا پیداواری و ترسیلی نظام، اسٹیشنز، تار اور کھمبوں کو تباہ یا ان پر حملہ کرنا۔

(J) ہوائی جہازوں، ایئرپورٹس پر تخریبی حملہ کرنا، دوران پرواز طیارے میں عملہ پر کسی بھی ہتھیار سے حملہ کرنا یا کسی نوع کے اسلحہ سے انسانی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنا۔

(K) گیس یا تیل کی پائپ لائنز، مائع اور قدرتی گیس کے ذخائر یا ان کی نقل و حمل سے متعلق نظام، بشمول ٹینکرز پر حملہ تخریب کاری کرنا۔

(L) قومی دفائی املاک، حدود، اثاثوں اور تنصیبات، بشمول چیک پوسٹوں، جیلوں اور دیگر عمارات پر تخریب کاری یا حملہ کرنا۔

(M) تعلیمی اداروں، پولیس تھانوں اور سیکورٹی سے متعلق دیگر اداروں پر حملہ یا تخریب کاری۔

(N) سائبر کرائمز، انٹرنیٹ جرائم اور انفارمیشن ٹیکنالوجی سے متعلقہ جرائم بھی اسی ایکٹ کے تحت آئیں گے۔

(O) ماس ٹرانسپورٹ سسٹم، بشمول ریل گاڑیوں، بسوں، کاروں، ان کے اسٹیشنز اور اڈوں پر تخریبی حملہ کرنا۔

(P) بحری تنصیبات، پلیٹ فارمز، کشتی بانی اور بندرگاہوں یا دیگر سمندری تنصیبات کو نقصان پہنچانا یا حملہ کرنا۔

(Q) جوہری ہتھیاروں یا ان سے متعلقہ تنصیبات کو نقصان پہنچانا۔

(R) کسی کو یرغمال بنانا یا یرغمالی بنانے کی کوشش کرنا۔

(S) پاکستان سے باہر ملکی مفادات کو نقصان پہنچانا۔

(T) غیر قانونی طور پر ملک کی سرحدی حدود عبور کرنا بھی شیڈول جرائم میں آئے گا۔

باب 3

☆......دینی مدارس

☆......پاکستان مدرسہ بورڈ

☆......مدارس کا مسئلہ

☆......دینی جماعتوں کا موقف

☆......مدارس اور فرقہ بندی

☆......اسے کیا نام دیا جائے

☆......نوجوان کیا کہتے ہیں

☆......انتہاپسندی کا خاتمہ، واحد حل تعلیم
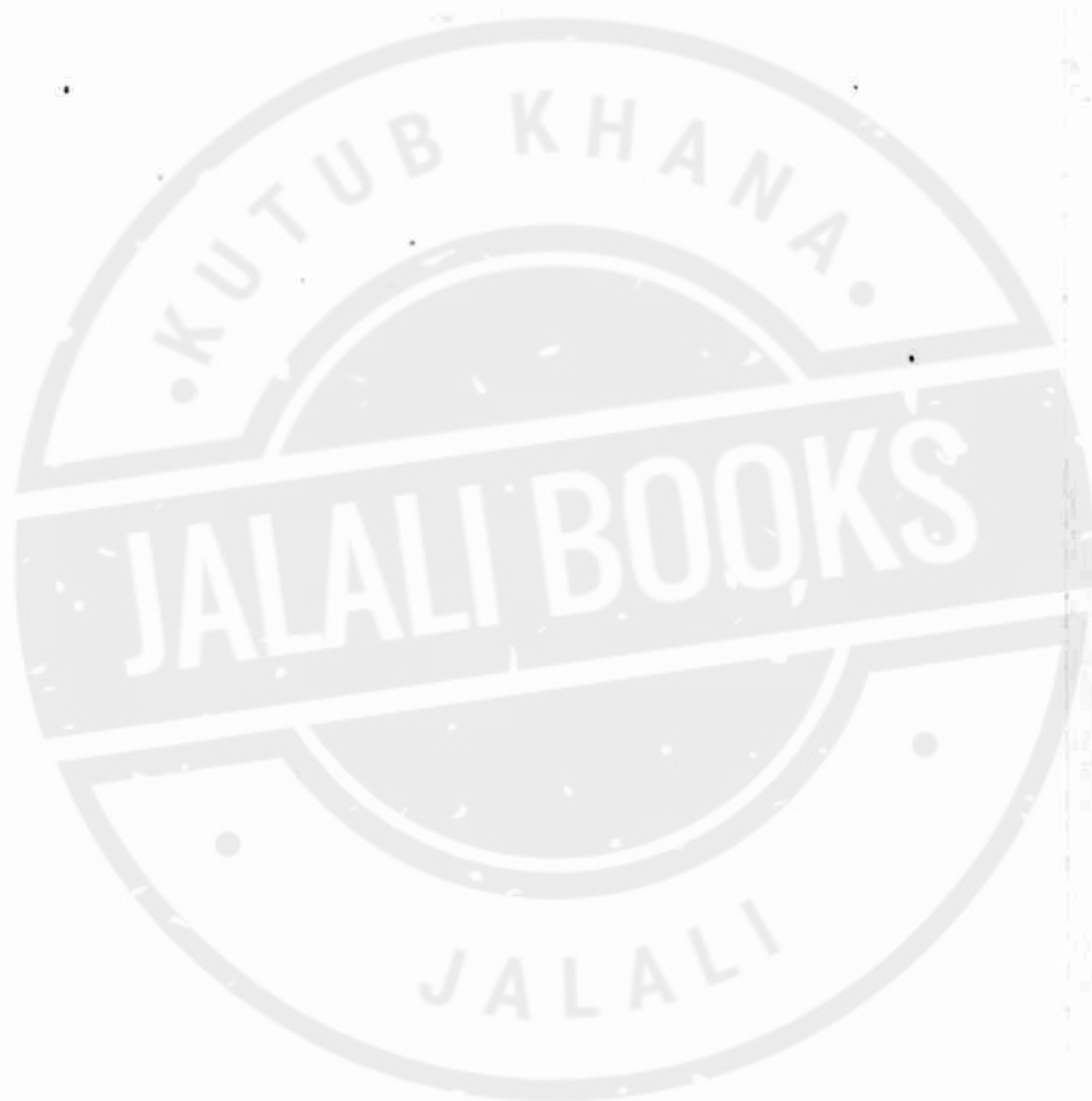
دینی مدارس

اسلام کائنات کا وہ مذہب ہے جس کی علم دوستی اور روشن خیالی کا کوئی مذہب مقابلہ نہیں کرسکتا، علم حاصل کرنے میں اسلام نے کوئی منفی تفریق روا نہیں رکھی۔ ہر مسلمان مرد و عورت کو علم حاصل کرنے کی تلقین کی۔ پہلا دینی مدرسہ حضور ختم المرسلمینؐ کے دور میں شروع ہوا۔ جس کے طالب علموں کو اصحاب صفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خود حضور پاک مسجد نبوی میں اترنے والی وحی کو صحابہ کرامؓ کو سکھاتے۔ وحی کی تعبیر کرتے اور دینوی معاملات میں رہنمائی فرماتے تھے۔

مسجد نبوی کے ایک گوشے میں مسجد سے باہر ایک چبوترہ بنا دیا گیا تھا۔ اس پر وہ مہاجرین صحابہ کرامؓ مدینہ منورہ آ کر رہنے لگے جو نہ تو کچھ کاروبار کرتے تھے اور نہ ہی ان کے پاس رہنے کو گھر تھا۔ مکہ مکرمہ اور دیگر علاقوں سے دین متین سیکھنے کے لئے آنے والے صحابہ کرام فقر و فاقہ کو اپنا شعار بنا کر رسول اللہؐ کی خدمت اقدس میں آ گئے تھے۔ گویا یہ خانقاہ ان غریب صحابہ کرام کی قیام گاہ تھی، جنہوں نے اپنی زندگی تعلیم دین، تبلیغ اسلام، جہاد اور اسلامی خدمات کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ قرآن کریم یاد کرتے۔ احادیث رسول رسولؐ کو سینوں میں محفوظ کرتے اور حضور اقدسؐ کی انفاسِ قدسیہ کی برکتوں سے اپنے آئینہ دل کو جلا دیتے تھے۔ (مرقاۃ المفاتیح صفحہ نمبر 333 جلد 4)

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ صفہ مسجد نبوی کے اختتام پر ایک سائبان تھا۔ جس میں فقراء و مساکین صحابہ جو اہل و عیال نہیں رکھتے تھے، ان کی قیام گاہ تھی۔ اسی مکان کی نسبت سے ان کو اصحاب صفہ کہتے تھے۔ علامہ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ تحویل سے پیشتر قبلہ شمالی جانب تھا۔ لیکن جب قبلہ کی تحویل ہوئی تو قبلہ اول کی دیوار اس کی جگہ پر قائم رکھی، تا کہ مساکین وفقراء کے لئے بھی جگہ رہے۔ اصحابہ صفہ کے نکاح کر لینے، موت آ جانے یا مسافرت اختیار کرنے کی

وجہ سے ان کی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ حافظ ابونعیم نے اپنی کتاب حلیفہ میں ایک سو سے زیادہ ان کے نام شمار کئے ہیں۔ ان کی خواب گاہ بھی مسجد میں تھی۔ یہ لوگ اس کے علاوہ کوئی دوسری جگہ نہیں رکھتے تھے۔

صفہ کی درس گاہ میں رسول اللہؐ کے علاوہ اجل صحابہ کرامؓ بھی تعلیم دیتے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کا بیان ہے کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے چند لوگوں کو قرآن مجید پڑھایا اور انہیں لکھنا سکھایا تو ان میں سے ایک شخص نے ہدیہ میں مجھے ایک کمان دی۔ پس میں نے کہا کہ یہ مال نہیں جو دینی خدمت کے عوض لینا جائز نہ ہو اور میں اس سے خدا کی راہ میں جہاد کروں گا۔ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا: "اگر تمہیں جہنم کی آگ کا طوق پہننا پسند کرنا ہو تو قبول کر لو۔"

(دینی خدمت پر معاوضہ لینے کے سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ علماء متاثرین نے ضرورتاً جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ لیکن بطور رقیہ وتعویز کے قرآنی آیات کا استعمال بالاتفاق سب کے نزدیک جائز ہے۔

اصحاب صفہ کا سارا وقت درس و تعلیم میں گزرتا تھا۔

اسلام کی کرنیں ظلمتوں اور جہالتوں کو چیرتی ہوئی جزیرہ نما عرب سے باہر روشنی پھیلانے لگیں اور مسلمانوں کو دیگر اقوام کی تہذیبوں، ثقافتوں اور زبانوں سے واسطہ پیش آیا تو ایسے مسلمان ماہرین کی ضرورت محسوس ہوئی جو قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر میں مہارت حاصل کر کے ایسی کتب تیار کریں جن سے دیگر نو مسلموں اور غیر عربوں کی تعلیمی ضرورتیں پوری کی جا سکیں۔ مسلمان علماء ایسے علاقوں میں جا کر اندھیرے میں ڈوبے ہوئے انسانوں کی رہنمائی کر سکیں۔ ان مسائل اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے باقاعدہ مدارس کی روایت کا آغاز ہوا۔ جو اعلیٰ تعلیم کے مراکز تھے اور جن کا ابتدائی مقصد سب کے لئے یکساں اور ہمہ گیر تعلیم کے ذریعے زندگی کے تمام شعبوں میں مذہبی رہنمائی فراہم کرنا اور اسلامی علمی مآخذ اور اثاثوں کی ترویج و تحفیظ تھا۔

اسلام میں اصحاب صفہ اور دیگر علمی مجالس کے علاوہ تاریخی طور پر پہلا مدرسہ مصر میں 1005ء میں قائم ہوا۔ اس میں ایک تعلیمی ادارے کے تمام لوازمات موجود تھے۔ کتب خانہ میں مختلف مضامین کی تدریس کے لئے مختلف اساتذہ اور طلبہ کو کاغذ، قلم، سیاہی وغیرہ مفت فراہم کئے جاتے تھے۔ 1027ء میں بغداد میں پہلا باقاعدہ اور منظم مدرسہ قائم کیا گیا۔ اس مدرسے میں دینی و دنیوی ہر دو طرح کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا تھا تاکہ زندگی کے تمام شعبوں کے ماہرین تیار ہوسکیں۔ بعد میں پوری سلطنت میں متعدد مدارس قائم کئے گئے جہاں اسلامی علوم کے علاوہ سائنس، فلسفہ، امور مملکت اور پبلک ایڈمنسٹریشن کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

آئندہ صدیوں میں ان مدارس سے عظیم مسلمان مفکرین، سیاست دان، سائنس دان، الٰہیات و فلسفہ، فلکیات و الجبرا، جیومیٹری، طب، غرض جملہ علوم کے ماہرین پیدا ہوئے ان مدارس کا سلسلہ رفتہ رفتہ پوری اسلامی دنیا میں پھیل گیا۔ شرقِ اوسط سے وسط ایشیا اور اندلس سے برصغیر پاک و ہند اور مشرق قریب و بعید میں بے شمار بڑے بڑے مدارس قائم ہوئے۔ جنہوں نے علوم و فنون کی ترقی میں نہایت شاندار خدمات انجام دیں۔ یہاں مسلمان علماء نے علم و تحقیق و ترجمہ کے میدان میں ایسا سرمایہ علمی مہیا کیا جو بعد ازاں یورپ کے علماء و سائنس دانوں کے لئے نئی دریافتوں اور ایجادات کی بنیاد بنا۔

برصغیر پاک و ہند وہ خطہ ہے جہاں برطانوی اقتدار میں مدارس کا نظام تبدیلی کے ایک بڑے مرحلے سے گزرا۔ یہاں نئے نظام سیاست اور نئے نظام تعلیم کو مسلمانوں کی اسلامی شناخت کے لئے ایک خطرے سے تعبیر کیا گیا۔ اپنی مکمل تحلیل کے پیش نظر برصغیر کے مدارس نے خود کو قرآن و حدیث اور فقہ کی تدریس تک محدود کر لیا تاکہ بنیادی اقدار اور تعلیمات کی حفاظت کی جاسکے اور عبادات اور شخصی معاملات میں معاشرے کی مذہبی ضروریات پوری کی جاتی رہیں۔ یہ ایک لحاظ سے خود کو ایک قلعے میں محصور کر لینے کے مترادف تھا۔ جس سے باہر نکلنا یا جس میں کسی کو داخلے کی اجازت دینا اپنے وجود کی بقاء کے

لئے خطرے کو دعوت دینا تھا۔

امریکہ میں وقوع پذیر ہونے والے نائن الیون کے واقعہ کے بعد مغربی میڈیا اور تحقیقی اداروں میں ان مدارس کی تعداد، کردار، تعلیم، نظام وغیرہ کے بارے میں جاننے اور رپورٹیں، تجزیے اور مضامین لکھنے کی ایک دوڑ شروع ہو چکی ہے لیکن چند ایک تحقیقی اور سنجیدہ رپورٹوں کے علاوہ زیادہ تر تجزیے قیاس آرائیوں کی بنیاد پر حاصل کردہ اعداد و شمار اور مدارس کے چند وابستگان سے کئے گئے انٹرویوز کی بنیاد پر کئے جا رہے ہیں۔ مختلف مضامین میں ان مدارس کی تعداد سات ہزار سے پچاس ہزار تک بیان کی جاتی ہے لیکن قابل اعتبار اعداد و شمار کسی کے پاس دستیاب نہیں۔ مسلمانوں میں روایتاً قرآن اور عقائد کی تعلیم ایک لازمی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے بغیر مسلمان اپنی عبادات و معاملات کے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے اس لئے اس کا اہتمام گھر، محلے اور مسجد کی سطح پر کیا جاتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے ایسے روایتی سلسلوں کو بھی اگر مدارس کی تعریف میں شمار کر لیا جائے تو یہ تعداد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں میں پہنچ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعداد و شمار کا تعین کرتے ہوئے مدارس کی جامع تعریف کو مدنظر رکھنا پڑے گا کہ کس درجے تک اور کتنی تعداد میں طلبہ و تعلیم دینے والے اداروں کو مدرسے کہا جائے۔

مدارس کے حوالے سے ایک تحقیق کے مطابق قیام پاکستان کے وقت ہمارے ہاں صرف 137 مدرسے تھے اور 1956ء میں کئے گئے ایک سروے کے مطابق پورے مغربی پاکستان میں 244 مدرسے موجود تھے۔ 1994ء میں ایک اندازے کے مطابق 2500 مدارس قائم ہو چکے تھے۔ 2001ء میں ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق 6000 مدرسے اور ان میں 604421 طلبہ زیر تعلیم تھے۔ سابق وفاقی وزیر برائے مذہبی امور ڈاکٹر محمود احمد غازی کے بقول پاکستان میں تقریباً 10000 مدارس موجود ہیں اور ان میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد 60 لاکھ سے 70 لاکھ کے درمیان ہے۔

پاکستان مدرسہ بورڈ

پاکستان مدرسہ بورڈ کے چیئرمین ڈاکٹر محمد عامر طاسین اپنے مقالے میں تحریر کرتے ہیں کہ برصغیر کے دینی مدارس میں پڑھایا جانے والا نصاب ملا نظام الدین سہالوی نے ترتیب دیا تھا۔ ملا نظام الدین فرنگی محل لکھنو میں اسلامی فقہ اور فلسفے کے استاد تھے۔ ان کا مرتب کردہ نصاب جسے درس نظامی کہا جاتا ہے وہ مدرسہ انتظامیہ بغداد کے نصاب سے یکسر مختلف تھا جسے ملا نصیر الدین طوسی نے ترتیب دیا تھا۔ ابتداء میں اہل سنت کے (دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث اور جماعت اسلامی کے مدارس میں یہی نصاب پڑھایا جاتا رہا۔ بعدازاں تمام مکاتب فکر نے اپنی اپنی فقہی ضروریات کے مطابق اس میں ترامیم کرلیں اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ جہاں خیالات ونظریات نے خدشات واندیشے پیدا کئے وہاں تقسیم در تقسیم کے عمل نے بھی جگہ بنائی ہے۔ اب یہ صورت حال ہے کہ اس دینی نظام تعلیم میں بھی اپنے اپنے منشور وقواعد کے مطابق ڈگریوں کی بتدریج تقسیم نے بھی الگ الگ "بورڈز" کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ "ملک میں موجود تمام مدارس تعلیمی بورڈز کی طرح ایک وفاق سے جڑے ہوئے ہیں یہ پانچوں وفاق یعنی بورڈ ہر مکتبہ فکر، مسلک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چار بورڈز دیوبندی، اہلحدیث، بریلوی اور جماعت اسلامی اور پانچواں شیعہ مکاتب فکر کے لئے قائم ہوئے۔ گویا کہ اس وقت مملکت پاکستان میں معروف پانچ مکاتب فکر کے اپنے اپنے تعلیمی بورڈ (وفاق) موجود ہیں جو کہ اپنے اپنے منشور، قواعد وضوابط اور اپنے مقررہ نصاب کے مطابق تعلیم دے رہے ہیں۔" 29 نومبر تا یکم دسمبر 1947ء کو قائداعظم محمد علی جناح کے ایما پر منعقد ہونے والی پاکستان کی پہلی قومی تعلیمی کانفرنس کی سفارشات سے لے کر حکومت کی ہر نئی تعلیمی پالیسی میں اسلامی تعلیم اور تعلیمی اداروں میں اسلامی اخلاقی اقدار کی تربیت وترویج کی فکر کا عنصر موجود رہا مگر نصاب میں اسلامیات یا اسلامک کلچر کے

نام سے ایک نئے مضمون کے اضافہ کے علاوہ کوئی ٹھوس پیش رفت اس سلسلے میں نہیں ہوئی۔'' اس کے بعد 1970ء میں ایئر مارشل نور خان کی تعلیمی سفارشات سامنے آئیں تو ملک کے جید علمائے کرام نے ان کا جائزہ لیا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ دینی مدارس کے موجودہ نصاب میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ اس میں عصری علوم کا اضافہ ہونا چاہئے تاکہ ایسے افراد تیار ہو سکیں جو اچھے مسلمان بھی ہوں اور موجودہ سائنسی اور صنعتی دور کے تقاضوں کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں اور زندگی کے تمام معاملات چلانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ جب ہم پاکستان میں دینی مدارس کے نصاب کی تبدیلی کے عنوان سے جائزہ لیتے ہیں تو معلوم یہی ہوتا ہے کہ ''1979ء میں جائزہ دینی مدارس کے عنوان سے ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا کی سربراہی میں ایک کمیٹی وزارت تعلیم کی طرف سے تشکیل دی گئی، اس میں ماہرین تعلیم کے علاوہ جید علماء بھی شامل تھے۔ اس کی متفقہ رپورٹ میں بھی سفارش کی گئی کہ دینی مدارس میں عصری علوم کی تدریس کا اہتمام کیا جائے اور تمام مدارس کا امتحانی نظام ایک مرکزی بورڈ یا وفاق کے سپرد کیا جائے لیکن اس رپورٹ پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔ 1988ء میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (مرحوم) کی سربراہی میں تعلیم کی اسلامی تشکیل کے لئے مستقل کمیشن (Education Commision for Islamization of Permanent) قائم کیا گیا جو بدقسمتی سے عارضی ثابت ہوا اور اسی سال کے آخر میں وزیراعظم پاکستان شہید محترمہ بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد حکومت کی مصلحت پسندی یا حکمت عملی کے باعث 1989ء کے آغاز میں کمیشن کے سربراہ کی طرف سے ایک مختصر مگر اہم عبوری رپورٹ وزارت تعلیم کے حوالے کرنے کے بعد کمیشن عملی طور پر کالعدم ہو گیا۔ 1991ء میں وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف کے پہلے دور حکومت میں نفاذ شریعت ایکٹ پاس ہونے کے بعد اس کی دفعہ 7 کے تحت تعلیم کی اسلامی تشکیل کا نیا کمیشن جناب سجاد حیدر ایم این اے (جونیجو دور حکومت میں وفاقی وزیر تعلیم) کی سربراہی میں قائم کیا گیا اور کئی

ابواب پر مشتمل کمیشن کی رپورٹ کا ابتدائی ڈرافٹ مکمل کرلیا گیا۔ 1993ء میں پھر وزیراعظم پاکستان شہید محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے دوسرے دور میں جناب غضنفر گل ایم این اے اس کے سربراہ مقرر ہوئے کمیشن کے کام میں کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہ ہوسکی۔ 1997ء کے آغاز میں حکومت پھر تبدیل ہوئی تو جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری (ڈائریکٹر جنرل ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد) اس کے سربراہ مقرر کیے گئے مگر حکومت کی طرف سے کمیشن کے کام کی تکمیل کے لئے کسی گرمجوشی کے فقدان کے باعث یہ کمیشن عملاً معطل رہا۔ مقصود یہ ہے کہ دینی مدارس کے روایتی نظام تعلیم اور جدید تعلیم کے اداروں کو مربوط کرتے ہوئے پورے نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل کا تصور برابر موجود رہا اگرچہ بدقسمتی سے اس کی طرف بوجوہ ٹھوس پیشرفت نہ ہوسکی'' اس عمومی پس منظر کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ حکومتی خواہش پروقت کے ساتھ ساتھ بتدریج بننے والے کمیشن، تعلیمی بورڈ اور کمیٹیاں اس بات کی غمازی کرتی نظر آتی ہیں کہ مملکت پاکستان میں تعلیمی نظام میں ہر جانب سے بہتری لائی جائے۔

حکومت پاکستان کے آرڈیننس کے تحت ستمبر 2001ء میں ''پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ بات واضح ہے کہ حکومتی مدرسہ بورڈ کے قیام کے پیچھے اس کی کڑیاں ماضی میں آنے والی حکومتوں سے جاملتی ہیں اور پھر یہ کہ ماضی میں مختلف حکومتوں کی جانب سے بنائی جانے والی مجوزہ تعلیمی کمیٹیاں، کمیشن، ادارے (جن میں مقتدر علمائے کرام، محققین، اسکالرز کی موجودگی) ہی ''پاکستان مدرسہ ایجوکیشن بورڈ'' کے قیام کا ایک تسلسل ہے۔ موجودہ صورت حال میں پاکستان میں بڑھتی مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے تناظر میں حکومت کی جانب سے مدارس میں نصاب سازی کے حوالے سے وزارت مذہبی امور میں ایک اہم اجلاس منعقد کیا گیا تھا جس میں اتحاد تنظیمات مدارس کے سربراہان سمیت چاروں صوبوں کے ماہرین تعلیم بھی شریک تھے، اجلاس میں وفاقی

وزیر مذہبی امور سردار محمد یوسف، وفاقی وزیر تعلیم بلیغ الرحمٰن اور وزیر مملکت برائے مذہبی امور پیر سید امین الحسنات شاہ بھی موجود تھے۔ نصاب کی اصلاحات اور تجاویز مرتب کرنے کے حوالے سے بلائے گئے اس اجلاس میں اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ دینی مدارس اور عصری تعلیمی اداروں میں نصاب سازی میں بہتری کے حوالے سے کوششیں تیز کی جائیں تاکہ ملک میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے عفریت سے نمٹا جا سکے۔ اتحاد تنظیماتِ مدارس کے مفتی منیب الرحمٰن، مولانا حنیف جالندھری، مولانا عبدالمالک، ڈاکٹر یاسین ظفر اور ڈاکٹر نیاز حسین نقوی جیسے سنجیدہ اور متین شخصیات نے حکومت کو مدارس میں اصلاحات کے حوالے سے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ علمائے کرام نے مدارس میں بہتر تعلیمی نصاب، رجسٹریشن کا مسئلہ یا ملک میں دہشت گردی، انتہا پسندی جیسے مسائل کو حل کرنے میں حکومت کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان علمائے کرام کی ایسی مثبت فکر کو سراہنا چاہیے اور حکومت پاکستان کی نصاب میں بہتری کے حوالے سے حکومتی مدرسہ بورڈ کو فعال کیا جائے۔ تاکہ وہ معاشرے میں انتشار کے خاتمہ کے لئے اپنا کردار ادا کر سکے۔

پاکستان میں چار بڑے مسالک کے الگ الگ مدرسے ہیں۔ بریلوی، اہلحدیث، دیوبندی اور شیعہ، اس بات کا تصور ہی محال ہے کہ کسی ایک مسلک کا استاد کسی دوسرے مسلک کے مدرسے میں بطور معلم خدمات انجام دے سکے، یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شیعہ عالم کسی دیوبند مدرسے میں بطور پروفیسر تعینات ہو۔ اسی طرح جو بچہ پہلے دن جس مدرسے میں بھیجا جاتا ہے۔ یہ بات اسی روز طے ہو جاتی ہے کہ وہ اسی مسلک کے مدرسے کا عالم بن کر نکلے گا، ایسا کوئی ماحول یا کوئی طریقہ کار نہیں کہ ایک طالب علم کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ تمام مسالک کا مطالعہ کرے، ان کا تقابلی جائزہ پیش کرے، ایسے کسی موضوع پر مقالہ لکھے اور پھر علمی انداز میں کسی نتیجے پر پہنچے کہ فلاں مسلک درست ہے لہٰذا میں اسی کا پیروکار ہوں، دیوبندی مسلک سے فارغ التحصیل علماء آج تک اسی پر کاربند ہیں اور بریلوی مکتبہ فکر والے

مدرسے میں داخلہ لینے والے بریلوی عالم ہی بن کر نکلتے ہیں، آج تک اس کا الٹ نہیں ہوا حالانکہ جس عمر میں ان کا مدرسے میں داخلہ کروایا جاتا ہے اس وقت ان کا کوئی مسلک نہیں ہوتا! نتیجہ صاف ظاہر ہے، اوائل عمری سے ہی آزاد سوچ ختم ہو جاتی ہے اور پھر خیالات میں اس قدر سختی آ جاتی ہے کہ مخالف مکتبہ فکر کے حامل شخص کو کافر کہنے سے کم پر بات نہیں ٹلتی۔

ان مدارس کی علمی فضیلت وفوقیت کے دعوؤں کی علی الزغم ان کے فارغ التحصیل "علما" کے مبلغ علم کا اندازہ ان کی نماز جمعہ سے قبل کی تقریروں اور نماز کے بعد کی دعاؤں سے لگایا جاسکتا ہے۔ان تقریروں کا مواد جو تمام تر روایتوں اور فضائل کے ذکر پر مبنی ہوتا ہے سامعین کو اپنی طرف راغب کرنے کے بجائے انہیں دین سے بدظن ہی کرتا ہے۔دنیا کے مسائل، انسانی معاملات، معاشرتی آداب اور اخلاقی محرکات کا دین کے علم کی روشنی میں تجزیہ کرنا، جو اس اجتماع کا مفید ترین مقصد ہو سکتا ہے، نہ اُس کا مطمح نظر ہوتا ہے اور نہ وہ اس کے اہل ہوتے ہیں۔ان کا شماریات کا علم بس یہاں تک محدود ہے کہ فلاں دن روزہ رکھو تو ایک سال کے روزوں کا ثواب ملے گا، مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں پہلے رکھو تو اتنا ثواب، فون پر "ہیلو" کے بجائے "السلام وعلیکم" کہو تو اتنی نیکیاں، سلام کرنے میں پہل کرو تو اتنا اجر وغیرہ وغیرہ۔ان کے ہاتھوں اعداد وشمار کے اس گورکھ دھندے نے دین کو مذاق بنا کے رکھ دیا ہے۔

اس وقت وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر انتظام 18,677 مدارس و جامعات کام کر رہے ہیں، ان مدارس میں 108,064 اساتذہ ہیں جبکہ 2,304,512 طلبا زیر تعلیم ہیں، اب تک فارغ التحصیل ہونے والے علماء کی تعداد 119,892 ہے، عالمات کی تعداد 150,028 جبکہ حفاظ کی تعداد 925,192 ہے (یہ صرف ایک مسلک کے مدارس کے اپنے اعداد وشمار ہیں اور اس میں غیر رجسٹرڈ مدارس شامل نہیں)۔اتنی بڑی تعداد میں علماء اور صالحین پیدا کرنے کے باوجود ہمارے معاشرے میں

وہ تمام گھناؤنے جرائم (جن کی تفصیل لکھنے کے لئے پوری کتاب درکار ہے) کیوں ہوتے ہیں جن کا غیر مسلم معاشروں اور دیگر ملکوں کی مسلم معاشروں میں جہاں اتنی بڑی تعداد میں مدرسے کام نہیں کررہے، وجود نہیں ہے؟ ان لاکھوں فارغ التحصیل طلباء میں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے دینی میدان میں ہی سہی کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہو، کوئی ایسی تحقیق کی ہو، جسے بین الاقوامی سطح پر پذیرائی ملی ہو؟ سائنس، طب انفارمیشن ٹیکنالوجی، قانون، اکاؤنٹنگ، بزنس ایڈمنسٹریشن، ان شعبوں سے اگر مدارس کے طلبا کا کچھ لینا دینا نہیں تو پھر مدارس سے سند حاصل کرنے کے بعد ان کے پاس اپنے خاندان کی کفالت کرنے یا معاشرے میں کوئی تعمیر سرگرمی سرانجام دینے کے کیا امکانات باقی بچتے ہیں؟

مدارس کا مسئلہ

معروف محقق، دانشور اور کہنہ مشق صحافی خورشید ندیم "روزنامہ دنیا" میں "تکبیر مسلسل" کے نام سے کالم "مدارس کا مسئلہ" میں لکھتے ہیں۔

فطرت سے ہم آہنگی ہی میں سلامتی ہے۔ فطری مطالبات کے سامنے بند باندھا جاسکتا ہے نہ انہیں بے مہار چھوڑا جاسکتا ہے۔ الہام اور عقل دونوں کا فیصلہ یہی ہے۔

مذہب انسان کا فطرتی مطالبہ ہے۔ مذہبی تعلیم و تربیت اسی مطالبے کا جواب ہیں۔ اس کی ضرورت سے انکار ممکن نہیں۔ بایں ہمہ اسے ضوابط سے آزاد بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان بننے کے بعد لازم تھا کہ ریاست سماج کے اس فطرتی مطالبے کے لئے کوئی ضابطہ بناتی۔ جب ایسا نہیں ہوا تو سماج نے اپنے تئیں اس فطرتی مطالبے کا جواب تلاش کیا ہے۔ اس نے ان دینی مدارس کو مرنے نہیں دیا جو قیام پاکستان سے پہلے اسی فطرتی ضرورت کے تحت وجود میں آئے تھے۔ ریاست پاکستان نے نہ صرف اپنے کردار سے صرف نظر کیا بلکہ 1979ء میں ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ان کے کردار کی تشکیل نو کی۔ دینی

مدارس اصلاً اس کام کے لئے بنے نہیں تھے، ریاست نے انہیں جس کام پر لگا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا ایک نیا کردار سامنے آیا۔ بعداز خرابی بسیار ریاست کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اب وہ چاہتی ہے کہ مدارس اپنے اصل کردار کی طرف لوٹ جائیں۔ وہ مگر نہیں جانتی کہ یہ کیسے ہوگا۔ مدارس کو یہ پریشانی لاحق ہے کہ واپسی کے اس سفر میں کہیں ان کا وجود تحلیل ہی نہ ہو جائے۔ یوں بقا کے فطرتی داعیے کے تحت وہ مزاحمت پر آمادہ ہیں۔ ایک غلطی دوسری کو جنم دے رہی ہے۔ قومی اتحاد کا تاثر اب خطرات میں گھر چکا ہے۔

اس ملک کی 97 فیصد آبادی مسلمان ہے۔ جہاں اس کی مادی ضروریات ہیں، وہاں روحانی بھی ہیں۔ ریاست کا کام یہ ہے کہ وہ ان دونوں ضروریات کا خیال رکھے۔ اس کا ادراک ایک سیکولر ریاست کو بھی ہوتا ہے۔ ریاست اسلامی ہو یا سیکولر، اس کا اصل وظیفہ عوامی ضروریات کی تکمیل ہے۔ پاکستان کو جہاں سائنس دانوں، انجینئرز، دیگر مادی علوم کے ماہرین کی حاجت تھی وہاں علمائے دین کی بھی ضرورت تھی۔ ریاست نے جہاں جہاں پنی ذمہ داری ادا نہیں کی، وہاں قانون فطرت کے تحت ایک متبادل وجود میں آ گیا۔ عمومی تعلیم، مثال کے طور پر ریاست کی ذمہ داری تھی۔ ریاست جب بڑھتی آبادی کی یہ ضرورت پوری نہ کر سکی تو نجی تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔ یہی معاملہ دوسرے شعبوں میں بھی رہا۔ تاہم ان امور میں ریاست نے ایک اور طرح سے اپنی ذمہ داری ادا کی۔ اس نے یہ خیال رکھا کہ نجی شعبہ عوامی مفادات سے ہم آہنگ رہے۔ اگر ایک اسکول قائم ہونا ہے تو اس کے لئے قواعد وضوابط بنا دیئے۔ ایک کارخانہ لگتا ہے تو اس کے لئے نگرانی کا ایک نظام وضع کر دیا۔ دینی تعلیم کے معاملے میں اس ذمہ داری کو جب ادا نہیں کیا گیا تو جس کا جہاں دل چاہا، اس نے مدرسہ قائم کر دیا۔ جس کے جی میں آیا، مسجد کھڑی کر دی۔ ریاست اس بات کو نہیں سمجھ سکی کہ جس طرح انسانوں کے جسمانی معاملات کو عطائیوں کے حوالے کر دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ بیماریوں کا پھیلنا ہے، اسی طرح جب دین کو نااہل لوگوں کے حوالے کر دیا

جائے تو سماج کا روحانی اور نفسیاتی وجود برباد ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہ حادثہ ہو گیا۔ یہ معاشرہ نفسیاتی مریض بن گیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ مذہب کا سوئے استعمال ہے۔ اگر یہ معاملہ عطائیوں کے بجائے، دین کے جید علما کے ہاتھ میں رہتا تو آج مذہب سماج میں خیر کی علامت ہوتا۔

ریاست اس مسئلے کو سادہ طریقے سے حل کر سکتی تھی۔ ملک میں بنیادی بارہ سالہ تعلیم کا ایک نظام ہوتا۔ اس کے بعد خصوصی تعلیم سے جس طرح ڈاکٹر اور انجینئر بنتے ہیں، اسی طرح پانچ سالہ دینی علوم کی تحصیل سے علما تیار ہوتے۔ جس طرح ڈاکٹر اور دوسرے ماہرین سماج کی مادی ضروریات کو پورا کرتے ہیں، اسی طرح علما دینی ضروریات کو پورا کرتے۔ یوں سماج میں طبقات وجود میں آتے نہ گروہی تقسیم ہوتی۔ جب اس سادہ طریقے سے صرف نظر کیا گیا تو مسائل نے جنم لیا، جواب لاینحل ہو چکے۔

جب ادراک ہوا تو معاملہ سرکاری افسروں کی حوالے کر دیا گیا۔ وہ سماجی حرکیات سے واقف ہیں نہ دینی علوم سے۔ یوں ان کے تجویز کردہ حل مسائل کو مزید پیچیدہ بنا رہے ہیں۔ جیسے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ دینی مدارس میں کمپیوٹر کی تعلیم دی جائے یا انگریزی پڑھائی جائے۔ کمپیوٹر یا زبان تو آلات ہیں۔ ان کے علم سے مدرسے کا کردار کیسے بدلے گا، اگر اس کی سوچ کا زاویہ تبدیل نہیں ہوتا۔ یوں ہر حکومتی اقدام، مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، کا مصداق بن گیا۔ موجودہ حکومت بھی اسی کشمکش کا شکار دکھائی دے رہی ہے۔

سادہ حل کا موقع اب ہاتھ سے نکل چکا۔ دینی تعلیم اور ضروریات کو ریاستی نگرانی سے آزاد کرنے کے نتیجے میں اربوں روپے کی 'مذہب کی معیشت' وجود میں آ چکی۔ یہ معیشت کیا ہے، اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ مجھے ایک باخبر دوست نے بتایا کہ کراچی میں مدارس ٹھیکے پر دیئے جاتے ہیں۔ ایک ٹھیکہ لاکھوں روپے کا ہوتا ہے۔ جہاں معاملہ معاشی ہو جائے وہاں مفاداتی گروہ (Interest Groups) وجود میں آتے ہیں۔

جب حکومت اس معیشت کو ختم کرنا چاہتی ہے تو یہ گروہ اپنی بقا کی جنگ لڑتے اور مزاحمت کرتے ہیں۔ آج مدارس کے معاملے میں یہی ہو رہا ہے۔ ان حالات میں، میں اصلاح احوال کے لئے چند اقدامات تجویز کرتا ہوں۔

1- حکومت موجود دینی مدارس کے نصاب، ماحول، امتحانات کے بارے میں ایک قانون بنائے اور اس پر سختی سے عمل کرایا جائے۔ اس قانون سازی کے لئے دینی اداروں کے ذمہ داران سے مشاورت کی جائے۔ مشاورت سے مراد ہدایات لینا نہیں ہے بلکہ ان کے جائز خدشات کو مخاطب بنانا ہے۔ یہ قانون سازی حکومت کا اخلاقی اور قانونی استحقاق ہے۔

2- مدارس کے فارغ التحصیل لوگوں کے لئے خصوصی تربیتی کورسز کا اہتمام کیا جائے تا کہ وہ سماج میں اجنبی نہ رہیں۔

3- نئے دینی مدرسے کے قیام کے لئے الگ سے ضابطہ بنایا جائے۔ اس کی بنیاد اس تصور پر ہو کہ بالآخر قوم کو یکساں بنیادی تعلیم کی طرف لے جانا ہے۔ جب ریاست یکساں نظام تعلیم قائم کر دے تو نئے مدرسے کے قیام پر پابندی لگا دی جائے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے ادارے البتہ قائم کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ تاہم اس کے لئے ایسے قوانین بنا دیئے جائیں جیسے ایک نئی یونیورسٹی کے چارٹر کے لئے ضروری ہیں۔

4- جدید تعلیم کے اداروں کو بھی سختی سے قانون کا پابند بنایا جائے تا کہ یہ تاثر قائم نہ ہو کہ حکومت مدارس کے بارے میں کسی تعصب کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

5- مدارس کے اساتذہ اور مسجد کے خطباء کے لئے ایک تعلیمی معیار مقرر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ان کے مشاہرے کا بھی تعین کیا جائے۔ جو مدرسہ اپنے اساتذہ کو اس معیار سے کم تنخواہ دے اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ اسی طرح مساجد کے بارے میں یہ طے کیا جائے کہ ان کا انتظام کس کے پاس ہوگا اور امام وخطیب کو کس طرح تنخواہ ملے گی۔

6- یہ طے کیا جائے کہ مدارس کا معاملہ کس وزارت کی ذمہ داری ہے۔ اصولاً تو اسے وزارت تعلیم کے حوالے کیا جانا چاہئے۔

اصل مسئلہ ریاست کا ذمہ دار اور انتظامیہ کا فعال ہونا ہے۔ اسلام آباد جیسے شہر میں غیر قانونی طور پر، سرکاری جگہ پر مسجد تعمیر ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ایک دن میں نہیں ہوتا۔ اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے یہاں تک کہ مسجد کی تعمیر مکمل ہو جاتی ہے۔ اگر اب بھی اس تساہل اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ ہوا تو حکومت کو نوشتہ دیوار ابھی پڑھ لینا چاہئے۔

دینی جماعتوں کا موقف

اسلام کے نام پر تکفیر اور قتل وقتال کی روایت بہت پرانی ہے، قتل وقتال روکنے کے لئے ہمیشہ علمائے حق نے اپنا کردار ادا کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ علماء کا نام نامی سے بھری پڑی ہے، یہاں میں ایک مثال پیش کروں گا۔ تاریخ میں اسلام کے ایک نام نہاد مجاہد اسلام ضحاک کا نام آتا ہے یہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا زمانہ تھا۔ ضحاک بڑا ظالم اور سفاک شخص تھا۔ اس نے عراق کے شہر کوفہ پر قبضہ کر لیا اور یہ اعلان کر دیا کہ جو شخص میری اطاعت نہیں کرے گا اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ اس ظالم شخص کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اعلان کیا کہ جب تک کوئی مسلمان اپنا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب قبول نہ کر لے اسے مرتد قرار نہیں دیا جا سکتا اور ایسے شخص کو قتل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی پراثر اور دلائل پر مبنی باتیں سننے کے اور ضحاک جیسا ظالم شخص بھی قائل ہو گیا اور اس نے قتل عام کا جو حکم دیا تھا وہ روک دیا گیا۔

ہمارے ملک میں گزشتہ 12 سال سے قتل وقتال کا سلسلہ جاری ہے اور ہمارے علماء کرام خاموش ہیں۔ ہمارے جید علماء کرام کو شہید کر دیا گیا کیونکہ انہوں نے خودکش حملوں کو حرام قرار دے دیا تھا۔ علماء کی شہادت کے بعد بہت سے علماء نے خاموشی اختیار کر لی،

ریاست بھی علماء کرام کو تحفظ دینے میں ناکام رہی۔ اب علماء کرام سمیت پوری قوم کے تحفظ کا بیڑا جب پاکستان کی مسلح افواج نے اٹھایا ہے تو بعض علماء اور دینی جماعتیں قومی ایکشن پلان، فوجی عدالتوں کے قیام اور 21ویں آئینی ترمیم کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ حالانکہ وزیراعظم نواز شریف، چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل شریف، بطور ادارہ پاک فوج بار بار یہ یقین دلا رہے ہیں کہ یہ عدالتیں دہشت گردی کے مقدمات کی سماعت تک محدود ہوں گی اور ان کی مدت دو سال ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدام غیر معمولی حالات کے تحت اٹھایا گیا جسے ہم حالات کے جبر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن سمجھتے ہیں کہ 16 دسمبر کے سانحہ پشاور کو ملک کی مذہبی سیاسی جماعتوں، تنظیموں اور مدارس کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہم نے آرمی ایکٹ میں ترمیم کا گناہ قبول کیا۔ بادل نخواستہ مفاہمت و مطابقت کی خاطر 21ویں آئینی ترمیم کا گناہ قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مولانا کو اعتراض ہے کہ اکیسویں ترمیم کے متن میں مذہب اور مسلک کے نام پر دہشت گردی کو ہدف بنایا گیا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف بلائی گئی اے پی سی میں پورا ملک متحد تھا مگر آئینی ترمیم اور قومی ایکشن پلان میں مذہب اور دینی مدارس کو ڈال کر اس عظیم اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ اکیسویں آئینی ترمیم سے ایک مذہبی طبقے کو ٹارگٹ کرنے کا تاثر ملتا ہے۔

پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں 21ویں آئینی ترمیم کی منظوری اس لحاظ سے متفقہ تھی کہ ایوان میں موجود کسی رکن نے اس کی مخالفت میں ووٹ نہیں دیا تھا۔ جمعیت علمائے اسلام (ف) اور جماعت اسلامی نے ایوان میں رائے شماری کا حصہ بنے (حمایت یا مخالفت) کی بجائے Abstain کیا (گریز کا راستہ اختیار کیا)۔ ظاہر ہے، یہ مخالفت سے کم تر معاملہ تھا......اور یوں 21ویں آئینی ترمیم کی ''اتفاق رائے سے منظوری'' کا راستہ ہموار ہوا۔

بعدازاں مولانا کی دعوت پر اسلام آباد میں مذہبی جماعتوں کا اجتماع ہوا جس میں مشرف

دور کی متحدہ مجلس عمل کی جماعتوں نے شرکت کی۔ یہ وہی جماعتیں ہیں جنہوں نے پرویز مشرف کے ایل ایف او یعنی سترہویں آئینی ترمیم کی حمایت کر کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا تھا۔

امیر جماعت اسلامی سراج الحق کا فرمانا ہے کہ مساجد اور علماء کی توہین نا قابل برداشت ہے۔ اب بھی اگر ملک میں مکمل اسلامی نظام نافذ کر دیا جائے تو پاکستان کے تمام مسائل ختم ہو جائیں گے اور دہشت گردی کی لہر بھی خود بخود دم توڑ دے گی۔ انصار امہ کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن خلیل فرماتے ہیں کہ سانحہ پشاور کو بنیاد بنا کر کسی ایک مکتبہ فکر یا مساجد و مدارس کے خلاف مہم شروع کرنا قابل مذمت عمل ہے۔ چوہدری شجاعت حسین فرماتے ہیں کہ مدارس کے طالب علموں کو تخریب کار کہہ کر بلانا یا انہیں تخریب کاری کا نام دینا درست نہیں، جب میں وزیر داخلہ تھا تو ہماری اطلاعات کے مطابق پاکستان کی حدود میں ایسا کوئی مدرسہ نہیں تھا جو بچوں کو تخریب کاری کی تربیت دیتا ہو۔ وفاق المدارس العربیہ کے ناظم اعلیٰ قاری حنیف جالندھری کہتے ہیں کہ کچھ قوتیں حکومت اور مدارس کے درمیان تصادم کرنا چاہتی ہیں۔ حکومت مدارس کو ہراساں کرنا بند کرے۔ ان سے کوائف طلب کئے جا رہے ہیں، قومی ایکشن پلان سے مدارس کا لفظ حذف کیا جائے۔ حکومت کے ساتھ مذاکرات کے نتیجے میں طے پانے والے معاہدے سے ہٹ کر کوئی اقدام کرنے کی کوشش کی گئی تو اہل مدارس قبول نہیں کریں گے۔

ان گنت شواہد موجود ہیں کہ دہشت گردوں کی بڑی تعداد مدارس کے موجودہ یا سابق طالب علموں پر مشتمل ہے، جہاں ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لئے ان کی برین واشنگ کی گئی۔ دہشت گردی کے لاتعداد واقعات میں انکشاف ہوا کہ دہشت گردوں نے جرم سے قبل اور بعد میں مذہبی مدارس میں پناہ حاصل کی۔

مذہبی سیاسی جماعتوں کی طرف سے ایک مشترکہ لائحہ عمل مرتب کرنے کے لئے علیحدہ سے پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونے کا عزم بھی کوئی خوش آئند پیشرفت نہیں۔ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور ہمارا مذہب امن و سلامتی کا درس دیتا ہے۔ دینی مدارس کی اکثریت معاشرے

میں اسلامی تعلیمات کی ترویج کے لئے ایک انتہائی اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ پاکستان میں بالخصوص اور دنیا بھر میں بالعموم دہشت گردی کو مذہب سے منسوب کیا جاتا ہے اور یہ بعض عناصر کی طرف سے اسلام جیسے عالمگیر دین کے غلط استعمال کی وجہ سے ہوا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قومی یکجہتی کی اس فضا کا اثر زائل نہ ہونے دیا جائے اور دہشت گردی کے خلاف اس قومی جنگ کو منطقی انجام تک پہنچایا جائے مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ معاشرے کا ہر طبقہ یکجا ہو اور کسی قسم کے ذاتی یا گروہ مفاد سے بالاتر ہو کر سوچا جائے۔ پاک فوج یہ جنگ انتہائی جانفشانی اور بہادری سے لڑ رہی ہے اور ہم سب کو مل کر اپنی فوج کا ساتھ دینا چاہیے۔ اکیسویں آئینی ترمیم ایک فوری وقتی ضرورت تھی جس کا ہر کسی کو احساس ہونا چاہیے۔ وکلاء تنظیموں کو بھی اپنے ماحول سے بالاتر ہو کر سوچنے کی ضرورت ہے۔ فوجی عدالتوں کا قیام عدلیہ پر عدم اعتماد نہیں بلکہ ملک کے معروضی حالات کی بدولت عدلیہ کی معاونت ہے کیونکہ سب کا مقصد انصاف کی فوری فراہمی ہے۔ جب دو سال کے بعد یہ آئینی ترمیم غیر موثر ہو جائے گی تو اندازہ ہو سکے گا کہ ہم اپنے مقاصد کس حد تک حاصل کر سکے ہیں۔

تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان کے صدر مفتی منیب الرحمٰن جیسی معتدل شخصیت کا شکوہ ہے کہ 21ویں آئینی ترمیم میں دہشت گردی کے دیگر تمام عوامل و اسباب نظر انداز کر کے صرف مدارس، مذہب و مسلک کو ہدف بنانا ملکی حالات کو تباہی کی طرف لے جانے کے مترادف ہے۔ اگر حکومت اور اسٹیبلشمنٹ نے ہمارے مطالبات پر توجہ نہ دی تو عملی اقدام کرنے پر مجبور ہوں گے۔ حکومت نے فوری طور پر معاملات کو سنجیدگی سے نہ لیا تو ملک میں 1977ء کی پی این اے تحریک جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے۔ اس حساس مسئلے پر مسلح افواج، حساس اداروں کی سربراہان دیگر طبقات کی طرح ہم سے بھی مکالمہ کریں وہ 28 فروری 2014ء کو دارالعلوم جامعہ نعیمیہ میں پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ اس موقع پر علامہ جمیل احمد نعیمی، مفتی محمد رفیق حسنی، علامہ غلام دستگیر عثمانی، مفتی جان نعیمی اور

دیگر بھی موجود تھے۔ مفتی منیب الرحمٰن نی کہا کہ مدارس اور مذہب کے بارے میں اس طریقے کے اقدامات اسٹیبلشمنٹ کی منفی سوچ کی آئینہ دار ہے۔ حکومت صرف دعوے نہ کرے بلکہ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے عملی اقدامات کرے اس حساس مسئلے پر مسلح افواج، حساس اداروں کے سربراہان و دیگر طبقات کی طرح ہم سے بھی مکالمہ کریں۔ مدارس پر الزامات لگانے کی پالیسی سے گریز کیا جائے۔ عوام کو فوجی عدالتوں کی کارکردگی اور نتائج کا انتظار ہے۔ مفتی منیب الرحمٰن نے کہا کہ ہم نے دہشت گردی کے خلاف ہر مہم اور پروگرام کی حمایت کی، اسی طرح اکیسویں آئینی ترمیم کے نتیجے میں قائم کی جانے والی فوجی عدالتوں کی بھی حمایت کی، کیونکہ بوجوہ ہمارا نظام عدل دہشت گردوں کو ٹھکانے لگانے میں ناکام رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے پنجاب میں اور اب بطور خاص اندرون سندھ بلا امتیاز علماء اور اہل مدارس کو پریشان اور ہرساں کیا جارہا ہے۔ کہیں بلا جواز علماء کے خلاف ایف آئی آر کاٹی جارہی ہیں اور بعض مقامات پر مدارس کو بند کرنے کے واقعات بھی رپورٹ ہوئے ہیں۔ ہم حکومت اور اس کے تمام ذمے داران سے مطالبہ کرتے ہیں کہ بلاجواز اور بلاامتیاز اہل مدارس اور علماء کو ہراساں کرنے کا سلسلہ بند کیا جائے، اس کا ردعمل دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑنے کے بنیادی مقصد کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہماری حکومت سے اپیل ہے کہ خدارا ہوش سے کام لیجیے۔ ہم دینی مدارس کی پانچوں تنظیمات کی طرف سے ایک اقرار نامہ حکومت کو دے چکے ہیں کہ حکومت کے پاس اگر ثبوت وشواہد ہیں تو وہ بلاتاخیر ایسے مدارس یا افراد کی فہرست جاری کرے، ہم حکومت کے ساتھ کھڑے ہوں گی، لیکن مبہم انداز میں ہر خرابی کو بلاتعین مدارس سے منسوب کرنا کسی بھی صورت قابل قبول نہیں ہے۔ مفتی منیب الرحمٰن کا مزید کہنا تھا کہ تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان سے ملحق کوئی ایک مدرسہ بھی دہشت گردی یا ریاست کے منافی کسی سرگرمی میں ملوث نہیں ہے اور نہ کبھی ایسا کوئی الزام لگا ہے، اس لئے امن پسند لوگوں کو بلاوجہ پریشان کرنا

اشتعال کا سبب بنے گا۔ تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان کے صدر مفتی منیب الرحمٰن نے کہا کہ دینی مدارس کا ڈیٹا جمع کرنے کا طریقہ کار بھی حکومت کے ساتھ باہمی مذاکرات سے جلد طے ہو جائے گا اور اس پر بلا تاخیر عمل درآمد بھی شروع ہو جائے گا۔ اسی طرح جو مدارس پہلے سے قائم ہیں اور وہ رجسٹرڈ نہیں ہیں، انہیں رجسٹریشن کی تکمیل کے لئے مناسب وقت دیا جائے گا۔ انہوں نے حکومت اور آئی جی سندھ سے مطالبہ کیا کہ علماء کے خلاف بلا جواز جو رپورٹیں درج کی گئی ہیں یا ایف آئی آر کاٹی گئی ہیں، انہیں واپس لیا جائے۔ ہم حکومت کو پیشکش کرتے ہیں کہ ایک مشترکہ جائزہ کمیٹی بنائی جائے اور بے قصور لوگوں کو نہ چھیڑا جائے اور قصوروار لوگوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ اذان، خطبے اور صلوٰۃ و سلام کے لئے لاؤڈ اسپیکر پر پابندی برداشت نہیں کی جائے گی۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم پہلے مرحلے میں پریس کانفرنس کر کے اسٹیبلشمنٹ کو متوجہ کر رہے ہیں اگر ہمارے مطالبات پر کان نہ دھرے گئے تو عملی اقدامات کرنے پر مجبور ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ وفاقی وزیر داخلہ چوہدری نثار کی مبہم انداز میں کی جانے والی باتوں کی مذمت کرتے ہیں۔

16 دسمبر 2014ء کے سانحے کے بعد دہشت گردی کے خلاف پہلی بار قومی و ملی اتفاق رائے پیدا ہوا، اب جبکہ سفاک قاتلوں اور دہشت گردوں کی سزائے موت کا سلسلہ شروع ہوا اور سریع العمل (Spedy) فوجی عدالتوں کی نوید سنائی گئی ہے تو قوم میں امید کی کرن پیدا ہوئی ہے کہ شاید جلد یا بدیر وطن عزیز کو دہشت گردی سے نجات مل جائے۔ لیکن اس دوران پہلے پنجاب میں اور اب بطور خاص اندرون سندھ بلا امتیاز علما اور اہل مدارس کو پریشان اور ہراساں کیا جا رہا ہے، بلا جواز علما کے خلاف ایف آئی آر کاٹی جا رہی ہیں، بعض مقامات پر مدارس بند کرنے کے واقعات بھی رپورٹ ہوئے ہیں۔ ہم حکومت اور اس کے تمام ذمے داران سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اہل مدارس اور علماء کو ہراساں کرنے کا سلسلہ بند کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ اتحاد تنظیمات مدارس پاکستان اور حکومت کے درمیان یہ بھی

طے پا چکا ہے کہ مدرسے کا اطلاق اس ادارے پر ہوگا جو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ قیام و طعام (Boarding & Lodging) کی سہولتیں طلبا و طالبات کو فراہم کرتا ہو، انہی مدارس پر رجسٹریشن کی پابندی کا اطلاق ہوتا ہے۔ جہاں حفظ و ناظرہ اور بنیادی دینی تعلیم دی جاتی ہے، طلبا و طالبات دن میں آتے ہیں اور پڑھ کر چلے جاتے ہیں ان مکاتب پر رجسٹریشن کے قانو کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جب ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ خوف و ہراس کس کے حکم پر پھیلایا جارہا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے کوئی ہدایات نہیں دیں۔ جبکہ وزیر اعلیٰ سندھ سید قائم علی شاہ فرماتے ہیں کہ دینی مدارس کے حوالے سے قانون سازی ہو رہی ہے جس کے تحت مدارس میں پولیس اور رینجرز کو چھاپوں اور تلاشیوں کا اختیار حاصل ہوگا۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ حکومت اور دینی مدارس کے اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ میں باہمی مشاورت سے کوائف نامہ ترتیب دینے پر اتفاق ہوگیا۔ یہ طے پایا ہے کہ حکومت اور تنظیمات مدارس دینیہ اور حکومت اپنی اپنی سطح پر کوائف نامہ ترتیب دیں گی۔ کوائف نامے میں طلبا کی تعلیمی معلومات اور دیگر معلومات مرتب کی جائیں گی۔ مدارس کی از سرنو رجسٹریشن کی جائے گی۔ اس ضمن میں تنظیمات مدارس دینیہ اور حکومت کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ جاری ہے اور مدارس میں زیر تعلیم غیر ملکی طلباء کے بارے میں حکومت کو نرم گوشہ رکھنے کی تجویز پیش کی گئی ہے کہ جن غیر ملکی طلباء کا تعلیمی سلسلہ مکمل ہونے کو ہے اور ان کا ویزا ختم ہونے والا ہے، ایسے طلبا کے ویزا کی میعاد تعلیمی سلسلہ مکمل ہونے تک بڑھائی جائے اور ایسے غیر ملکی طلبا جو قانونی تقاضے مکمل کرنے کے بعد حصول علم کے تحت پاکستان آئے ہیں ان کو سہولیات فراہم کی جائیں۔

جماعت اسلامی کے ہیڈ کوارٹر منصورہ (لاہور) میں ہونے والے وفاق المدارس کے اجلاس کے بعد متفقہ اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ مدارس کے خلاف اگر نیشنل ایکشن پلان کی آڑ میں حکومت نے اقدامات کیے تو اس کی سخت مزاحمت کی جائے گی اور

عالمی استعماری ایجنڈے پر عمل پیرا حکومت کی غیر آئینی احکامات کو کسی صورت میں قبول نہیں کیا جائے گا۔ ہم نے وزیراعظم، چیف آف آرمی اسٹاف، وزیراعلیٰ پنجاب اور حساس اداروں کے سربراہوں کے نام خطوط لکھے لیکن ہمیں کسی طرف سے جواب نہیں ملا۔ تنظیمات مدارس نے تمام یورپی ممالک کے سفرا کو بھی ملاقات کے لئے خط لکھے ہیں اور ان خطوط میں درخواست کی گئی ہے کہ وہ مدارس سے متعلق ان کا موقف سنیں جس کے بعد مدارس سے متعلق حکمت عملی ترتیب دیں۔ ان خطوط میں لکھا گیا ہے کہ حکومت، فوج اور دیگر ادارے مدارس کے ضمن میں ہمیں تحفظات سے آگاہ کریں جبکہ ہم انہیں اپنے تحفظات سے آگاہ کریں گے۔ ان خطوط پر پانچوں وفاق کے زعماء قاری محمد حنیف جالندھری، مفتی منیب الرحمٰن، مولانا عبدالمالک، مولانا قاضی نیاز حسین نقوی اور مولانا یاسین ظفر کے دستخط ہیں۔ ذرائع کے مطابق مدارس کے زعماء مدارس سے متعلق تفصیلات سے آگاہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ تنظیمات مدارس کے ایک اہم رکن کے مطابق اس مسئلے پر شدومد اور مکمل جزئیات سے عوام کو آگاہ کرنے سے قبل ارباب اقتدار تک اپنا موقف پہنچانا چاہتے ہیں تاکہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو واضح رہے کہ نائن الیون کے بعد علماء نے تمام یورپین ممالک کے سفرا کے سامنے اپنے موقف پیش کیا تھا جس پر غیر ملکی سفارتکاروں نے واضح کر دیا تھا کہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں۔ مدارس کے زعماء اس طرز پر یورپی سفراء سے بھی ملاقات کریں گے۔

مدارس اور فرقہ بندی

اب آتے ہیں مذہبی فرقہ واریت پر۔ اللہ تعالیٰ نے انسان اور جنات کے لئے ایک ہی دین پسند فرمایا ہے اور وہ ہے اسلام۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''ان الدین عنداللہ الاسلام'' اسلام ہی اللہ کے ہاں اصل دین ہے۔ اس دین کی تکمیل کا سٹیفکیٹ بھی اللہ تعالیٰ نے ''الیوم اکملت لکم دینکم'' کی صورت میں حضور اکرم کو میدان عرفات کے آخری خطبہ کے ساتھ ہی

جاری کر دیا اور رسول کریمؐ لاکھوں افراد سے تین بار یہ گواہی لے کر اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنے رب کی طرف سے نازل ہونے والا دین پورا کا پورا انہیں پہنچا دیا۔ گویا جن چیزوں کے ماننے اور نہ ماننے پر مسلمان ہونے کا انحصار تھا ان سب کی تکمیل حضور نبی کریمؐ کی زندگی میں ہوگئی اور اس تکمیل ہی کی وجہ سے آپؐ کے بعد سلسلہ نبوت ختم کر دیا گیا۔ قرآن پاک میں چونکہ احکامات کے بارے میں زیادہ تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے اس لئے حضور پاکؐ نے احادیث مبارکہ میں اس کی تشریح کر ڈالی ہے لیکن حضور نبی کریمؐ کے وصال کے بعد احادیث مبارکہ کی تشریح میں پھر مختلف آرا سامنے آئیں جو بعد میں الگ الگ مسالک کی شکل میں سامنے آئیں جن میں مشہور امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ ہیں۔ ان چاروں کے علاوہ اور بھی مختلف مسالک سامنے آ گئے مثلاً شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی وغیرہ اور یہ سب اسلامی احکام کے تشریح میں اختلاف رائے کی وجہ سے وجود میں آئے جو کوئی قابل اعتراض بات نہیں کیونکہ اختلاف رائے خود خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی ہوتی تھی جن کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ پاکستان میں اس وقت مختلف فقہی اور فرقئی مدارس کی رجسٹرڈ تعداد پچیس ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے جن کا انتظام انصرام ونصاب پانچ بورڈز کے تحت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فرقہ واریت نہ بری بات ہے اور نہ اس کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہ صرف ہمارے ملک میں ہیں بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے مسلمان مختلف فقہی، مسالک اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور یہ فقہی اختلاف تیرہ چودہ صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ اس میں جو بری بات ہے وہ ہے فرقہ وارانہ سخت گیری اور فرقہ وارانہ تشدد جس کی وجہ سے مسلمانوں پر انگلیاں اٹھائی جا رہی ہیں اور اسی نے فرقہ واریت کو بھی بدنام کیا ہے حالانکہ فرقہ واریت اختلاف رائے کا دوسرا نام ہے جو کہ دوسرے کو اپنی رائے کے ماننے پر مجبور نہیں کرتا اور نہ ہی کسی دوسرے مسلک کو برا کہتا ہے مثلاً مذکورہ بالا چاروں اماموں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں

کہا ہے کہ فلاں مسلک برا ہے اس لئے اس پر عمل نہ کیا جائے یا ایک کا مسلک ماننے والا دوسرا مسلک اختیار نہیں کر سکتا کیونکہ یہ کفر اور اسلام کی بات نہیں ہے۔ کوئی شخص اگر حنفی مسلک ترک کر کے شافعی یا حنبلی مسلک اختیار کرے یا سرے سے غیر مقلد بن جائے تب بھی اس کے ایمان میں کچھ فرق نہیں آئے گا کیونکہ اس کا عقائد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ عقائد کا معاملہ حضور اکرمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہوا۔ بد قسمتی سے ان مکاتب فکر کے بعض ناعاقبت اندیش حضرات کوتاہ علمی کی وجہ سے اپنے ذوق اور پسند کے مطابق اپنے مکتبہ فکر کے مختلف حصوں کو منتخب کر کے ان پر بے جا اصرار کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی اس پر عمل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس معاملے میں اس قدر سخت گیر ہو جاتے ہیں کہ اس کو کفر اور اسلام کا معاملہ سمجھتے ہیں اور جو اس پر عمل نہیں کرتا اس کو واجب القتل سمجھتے ہیں۔ وہ اس پر ذرا بھر بھی نہیں سوچتے کہ جو انسان اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف نہیں جو اصل میں کفر اور اسلام کا معاملہ ہے تو صرف تشریحات میں فرق کی بناء پر وہ واجب القتل کیسے بن جاتا ہے۔ ستم کی بات تو یہ بھی ہے کہ ان کوتاہ علم اور اسلام کے غلط نمائندوں نے دین اور تاریخ کو بھی گڈمڈ کر دیا ہے اور لگتا ہے کہ یہ تاریخی واقعات بھی ان عقائد اسلام کی طرح ہیں جس سے انکار پر انسان کافر ہو جاتا ہے۔ ہماری اسلامی تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جس پر دل خون کے آنسو روتا ہے اور کئی ایسے سیاسی فیصلے ہوئے ہیں جس سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن وہ سب ہماری سیاست اور تاریخ ہے عقائد سے اس کا کوئی تعلق نہیں کہ جس کی بنیاد پر اس کو کافر قرار دیا جائے۔ ہمارے ملک پاکستان کو اسی سخت گیر فرقہ واریت کا سامنا ہے جو اکثر فرقہ وارانہ تشدد کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اسی نے ملک کے امن و امان کو برباد کیا ہے اور یہی ملک کے دامن پر بدنما داغ ہے۔ نہ مساجد امن میں ہیں اور نہ ہی امام بارگاہیں۔

پاکستان کی ریاست اور حکومت کے بقول دہشت گردی اور انتہا پسندی کا خاتمہ اب ان کی اولین ترجیح ہے۔ اسے بنیاد بنا کر جو بیس نکاتی ایجنڈا سامنے آیا ہے اس میں ایک اہم

نقطہ دینی مدارس کی اصلاح اور ان کا احتسابی عمل بھی ہے۔اس بنیادی نقطے پر ہمیں ریاست، حکومت اور دینی مدارس سے وابستہ قیادت اور مذہبی جماعتوں کے درمیان بداعتمادی نظر آتی ہے۔عموماً جب ریاست یا حکومت غیر معمولی اقدامات کی طرف بڑھتی ہے تو اس میں مختلف متعلقہ فریقین کے ساتھ مشاورت اور مشترکہ حکمت عملی کو فوقیت دی جاتی ہے۔مذہبی اور دینی مدارس کی قیادت کے بقول ہم دہشت گردی کی جنگ میں یقیناً حکومت اور فوج کے ساتھ کھڑے ہیں، لیکن دینی مدارس کے معاملے میں علماء کو اعتماد میں لینے کے بجائے تنہا پرواز کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔اس کوشش کا نتیجہ اعتماد سازی کے ماحول میں بداعتمادی کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ایسی معاشرہ جہاں حکمرانی کا بحران ہو، بڑے فیصلے عجلت یا کسی بڑے ردعمل کے نتیجہ میں بغیر ہوم ورک کے کیے جائیں تو اسے خواہشات کے باوجود مسائل حل نہیں بلکہ اور زیادہ بگاڑ کا شکار ہوجاتے ہیں۔پاکستان کا مسئلہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں جب ہم دہشت گردی سے نمٹنے کی نئی حکمت عملیوں کو ترتیب دے رہے ہیں تو ہمیں اصلاح کا عمل ہر جگہ سے شروع کرنا ہوگا۔اصلاح کے عمل میں دینی مدارس بھی شامل ہیں اور ان مدرسوں کو ہمیں کسی سیاسی تنہائی میں نہیں دھکیلنا چاہئے۔ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم بطور فریق اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ہمارا خیال ہوتا ہے کہ غلطی ہم میں نہیں بلکہ دوسرے فریقین میں ہے۔

مدارس پر کیے جانے والے اِن اعتراضات کے جواب عموماً یوں دیئے جاتے ہیں کہ کسی مدرسے میں شدت پسندی یا فرقہ واریت کی تعلیم نہیں دی جاتی، اگر مدرسے سے متعلق کوئی شخص ان جرائم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مدرسہ بند کردیا جائے کیونکہ جب کسی جدید یونیورسٹی کا گریجویٹ دہشت گرد پکڑا جاتا ہے تو وہ یونیورسٹی بند نہیں کردی جاتی۔دوسرا، معاشرے میں مکروہ جرائم کے ذمہ دار مدارس کے فارغ التحصیل علماء نہیں، وہ تو اپنا پیٹ کاٹ کر دین کی تبلیغ کا مقدس فریضہ انجام دیتے ہیں، ان جرائم اور بے راہ روی کی

وجہ یہ فرسودہ اور غیر اسلامی نظام ہے جہاں ظالم کی پکڑ نہیں، طاقتور کے لئے کوئی قانون نہیں اور اشرافیہ کو لوٹ مار کی کھلی اجازت ہے، جب تک اس نظام کو تبدیل نہیں کیا جاتا معاشرے میں بہتری کی کوئی امید نہیں اور جہاں تک دیگر شعبوں میں مہارت حاصل کرنے کا تعلق ہے تو جواب آتا ہے کہ جس طرح ہر شعبے کے لئے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دین کی ترویج کے لئے علماء کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت مدارس پوری کر رہے ہیں جو محض خدا کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہے تا کہ آخرت میں سرخرو ہوا جا سکے۔ جواب تو بظاہر مدلل ہیں، پھر خرابی کہاں ہے؟

مدارس کے نظام کا جائزہ لیا جائے تو ان سب کی بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ تقلید کے اصول پر قائم ہوئے ہیں۔ ان میں یہ بات پہلے دن سے طے کر دی جاتی ہے کہ حنفی ہمیشہ حنفی رہے گا اور اہلحدیث کو ہر حال میں اہلحدیث ہی رہنا ہے۔ اپنے دائرے سے باہر کے کسی صاحب علم کی کسی تحقیق اور رائے کے بارے میں یہ تصور کرنا بھی ان کے ہاں ممنوعات میں سے ہے کہ وہ صحیح ہو سکتی ہے۔ مذہب ابوحنیفہؒ کا کوئی پیرو آئمہ محدثین کے کسی مسلک کو، اور آئمہ محدثین کے طریقے پر عمل کرنے والا کوئی شخص مذہب ابوحنیفہؒ کے کسی نقطہ نظر کو کبھی ترجیح دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ہر جماعت مصر ہے کہ اس کا مذہب ہر اعتبار سے اوفق بالقرآن والسنۃ ہے اور اس پر اب کسی نظر ثانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی شخص، ان مدارس میں، یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ اس کے اکابر کی کوئی رائے اور تحقیق بھی کسی مسئلے کے بارے میں غلط ہو سکتی ہے۔

اس اصول پر ان مدارس سے پڑھ کر نکلنے والوں کی استقامت سے جو بگاڑ ہمارے معاشرے میں پیدا ہوا ہے، وہ کسی صاحب نظر سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ ہم صبح و شام دیکھتے ہیں کہ فرقہ بندی کا ناسور اس ملت کے جسم میں جاری اختلاف ہمیشہ اتفاق پر بھاری رہتا ہے۔ منبر ہمہ وقت غضب سے کانپتا اور محراب ترش ابرہ ہوتی ہے۔ مسجدوں کی حدود ملکوں کی

سرحدیں بن گئی ہیں اور ان میں رہنے والے ایک دوسرے سے کوئی تعلق قائم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ فقہی تعصبات دین کی عصبیت پر غالب آ گئے ہیں اور یہ لوگ ان کی حفاظت کے لئے اب بغیر کسی تردد کے ہر باطل کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

قومی ایکشن پلان کے 20 نکات میں سے نکتہ غیر دس میں کہا گیا ہے کہ "تمام مدارس کی تصدیق اور حکومت پاکستان کے قواعد وضوابط کا پابند کر کے ہی کام کرنے کی اجازت دی جائے گی۔" جب بھی مدرسہ ریفارم کی بات ہوتی ہے تو سب سے زیادہ زور دینی مدارس کے نصاب پر دیا جاتا ہے۔ نصاب وتعلیم جو "درس نظامی" کے نام سے موسوم ہے، آج سے تقریباً پونے تین سو سال قبل ملا، نظام الدین سہالویؒ نے، جن کا عہد 1677ء سے 1748ء تک ہے، اس وقت مختلف اسلامی وعربی علوم وفنون کی دستیاب کتب سے مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد سے اس میں حذف (Deletion) و اضافہ (Addition) اور ردوبدل ہوتا رہا ہے، لیکن چونکہ اس کی اساس وہی ہے، اس لئے یہ نسبت قائم رہی۔

یہ درست ہے کہ بعض مدارس جہاد افغانستان کے لئے تحریکی مراکز بنے، مولانا سمیع الحق اس پر اب بھی اعلانیہ طور پر فخر کرتے ہیں، کیونکہ ہماری ریاست اور امریکہ کی قیادت میں عالمی استعماری قوتیں، عالم اسلام وعالم عرب اس جہاد کی پشت پر تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ قومی دھارا تو کیا عالمی دھارے کا حصہ بنے، اس دور میں وہ محبوبِ عالم تھے، ہیرو تھے، منظورِ نظر تھے، وہ انٹرنیشلائز ہو گئے اور ان کی ساری معلومات ہمارے ریاستی اداروں کے پاس یقیناً ہوں گی۔ مگر غضب یہ ہوا کہ جہاد کا یہ جن جسے ہماری ریاست اور عالمی امریکی استعمار اپنے جس ریموٹ کنٹرول (یعنی غیبی اشاروں) سے چلانا چاہتے تھے، شاید وہ ریموٹ کنٹرول لنک (رابطہ) کہیں ٹوٹ (Disconnect) گیا اور چیلے گرو کی گرفت سے آزاد ہو گئے۔ سو اصل مسئلے کی جڑ پکڑنے اور ٹوٹے ہوئے رابطہ کو جوڑنے کی بجائے مدارس کی دہائی شروع کر دی گئی۔ ہماری حکومتیں تو Minister اور Yes His

کا کردار ادا کرتی ہیں، لہٰذا عقل کو استعمال کرنے کی گنجائش کم ہی Master's Voice ہوتی ہے۔ اب بھی یہی ہوا کہ چلے تھے دہشت گردی کے ناسور کو جڑ سے اکھیڑنے، مگر بیچ میں کہیں سے مدرسہ رجسٹریشن اور ریگولیشن کی گرہ آ گئی اور پھر اکیسویں آئینی ترمیم میں ''مذہب ومسلک کے نام پر دہشت گردی'' کو نشان زدہ یعنی High Light کرنا ضروری قرار پایا۔

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے ناظم تعلیمات مولانا وصال احمد نے بے نظیر بھٹو قتل کیس میں اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے خود ہی 21 ویں آئینی ترمیم اور قومی ایکشن پلان کو قانونی اور اخلاقی جواز پیش کر دیا۔ مولانا وصال احمد نے عدالت میں بیان دیا کہ بے نظیر بھٹو۔ کے مبینہ قاتل اور کامرہ بیس پر حملے میں نامزد خودکش حملہ آوروں کا تعلق ہمارے مدرسے سے تھا تاہم ان کے کردار و عمل سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

دارالعلوم حقانیہ کے نائب مہتمم اور وفاق المدارس العربیہ کے سینئر نائب صدر شیخ الحدیث مولانا انوار الحق نے بے نظیر بھٹو قتل کیس میں بار بار دارالعلوم حقانیہ پر عائد کردہ بے سروپا الزامات کی سختی سے تردید کی اور کہا کہ بے نظیر بھٹو پاکستان کی ایک مقتدر بڑی سیاسی لیڈر اور عالمی سطح کی دانشور رہنما تھیں۔ ان کے قتل میں پہلے ہی دن سے دارالعلوم حقانیہ جیسے خالص تعلیمی ادارے کی طرف اشارے کنائے کرنا اصل قاتلوں کو چھپانے کی بھونڈی سازش ہے۔ دارالعلوم اس منفی پروپیگنڈے کو عالمی سطح پر دینی مدارس کے خلاف جاری پروپیگنڈا کا اہم حصہ سمجھتا ہے۔ بے نظیر بھٹو سے دینی مدارس اور علماء کو کوئی خطرہ نہیں تھا، اصل خطرہ سیاسی اور دیگر مقتدر قوتوں کو تھا جن کا اقتدار بی بی کے آنے سے خطرے میں پڑ سکتا تھا یا جن کے سیاسی اور دیگر مفادات پر زد آ سکتی تھی۔ سابق وزیر داخلہ کی رپورٹ بھی تضادات کا مجموعہ تھی، ایک ہی سانس میں سابق وزیر داخلہ نے واضح کہہ دیا کہ سازش فاٹا میں تیار ہوئی اور فنڈنگ بھی وہیں ہوئی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس میں پرویز مشرف، بریگیڈیئر اعجاز شاہ، القاعدہ، طالبان اور پیپلز پارٹی کی مخالف سیاسی دو جماعتیں بھی ملوث

ہیں۔ نیز اس سے پہلے اسکاٹ لینڈ یارڈ، اقوام متحدہ کی رپورٹوں میں بھی دارالعلوم کا نام نہیں لیا گیا۔ ترجمان نے اس بات پر زور دیا کہ بے نظیر بھٹو نے جن لوگوں کو زندگی میں اپنے قتل کے منصوبے میں نامزد کیا تھا انہیں کیوں اب تک شامل تفتیش نہیں کیا گیا؟ بلاول ہاؤس کے چیف شہنشاہ کو کس نے مارا؟ 18 اکتوبر کو کراچی میں محترمہ بے نظیر پر کس نے بم حملہ کیا؟ پوسٹ مارٹم کیوں نہیں کیا گیا؟ ق لیگ کو اس وقت قاتل لیگ کہا گیا۔ آج ان کا موقف کیوں تبدیل ہو گیا ہے؟ پھر جو دو تین نام بطور طالب علم دارالعلوم حقانیہ کی طرف منسوب کیے جا رہے ہیں ان نامزد لوگوں کو فرضی پولیس مقابلوں اور فرار ہونے کے دوران قتل کیا گیا، ان لوگوں کو کیوں اور کس نے قتل کیا؟ اسی طرح نامزد اور گرفتار ملزم اعتزاز، حسنین اور رفاقت کا کوئی تعلیمی ریکارڈ ہمارے پاس نہیں۔ جائے وقوع کو اعلیٰ پولیس حکام نے کس کے حکم پر کیوں عجلت میں دھویا؟ بیان میں کہا گیا ہے کہ پاکستانی قوم اور پیپلز پارٹی اپنے رہنماؤں سے اصل قاتلوں کا سراغ معلوم کرے۔ خود آصف زرداری نے بار بار یہ کہا ہے کہ طالبان وغیرہ وغیرہ اس سازش کا ایک معمولی کامہ ہیں، اصل قوتیں کوئی اور ہیں۔ انہیں چاہئے کہ ان قوتوں کی کھل کر نشاندہی کریں۔ انہوں نے کہا کہ تفتیشی اور متعلقہ ادارے اپنی ناکامیوں کو چھپانے کے لئے تضادات سے بھرپور متنازع رپورٹیں پیش کرتے رہے جنہیں پیپلز پارٹی سمیت کسی بھی ذی شعور نے قبول نہیں کیا۔ جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک ایک کھلی کتاب کی مانند ہے، برسوں سے کوئی روز ایسا نہیں گزرتا جس میں امریکی، مغربی اور دنیا بھر کے میڈیا کے نمائندے، سفارتکار اور دانشور حضرات دارالعلوم کا وزٹ نہ کرتے ہوں اور انہیں یہاں پر کسی بھی قسم کے دہشت گردی کے ثبوت نہیں ملے۔ حال ہی میں ایک بار پھر عدالت میں زیر سماعت مقدمے کے حوالے سے دارالعلوم کے دفتر تعلیمات کے محرر مولانا وصال احمد کے بارے میں کامرہ ایئربیس وغیرہ کے سلسلے میں بے سروپا باتیں شائع کی جا رہی ہیں۔ کیس کا ایک گواہ عبدالرشید جو زیر حراست ہے وہ واقعے سے 3 سال پہلے 2004ء میں

صرف 3 ماہ دارالعلوم میں زیر تعلیم رہا جسے غیر حاضری کی وجہ سے ادارے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ دارالعلوم حقانیہ، پیپلز پارٹی حکومتی اداروں کے ساتھ تفتیش میں ہر طرح سے تعاون کے لئے حسب سابق مستعد ہے تا کہ اصل محرکات اور قاتلوں کا سراغ لگایا جا سکے۔

ماضی میں القاعدہ اور طالبان کے نامی گرامی دہشت گرد جماعت اسلامی کے رہنماؤں کے گھروں سے پکڑے جاتے رہے۔ متحدہ قومی موومنٹ نے کئی بار جماعت اسلامی، اسلامی جمعیت طلبہ اور شباب ملی سے تعلق رکھنے والے ان افراد کی فہرست جاری کی جو طالبان کے ہمراہ ریاست پاکستان کے خلاف جہاد کے دوران مارے گئے اور جماعت اسلامی نے بھی کبھی ان افراد کی جماعت سے وابستگی سے انکار نہیں کیا۔

مدارس کا نام آتا ہے تو ان کے ذمہ داران حکومت کو للکارتے ہیں کہ ان مدارس کی نشاندہی کی جائے جہاں دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بتایا جائے کہ کس نصاب میں کہاں دہشت گردی کے فضائل بیان ہوئے ہیں؟ ظاہر ہے کہ حکومت کے پاس ان سوالات کا کوئی متعین جواب نہیں۔ یہی استدلال سیاسی اور مذہبی جماعتوں کا بھی ہوتا ہے۔ ان کے دستور اور منشور میں کہاں لکھا ہے کہ بھتہ لینا تنظیم کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے یا غیر ریاستی سطح پر مسلح گروہ تشکیل دینا جماعتی اہداف کا حصہ ہے۔ کوئی دینی مدرسہ دہشت گردی پر سند نہیں دیتا اور کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت اپنے اجتماعات میں بھتہ خوری کی تراکیب نہیں بیان کرتی۔

محترم خورشید ندیم اپنے ایک کالم میں تحریر فرما چکے ہیں کہ ایک دو ماہ پہلے اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی میں فرقہ واریت کے موضوع پر ایک کانفرنس ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس میں مذہبی تشدد کی بات بھی ہوئی۔ کھانے کے وقفے میں قومی اسمبلی کے ایک رکن اور کانفرنس میں شریک علما کے مابین گفتگو شروع ہوئی۔ میری نشست بھی ان کے ساتھ تھی۔ قومی اسمبلی کے رکن نے کہا کہ میں کانفرنس میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستانی طالبان کو خوارج قرار

دیا جائے۔ چند جملوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں تشریف فرما علماء اور رکن اسمبلی کے خیالات میں اتفاق نہیں۔ علماء نے کہا کہ یہ عقیدے کا مسئلہ ہے۔ طالبان کو ہم جو چاہیں نام دیں لیکن خوارج نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کا اور ہمارا عقیدہ ایک ہے۔ یہ بات کہی گئی کہ خوارج نے مسلمانوں کے نظم اجتماعی سے بغاوت کی، اس بناء پر انہیں امت سے الگ سمجھا گیا۔ یہی کام پاکستانی طالبان نے کیا ہے۔ اس پر علماء نے موقف اختیار کیا کہ مسلمانوں کا نظم اجتماعی ہے کہاں؟ ہم اس وقت جس نظم اجتماعی کا حصہ ہیں وہ اسلامی تعلیمات پر نہیں کھڑا۔ اس کا انکار جرم کیسے ہے؟ ان سے عرض کیا گیا کہ یہی طالبانت کا موقف ہے، تو کیا وہ طالبان ہی کے موقف کی تائید نہیں کر رہے؟ ایسی گفتگو ہم جانتے ہیں کہ کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوتی لیکن ان سے ہم ان سوالات کے جواب تلاش کر سکتے ہیں، جو ابتدا میں اٹھائے ہیں۔

یہ علماء مدارس کے اساتذہ تھے۔ ان میں سے کسی نے ہتھیار نہیں اٹھایا۔ طلبا کو اس کی تعلیم بھی نہیں دی۔ اس بات سے لیکن انکار ممکن نہیں کہ اپنا فہم دین طالب علموں کو منتقل کیا ہے جو لازم نہیں کسی درسی کتاب میں لکھا ہو۔ جب وہ انہی طلبا کو یہ بتائیں گے کہ ہمارا حکم اجتماعی دراصل وہ نظم نہیں ہے جس کے خلاف اسلام نے ہتھیار اٹھانے سے منع کیا ہے تو یہ طالبان کے نقطہ نظر کو ایک دینی استدلال فراہم کرنا ہے۔ مولانا فضل الرحمن جب یہ موقف اختیار کریں گے کہ حکومت، امریکہ یا لادینی قوتوں کے کہنے پر دینی مدارس کے خلاف یلغار کر رہی ہے تو اس سوال کا اٹھنا ناگزیر ہے کہ جو حکومت کرتی ہے وہ مسلمانوں کا نظم اجتماعی کہلانے کی مستحق ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب اثبات میں نہیں ہو سکتا۔

ایک اعتراض یہ بھی آیا کہ مدارس کا نصاب فقہی اساس پر قائم ہے اور قرآن وسنت کی حیثیت ذیلی یا ثانوی رہ جاتی ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے، جب تک ہم اپنے خطے میں بند تھے، تو زمینی حقیقت اور تقاضے یہی تھے۔ اب دنیا سمٹ چکی ہے، انفارمیشن کے ذرائع ناقابل یقین حد تک ترقی کر رہے ہین، تو ہمیں بھی اپنی اساس پر قائم رہتے ہوئے

اپنی سوچ میں کھلا پن پیدا کرنا ہوگا۔

ایک خفیہ تفتیشی ادارے نے دینی مدارس کے حوالے سے ایک رپورٹ حکومت کو پیش کی ہے۔ اس رپورٹ کی روشنی میں حکومت نے پانچ ہزار سے زائد غیر رجسٹرڈ مدارس کو بند کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے جبکہ ایک سو کے قریب مدارس کو واچ لسٹ میں شامل کرلیا ہے۔ مشکوک مدارس پر چھاپوں کا سلسلہ جاری ہے، بند کئے جانے والے زیادہ تر مدارس میں اقامتی طلبہ ہیں، یہ مدارس ناظرہ اور حفظ کی تعلیم دیتے ہیں۔ ذرائع کے مطابق واچ لسٹ میں شامل مدارس کے اثاثہ جات، غیر ملکی طلبہ کی تعداد، کوائف، فنڈز کا حصول، اخراجات، زیر تعلیم طلبہ کی جماعتی وابستگی کو چیک کیا جارہا ہے، اس کام پر دو خفیہ ادارے مامور ہیں، بند کئے جانے والی لسٹ میں زیادہ تر مدارس کا تعلق خیبر پختونخوا، سندھ اور پنجاب سے ہے۔ واچ لسٹ میں کراچی کے جامعہ رحمانیہ بفرزون، اشرف المدارس، جامعہ رشیدیہ، جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی، مدارس احسن العلوم، جامعہ بنوریہ، دارالخیر کے علاوہ لاڑکانہ کا معروف مدرسہ بھی شامل ہے جبکہ تیمر گرہ کا مدرسہ مصارب العلوم، ہنگو کا مدرسہ سراج اسلام، لکی مروت کے تین مدارس، جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک، ٹل کا مدرسہ عربیہ، کرک میں سابق رکن قومی اسمبلی شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ فتح العلوم، چارسدہ کا مدرسہ مرکز دارالقراء، نمک منڈی پشاور کا مدرسہ، بنوں میں سابق رکن قومی اسمبلی مولانا سید نصیب علی شاہ کا مدرسہ المرکز اسلامی، اندرون لکی گیٹ بنوں کا مدرسہ جامعہ معارف شریعہ، بنوں روڈ ڈی آئی خان کا مدرسہ دارالعلوم اسلامیہ عربیہ، شیر گڑھ مردان سابق رکن قومی اسمبلی مولانا عبدالملک کا مدرسہ، جامعہ مرکز العلوم اسلامیہ منصورہ ملتان روڈ لاہور، جامعہ عربیہ مدینۃ العلوم پشاور، جماعت اسلامی کے سابق رکن اسمبلی مولانا گوہر رحمٰن کا مدرسہ جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن مردان، چارسدہ کے دو مدارس، دارالعلوم اسلامیہ لاہور، جامعہ عربیہ مرکز تجوید العلوم سراب کسٹم کوئٹہ، جامعہ اسلامیہ تعلیم القران سیدو شریف، جامعہ رشیدیہ ٹھنڈ کوئی، جامعہ فناء العلوم

بلوچی قلعہ شہر روڈ کوئٹہ، مدرسہ جعفریہ پاراچنار، مدرسہ خمینی منڈی والی بھنڈی کھیپ، جامعہ تعلیمات اسلامیہ لاہور، جامعہ کریم پارک وادی روڈ لاہور، مرکز اہلحدیث چوک ڈی آئی خان، جامعہ انوار العلوم ٹی بلاک جنرل بس اسٹینڈ ملتان، جامعہ محمدیہ اہلحدیث مکتبہ دار القرآن وحدیث فیصل آباد، جامعہ عمر فاروق اسلامیہ سمندری وفیصل آباد، جامعہ اشرفیہ مان کوٹ ملتان، جامعہ فاروقیہ شجاع آباد، جامعہ عثمانیہ شور کوٹ جھنگ، جامعہ العلوم اسلامیہ الفریدیہ اسلام آباد، دار العلوم اخور وال درہ آدم خیل، جامعہ قاسم العلوم سرگودھا، جامعہ عربیہ اشاعت القرآن حضرو، دار العلوم ترجمان القرآن کوہاٹ، جامعہ امام حسین خانقاہ ڈوگرہ شیخوپورہ، جامعہ الجعفر رحیم یار خان، جامعہ مفتاح العلوم حیدر آباد، جامعہ فاروقیہ مینگل آباد کوئٹہ، جامعہ احیاء العلوم پڑانگ چارسدہ، باب الرضا سید جامعہ امام سجاد جھنگ، جامعہ رحمانیہ درگئی مالاکنڈ، جامعہ مخزن العلوم خانپور سمیت دیگر مدارس شامل ہیں۔ ذرائع کے مطابق صرف وفاق المدارس العربیہ پاکستان میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد 14 لاکھ 66 ہزار 976 ہے جبکہ طالبات کی تعداد 7 لاکھ 32 ہزار 887 ہے۔ ان مدارس میں 63 ہزار 397 اساتذہ کرام اور 26 ہزار 804 معلمات تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں جبکہ دیگر عملے کی تعداد 17 ہزار 6 سو ہے ان مدارس سے اب تک 6 لاکھ 69 ہزار 534 حفاظ اور ایک لاکھ 92 ہزار 157 حافظات بنی ہیں جبکہ ان مدارس سے ایک لاکھ 11 ہزار 682 علماء اور ایک لاکھ 30 ہزار 73 عالمات فارغ ہوئی ہیں ان میں غیر رجسٹرڈ مدارس اور حفظ و ناظرہ کے ہزاروں مدارس کے طلبہ شامل نہیں ہیں۔

اسے کیا نام دیا جائے؟

قومی ایکشن پلان پر اتفاق رائے ہونے کے بعد راولپنڈی، پشاور اور اسلام آباد کی امام بارگاہوں کو دہشت گردوں نے نشانہ بنایا۔ ان امام بارگاہوں کو اس وقت نشانہ بنایا گیا

جب راولپنڈی کی امام بارگاہ میں محفل میلاد جاری تھی جبکہ پشاور اور اسلام آباد کی امام بارگاہوں میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے دوران خودکش حملے کیے گئے۔ دہشت گردوں کے اس اقدام کو مذہبی دہشت گردی نہ کہا جائے تو اور کیا نام دیا جائے؟ بلوچستان میں مذہبی منافرت پھیلانے کے لئے بڑی تعداد میں ہزارہ شیعہ مسلک کے افراد کے اجتماعی قتل عام کو کیا نام دیا جائے۔ وقفہ وقفہ سے دیوبندی اور بریلوی مکتبہ فکر کے علما کو نشانہ بنانے کو ہم کیا کہیں گے۔ وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان کہتے ہیں کہ صرف دس فیصد مدارس دہشت گردی میں ملوث ہیں، مگر یہ بھی تو بتایا جائے کہ یہ مدارس کہاں کہاں موجود ہیں، ان کا تعلق کس مسلک سے ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ بات کھل کر کی جائے۔ محافل میلاد النبیؐ، بزرگان دین کے مزارات اور ان کے عرس کی تقریبات، مجلس عزا اور عزاداری کن عناصر کے لئے تکلیف کا باعث ہے۔ اگر ہم مان لیں کہ دہشت گردوں کا کوئی مذہب، دین اور ملک اور وطن نہیں ہوتا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان کا نشانہ شیعہ مسلک کے لوگ ہی کیوں ہوتے ہیں۔ ان مدرسوں کے نام کیوں نہیں سامنے لائے جاتے جو عسکریت کی تربیت دے رہے ہیں۔ 90 فیصد سے زائد دہشت گردی کے واقعات مذہب کے نام پر ہوئے۔ ہمیں اس حقیقت سے نگاہ نہیں چرانی چاہئے کہ ہمارے ہاں فرقہ واریت کے نام پر بھی دہشت گردی ہو رہی ہے۔ اس امر کو بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ مدارس کے نظام اور نصاب کی اصلاح احوال کی بھی بے حد ضرورت ہے۔ وزیر داخلہ کہہ چکے ہیں کہ 90 فیصد مدارس کا کردار قابل ستائش ہے۔ فقط 10 فیصد مدارس اصلاح احوال کے متقاضی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مذہبی رہنماؤں کو حکومت کے یا تحفظات دور کرنے میں کیا امر مانع ہے؟ حکومت بجا طور پر اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ پاکستان اسلامی جمہوریہ ہے یہ کسی خاص فرقے ملک یا جماعت کا ملک نہیں ہے۔ اقلیتیں بھی آئین کے تحت مساوی حقوق کی حامل ہیں یہ مذہبی انتہاپسندی، شدت پسندی اور عدم برداشت ہے جس نے دہشت گردی کو بام عروج پر

پہنچایا ہے۔اس نکتے پر ساری سیاسی اور دینی جماعتوں کو غیر مشروط اتفاق رائے کیوں نہیں ہو رہا کہ پاکستان حالت جنگ میں ہے ایک طرف دہشت گرد ہیں اور دوسری جانب افواج پاکستان عسکری اور سیاسی قیادت کا ایک صفحے پر ہونا کسے تکلیف دے رہا ہے؟ مولانا فضل الرحمٰن اور سراج الحق کا طالبان اور جہادی تنظیموں سے براہ راست واسطہ رہا ہے۔ایک کشمیر کے جہاد میں شامل رہی ہے دوسری افغانستان کے جہاد میں ایک نواز شریف کے ساتھ جڑی ہے تو دوسری کے پی کے حکومت میں اتحادی ہے۔کسی نے اکیسویں آئینی ترمیم کو پارلیمنٹ کی موت قرار دیا۔مولانا فضل الرحمٰن اور سراج الحق کے نزدیک دہشت گردی کو مذہب یا مسلک تک محدود نہ کیا جائے جس طرح طالبان کے لئے اچھے اور برے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

پاکستان میں گزشتہ پندرہ برس میں 150 کے قریب بڑے بم دھماکے اور دہشت گردی کے واقعات ہوئے۔خاص طور پر امریکہ کے نائن الیون کے سانحے کے بعد ان میں تیزی آئی اور سب سے زیادہ متاثرہ ملک پاکستان رہا۔ان پندرہ برسوں میں انفرادی فرقہ وارانہ ٹارگٹ کلنگ میں تشویشناک اضافہ ہوا۔چند بڑے بم دھماکے جس میں کارساز بم دھماکہ، بے نظیر بھٹو پر دوسرا بم دھماکہ اور پشاور کے اسکول میں دہشت گردی اور دیگر واقعات کو چھوڑ کر سے زیادہ واقعات مساجد، امام بارگاہوں، اقلیتی عبادت گاہوں اور مذہبی اجتماعات پر رونما ہوئے۔ان 15 برسوں میں ایسے واقعات جن میں بم دھماکے اور اجتماعی فائرنگ شامل ہیں ان کی تعداد 96 تھی جس میں ایک ہزار 900افراد جاں بحق اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ان بم دھماکوں میں خیبر پختونخوا اور بلوچستان سرفہرست رہے مگر سب سے افسوسناک پہلو یہ رہا ہے کہ ان 96 واقعات میں جاں بحق ہونے والے 70 فیصد افراد کا تعلق اہل تشیع مسلک سے تھا۔انفرادی ٹارگٹ کلنگ میں بھی اسی مسلک کے افراد جن میں ڈاکٹر، انجینئر بھی شامل تھے وہ زیادہ جاں بحق ہوئے۔تحقیق کے دوران جو حقائق اور اعداد و شمار سامنے آئے ان کی تفصیلات کچھ یوں ہیں 2001ء میں 28 اکتوبر کو پنجاب کے

شہر بہاولپور میں چرچ پر حملے میں 16 مسیحی افراد ہلاک اور 6 زخمی ہوئے، 2002ء میں 26 فروری کو راولپنڈی میں شاہ نجف مسجد پر اندھا دھند فائرنگ 11 نمازی شہید، 17 مارچ کو اسلام آباد میں ایک چرچ پر گرنیڈ حملہ 5 افراد جاں بحق، 40 زخمی، ہلاک شدگان میں امریکی سفارتکار کی اہلیہ اور بیٹی بھی شامل۔ 5 اگست مری میں واقع مسیحی مشنری اسکول پر فائرنگ 6 ہلاک اور 4 زخمی، 9 اگست ٹیکسلا کرسچین اسپتال میں واقع ایک چرچ حملے میں تین نرسیں ہلاک 25 افراد زخمی، 25 ستمبر مسلح افراد نے صدر میں واقع ایک کرسچین ویلفیئر آرگنائزیشن کے دفتر میں داخل ہو کر وہاں موجود 7 مسیحی افراد کو رسیوں سے باندھا اور پھر ان کے سروں میں گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ 5 دسمبر مقدونین سفارتخانے میں مسلح افراد داخل ہوئے، 3 پاکستانی عملے کو رسیوں سے باندھ دیا اور دفتر کو دھماکے سے اڑا دیا۔ 25 دسمبر سیالکوٹ کے علاقے ڈسکہ میں واقع ایک چرچ پر ہینڈ گرنیڈ حملہ 3 خواتین ہلاک 12 زخمی۔ 2003ء میں فیصل آباد کی ایک مسجد پر فائرنگ سے 2 افراد زخمی، 8 جون کوئٹہ سریاب روڈ پر اندھا دھند فائرنگ اہل تشیع ہزارہ کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے 11 زیر تربیت سپاہی جاں بحق، 9 زخمی کوئٹہ کی امام بارگاہ پر فائرنگ 47 نمازی شہید۔ 2004ء میں 28 فروری سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں واقع امام بارگاہ پر خودکش حملہ بمبار ہلاک 2 نمازی شہید۔ 2 مارچ لیاقت بازار کوئٹہ میں عاشورہ کے جلوس پر فائرنگ 42 شہید 100 زخمی۔ 7 مئی سندھ مدرسۃ الاسلام میں واقع اہل تشیع مسجد پر جمعہ کی نماز کے دوران خودکش حملہ 15 نمازی شہید 100 سے زائد زخمی۔ 14 مئی لاہور کے مغل پورہ میں واقع ایک گھر پر فائرنگ 6 اہل تشیع افراد ہلاک، 31 مئی کراچی میں واقع امام بارگاہ علی رضا پر خودکش حملہ 16 نمازی شہید 35 زخمی۔ 21 ستمبر ڈیرہ اسماعیل خان میں گھر پر فائرنگ 3 افراد ہلاک۔ یکم اکتوبر سیالکوٹ کی ایک مسجد میں خودکش حملہ 25 نمازی شہید درجنوں زخمی۔ 10 اکتوبر لاہور کی ایک مسجد پر خودکش دھماکہ 4 افراد جاں بحق، 8 زخمی۔ 2005ء

میں 19 مارچ جھل مگسی کے علاقے فتح پور میں واقع پیر رخیل شاہ کے مزار پر خودکش حملہ 35 جاں بحق، 27 مئی اسلام آباد میں واقع بری امام کے مزار پر خودکش حملہ 20 افراد جاں بحق، 82 زخمی۔ 31 مئی کراچی کے علاقے گلشن اقبال میں واقع مدینۃ العلم امام بارگاہ پر خودکش حملے کی کوشش بمبار ہلاک 4 نمازی شہید، 7 اکتوبر منڈی بہاؤ الدین میں واقع قادیانی عبادت گاہ پر فائرنگ 8 افراد ہلاک، 2006ء میں 9 فروری کو ہنگو میں عاشورہ کے جلوس پر خودکش حملے اور بعد میں فائرنگ سے 36 افراد جاں بحق 100 سے زائد زخمی۔ 11 اپریل کراچی میں واقع نشتر پارک میں عید میلاد النبیؐ کے جلسے میں دھماکہ سنی تحریک کے مرکزی رہنماؤں سمیت 52 افراد جاں بحق، 100 سے زائد زخمی، 2007ء میں 27 جنوری جنوری کو پشاور میں واقع مسجد پر خودکش حملہ 13 افراد جس میں پشاور پولیس چیف ملک سعد جان بھی شامل تھے جاں بحق ہوئے۔ 19 جولائی کوہاٹ میں فوجی مسجد میں دھماکہ 11 نمازی شہید، 21 دسمبر کو عید الفطر کے موقع پر چارسدہ میں واقع مسجد شیر پاؤ میں خودکش حملہ 57 نمازی شہید 95 زخمی۔ 2008ء میں 17 جنوری خیبر پختونخوا میں واقع مرزا قاسم بیگ امام بارگاہ میں خودکش حملہ 12 نمازی شہید 25 زخمی۔ 16 جون ڈیرہ اسماعیل خان میں مسجد کے اندر خودکش حملہ 4 نمازی شہید، 19 اگست ڈیرہ اسماعیل خان میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں خودکش حملہ جب وہاں ایک شیعہ رہنما فائرنگ کے بعد زخمی حالت میں علاج کے لئے لائے گئے اور 32 افراد جاں بحق 55 زخمی۔ 10 ستمبر لوئر دیر میں مسجد پر گرنیڈ حملہ اور 25 نمازی شہید 50 زخمی۔ 6 اکتوبر پشاور میں واقع پاکستان مسلم لیگ (ن) کے شیعہ رہنما پر خودکش حملہ میں بچ گئے مگر 20 افراد ہلاک 60 زخمی بیشتر اہل تشیع افراد تھے۔ 21 نومبر ڈیرہ اسماعیل خان میں عالم کی تدفین کے موقع پر 7 بم دھماکے 7 افراد جاں بحق، 17 زخمی۔ 22 نومبر ہنگو کی ایک مسجد میں خودکش حملہ 6 نمازی شہید 15 زخمی۔ 2009ء میں 4 جنوری کو ڈیرہ اسماعیل خان میں واقع ایک امام بارگاہ کے

قریب خودکش حملہ 7 ہلاک 25 زخمی۔ 5 فروری ڈیرہ غازی خان میں واقع امام بارگاہ مسجد ال حسینیہ پر مبینہ خودکش حملہ 32 افراد جاں بحق، 20 فروری کو ڈیرہ اسماعیل خان میں شیعہ لیڈر کی تدفین کے موقع پر خودکش حملہ 30 افراد جاں بحق، 157 زخمی، 5 اپریل چکوال میں امام بارگاہ پر خودکش حملہ 22 افراد جاں بحق 60 زخمی، 5 جون اپر دیر میں مسجد پر خودکش حملہ 40 نمازی شہید اور 70 زخمی۔ 12 جون نوشہرہ میں واقع مسجد میں خودکش بمبار نے بارود سے بھری گاڑی مسجد سے ٹکرا دی جس کے نتیجے میں 5 نمازی شہید اور 105 زخمی، 4 دسمبر راولپنڈی کنٹونمنٹ میں واقع مسجد میں دھماکہ اور فائرنگ 40 افراد جاں بحق، 86 زخمی اس دھماکے میں ہلاک و زخمی ہونے والوں میں اعلیٰ فوجی افسران اور جوان شامل تھے۔ 18 دسمبر لوئر دیر میں مسجد کے باہر دھماکہ 12 افراد ہلاک، 28 افراد زخمی۔ ہلاک و زخمی ہونے والوں میں بیشتر پولیس اہلکار شامل تھے۔ 27 دسمبر مظفرآباد آزاد کشمیر میں امام بارگاہ کے نزدیک محرم کے جلوس پر خودکش حملہ 15 جاں بحق 100 سے زائد زخمی، 28 دسمبر کراچی میں ایم اے جناح روڈ پر عاشورہ کے جلوس میں دھماکہ 42 افراد جاں بحق، 120 زخمی۔ 2010ء کے دوسرے مہینے میں 5 فروری کو کراچی میں نرسری کے قریب چہلم کے موقع پر جلوس میں شرکت کے لئے جانے والی بس کے قریب دھماکہ 13 افراد جاں بحق، 50 زخمی۔ اس دھماکے کے دو گھنٹے جناح اسپتال میں دھماکہ 10 افراد ہلاک درجنوں زخمی، بیشتر پہلے دھماکے میں ہلاک و زخمی ہونے والوں کے رشتہ دار تھے۔ 28 مئی لاہور میں گڑھی شاہو اور ماڈل ٹاؤن میں واقع احمدیوں کی دو عبادت گاہوں پر دھماکے 95 افراد ہلاک 108 زخمی، یکم جولائی لاہور داتا دربار پر دھماکہ 42 افراد جاں بحق، 180 زخمی۔ 23 اگست وانا کی ایک مسجد پر خودکش حملہ 24 افراد جاں بحق، 25 زخمی۔ یکم ستمبر کو یوم علی کے موقع پر لاہور میں 3 مختلف دھماکے 30 افراد جاں بحق، 250 زخمی، 3 ستمبر فلسطین سے اظہار یکجہتی کے لئے نکالی گئی شیعہ ریلی پر خودکش حملہ 73 افراد جاں بحق، 200 زخمی۔

17 اکتوبر کراچی میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر دو خودکش حملے، 9 افراد جاں بحق، 55 زخمی، اسی دن مردان میں واقع احمدیوں کی عبادت گاہ پر خودکش حملہ بمبار سمیت 2 افراد ہلاک۔ 25 اکتوبر پاکپتن میں مزار پر دھماکہ 6 افراد جاں بحق، 15 زخمی، 5 نومبر درہ آدم خیل میں مسجد میں نماز جمعہ کے اختتام میں دھماکہ، 72 افراد جاں بحق، 100 زخمی، 10 دسمبر ہنگو میں اہل تشیع کے زیر انتظام اسپتال پر دھماکہ 16 ہلاک 20 زخمی۔ 2011ء میں 25 جنوری لاہور میں عاشورہ کے جلوس کے موقع پر امام بارگاہ گالے شاہ پر خودکش حملہ 13 افراد ہلاک، 70 زخمی، 9 مارچ پشاور میں جنازہ پر خودکش حملہ 40 ہلاک، 50 زخمی، 3 اپریل ڈیرہ غازی خان میں مزار پر خودکش حملہ 50 ہلاک 120 زخمی، 26 اپریل کوئٹہ میں ایران جانے والی زائرین کی بس پر فائرنگ کے بعد آگ لگا دی گئی 40 افراد ہلاک۔ 18 مئی کوئٹہ میں ہزاری کمیونٹی کے افراد پر فائرنگ 7 ہلاک، 31 اگست کوئٹہ میں عیدالفطر کے دن ہزارہ کمیونٹی کی امام بارگاہ باہر دھماکہ 11 ہلاک، 15 ستمبر پشاور میں جنازے پر خودکش حملہ 25 ہلاک۔ 20 ستمبر کوئٹہ کے قریب مستونگ میں ہزارہ کمیونٹی کے زائرین کی بس پر فائرنگ 26 ہلاک، 23 ستمبر کوئٹہ میں وین پر فائرنگ ہزارہ کمیونٹی کے 3 افراد ہلاک۔ 2012ء میں 15 جنوری رحیم یار خان کی تحصیل خان پور میں امام حسین کے چہلم کے جلوس میں دھماکہ 18 جاں بحق، درجنوں زخمی، 17 فروری پارا چنار میں خودکش دھماکہ 41 اہل تشیع افراد ہلاک، 28 فروری کوہستان میں زائرین کی بس پر فائرنگ 18 افراد ہلاک، 11 مارچ پشاور میں جنازے پر خودکش حملہ 15 افراد ہلاک، 23 مارچ پشاور میں مسجد کے باہر دھماکہ 10 افراد ہلاک، 18 جون کوئٹہ میں زائرین کی بس میں دھماکہ 15 افراد ہلاک، 21 جون کوئٹہ میں مسجد میں دھماکہ 2 نمازی شہید، 13 زخمی، 28 جون کوئٹہ ایران سے زائرین کو ایران لے جانے والی بس پر فائرنگ 18 افراد ہلاک، 16 اگست مانسہرہ میں ایک بس سے شناخت کے بعد 20 اہل تشیع افراد کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ 17 اگست

کراچی میں عزاداری میں شرکت کرنے والے افراد کی بس پر سفاری پارک کے قریب فائرنگ 22 افراد ہلاک 18 زخمی، 16 اکتوبر کو کوئٹہ میں فائرنگ کر کے ہزارہ کمیونٹی کے 4 افراد ہلاک۔ 6 نومبر کوئٹہ میں فائرنگ، ایک ڈاکٹر سمیت 4 افراد ہلاک۔ 2013ء میں 10 جنوری کوئٹہ اور سوات میں 4 دھماکے، 100 جاں بحق 270 زخمی، اکثریت اہل تشیع افراد کی تھی، یکم فروری ہنگو میں مسجد کے باہر دھماکہ 24 جاں بحق، 3 مارچ کراچی کے علاقے عباس ٹاؤن میں مسجد کے باہر دھماکہ 45 نمازی شہید، اسی دن پشاور کے جامع چشتیہ مسجد میں دھماکہ 4 نمازی شہید اور 27 زخمی، 17 مئی پشاور میں 2 مساجد میں دھماکے 15 افراد ہلاک 27 زخمی، 20 جون پشاور کی امام بارگاہ کے نزدیک خودکش دھماکہ 15 افراد ہلاک 6 زخمی، 11 جولائی پشاور میں مسجد کے قریب دھماکہ 2 افراد ہلاک، 6 زخمی۔ 15 جولائی کوئٹہ میں ہزارہ کمیونٹی کے افراد پر فائرنگ 4 افراد ہلاک، 6 ستمبر پنجاب کے جاسوئی کے علاقے میں فائرنگ 7 اہل تشیع افراد ہلاک، 22 ستمبر پشاور کے چرچ میں دو دھماکے 78 افراد ہلاک 130 زخمی، 2014ء میں یکم جنوری کوئٹہ کے علاقے اختر آباد میں زائرین کو ایران لے جانے والی بس پر خودکش حملہ 3 افراد ہلاک، 24 زخمی، 8 جون کوئٹہ میں زائرین کی بس پر فائرنگ 24 افراد ہلاک، 2015ء میں 30 جنوری شکارپور کی امام بارگاہ پر خودکش حملہ 53 نمازی شہید، 23 فروری پشاور کی امام بارگاہ پر حملہ 19 نمازی شہید، 18 فروری اسلام آباد میں واقع قصر سکینہ امام بارگاہ پر خودکش حملہ 8 افراد جاں بحق۔ 15 مارچ لاہور کے علاقے یوحنا آباد میں دو گرجا گھروں میں دو خوکش حملے، 22 افراد ہلاک، 86 زخمی، یہاں دو بے گناہ مسلمان نوجوانوں کو مشتعل افراد نے زندہ جلا دیا۔

نوجوان کیا کہتے ہیں؟

پاکستان یوتھ پارلیمنٹ 2007ء میں قائم ہوئی تھی۔ گزشتہ کئی سالوں سے یوتھ

پارلیمنٹ ملکی مسائل اور حکومت کی پالیسیوں پر مکمل ریسرچ کے بعد ان میں بہتری کے لئے حکومت کو اپنی سفارشات پیش کرتی ہے۔ موجودہ حالات کے تناظر میں یوتھ پارلیمنٹ کی 10 رکنی قائمہ کمیٹی برائے تعلیم وامور نوجوانان نے تعلیمی ماہرین، سیاست دان، بیوروکریٹس اور ریسرچ اسکالرز سے قیمتی آراء لینے کے بعد "مدرسہ اصلاحات" پر ایک جامع رپورٹ پیش کی ہے۔ مدارس کی تعلیم: چیلنجز، اصلاحات، ممکنات کے عنوان سے شائع ہونے والی رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے یہ رپورٹ ملک میں بڑھتی ہوئی شدت پسندی، فرقہ پرستی کے سدباب میں نہایت کارگر ثابت ہوگی۔ رپورٹ کے مطابق ملک میں 20000 سے 30000 کے لگ بھگ مدارس موجود ہیں جو مسلکی بنیادوں پر پانچ مدارس بورڈ سے وابستہ ہیں۔ ان میں وفاق المدارس العربیہ (دیوبندی)، تنظیم المدارس (بریلوی)، وفاق المدارس السّلفیہ (اہلحدیث)، رابطہ المدارس الاسلامی (جماعت اسلامی) اور وفاق المدارس الشیعہ (اہل تشیع) شامل ہیں۔ رپورٹ کی چند سفارشات درج ذیل ہیں۔ رجسٹریشن: رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ حکومت سرکاری وغیر سرکاری تعلیمی اداروں کے رجسٹریشن کے ریکارڈ کی طرح ان تمام مدارس کا بھی مکمل رجسٹریشن ریکارڈ رکھے۔ وفاقی وصوبائی سطح پر مانیٹرنگ ٹیمیں تشکیل دی جائیں جو موجودہ نئے تعمیر شدہ مدارس کی رجسٹریشن کے لئے بنائے گئے طریقہ پر پوری نظر رکھے۔ ایڈمنسٹریشن: رپورٹ میں کہا گیا کہ موجودہ مدارس بورڈز کو آزاد وخود مختار امتحانی بورڈز کا درجہ دیا جائے۔ لیکن وہ بورڈز وزارت تعلیم یا وزارت مذہبی امور سے بھی منسلک ہوں تاکہ ان کا عصری علوم کے ساتھ بھی رابطہ استوار رہے۔ فنڈنگ: مدارس کی فنڈنگ کا کوئی حکومتی ذریعہ نہیں ہے بلکہ مدارس زکوٰۃ، چندہ، کھالوں اور مخیر حضرات کی طرف سے دیئے گئے عطیات پر چلتے ہیں جبکہ بنیادی مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں یہ مدارس بین الاقوامی برادری سے امداد وصول کرتے ہیں جو مسلکی بنیادوں پر ملتی ہے اور مسلکی وگروہی تعصبات کو ابھارنے میں استعمال ہوتی ہے۔ رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے کہ حکومت وفاقی

بجٹ میں ان مدارس کے لئے خاطر خواہ رقم مختص کرے اور بین الاقوامی ممالک سے ملنے والی امداد کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ نصاب: مدارس کے نصاب سے متعلق سفارش کی گئی کہ حکومت ان مدارس کے منتخب علماء سے ملکر ان کا نصاب تشکیل دے جو طلباء میں روایتی تعلیم کی ساتھ ان کی تخلیقی وتنقیدی صلاحیت کو بھی ابھارے۔ نیز اس نصاب میں سائنسی وفنی تعلیم بھی شامل کی جائے تاکہ طلباء مدارس سے فارغ ہو کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں اور ان کے لئے روزگار کے مواقع بھی میسر آ سکیں۔ ان سفارشات کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان یوتھ پارلیمنٹ نے ایک بنیادی خاکہ پیش کر دیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت ان سفارشات کو اہمیت دے اور مدارس کے نمائندہ علماء اور منتظمین سے ملکر ایک مشترکہ لائحہ عمل مرتب کرے تاکہ ملک میں بڑھتی ہوئی شدت پسندی کم ہو سکے اور پاکستان امن کا گہوارہ بن سکے۔

یوتھ پارلیمنٹ کی سفارشات پر ملک بھر میں موجود مساجد کے نیٹ ورک سے عملدر آمد کرایا جاسکتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک کے طول وعرض میں چھ لاکھ کے قریب مساجد ہیں۔ اگر وزارت مذہبی امور توجہ دے تو چھ لاکھ مراکز کو اصلاح معاشرہ اور تعلیم وتعلم کے لئے استعمال میں لا کر ملک میں انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے اور اگر ملک بھر کی مساجد کو منظم ومربوط کر دیا جائے تو یہ ملک کا سب سے بڑا قومی یکجہتی کا ادارہ بن سکتا ہے۔ ستم در ستم کہ وہ مقامات جہاں سے قال اللہ اور قال رسول اللہ کی صدائیں بلند ہونا چاہئیں وہاں سے کفر کے فتوے صادر ہو رہے ہیں۔ مسالک کی بنیاد پر نفرت کا پرچار کیا جارہا ہے۔ خدا اور رسولؐ کے خالص پیغام کی جگہ فرقہ وارانہ تعلیم عام کی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں دہشت گردی کے بعد سب سے بڑا عفریت فرقہ واریت ہے جس نے نہ صرف معاشرہ کو تقسیم کر دیا بلکہ بدامنی کو بھی ہوا دی۔

اللہ کے گھروں کو اللہ کا گھر بنانا کچھ مشکل کام نہیں ہے، اور اگر یہ واقعی اللہ کے گھر بن

جائیں، فرقہ واریت سے پاک ہو جائیں تو قومی یکجہتی کے خواب کی تعبیر مختصر عرصہ میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ ضرورت ہے چند اقدامات کی مگر اس کے لئے سیاسی مفادات سے بلند ہو کر سوچنا ہو گا۔

پہلا قدم ملک بھر کی مساجد کو رجسٹر کر کے ان کا ڈیٹا کمپیوٹرائزڈ کیا جائے۔ مساجد کی کمیٹیاں باقاعدہ منتخب کی جائیں، مساجد کے امام حضرات کے لئے ایک معیار مقرر کیا جائے۔ مدارس، یونیورسٹیز سے فارغ التحصیل ایسے حضرات جو امام و خطیب بننا چاہیں ان کی سرکاری سطح پر تربیت کے لئے نصاب مرتب کیا جائے۔ ایسا نصاب جو فرقہ واریت سے پاک ہو اور صرف قرآن و حدیث پر مبنی ہو۔ پھر اس نصاب کے تحت امتحان لے کر ایک سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے اور صرف اسی سرٹیفکیٹ کے حامل افراد کو ہی مساجد میں امام و خطیب مقرر کیا جائے۔ پرانی مساجد کی رجسٹریشن کے ساتھ نئی مساجد کے قیام کے لئے بھی پالیسی وضع کی جانا ضروری ہے۔ کسی بھی علاقہ میں مساجد آبادی کے تناسب کے مطابق ہونی چاہئیں۔ اگر ہر گلی محلے میں مسجد بنا دی گئی تو اہل ایمان میں رابطے، یکجہتی، اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے کے احوال سے آگہی حاصل کرنے کا ذریعہ ختم ہو جائے گا اور مسجد کا حقیقی مقصد بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ انگریز دور میں نئی عبادت گاہوں کی تعمیر کے لئے مقامی حکومت سے باقاعدہ این او سی حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہ قانون آج بھی لاگو ہے مگر اس پر عملدرآمد نہیں ہوتا، جس کا جی چاہتا ہے کسی بھی خالی جگہ، پارک، سرکاری اراضی پر راتوں رات مسجد تعمیر کر لیتا ہے۔

نئی مسجد کی تعمیر سے قبل ایک کمیٹی کی شرط عائد کی جائے، جو تمام انتظامات کو سنبھالے۔ جس اراضی پر مسجد تعمیر ہونا ہے اس کے کوائف کا جائز ہونا یقینی بنایا جائے اور زمین کی رجسٹری کسی شخصیت کے نہیں بلکہ انتظامی کمیٹی یا سرکار کے نام ہونی چاہئے (جیسا کہ انگریز دور میں ہوتا تھا)۔ مسجد کی انتظامی کمیٹی نہ صرف منتخب کی جائے بلکہ اس کی رجسٹریشن بھی ہونی

چاہئے۔ کسی بھی اسلامی ملک میں کسی کو یہ اجازت نہیں کہ وہ جب چاہے، جہاں چاہے مسجد تعمیر کر لے۔ سعودی عرب، ایران، ترکی، انڈونیشیا، ملائیشیا میں تو مساجد کی تعمیر، انتظام سب حکومت کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے ان ممالک میں مختلف مسالک کے باوجود فرقہ واریت کا زہر سرایت نہیں کر سکا، لہٰذا پاکستان میں بھی نئی مساجد کی تعمیر، پرانی مساجد کا انتظام، امام و خطیب کی تعیناتی، توسیع و مرمت کا انصرام حکومتی سطح پر کیا جائے۔

اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ نبی آخر الزماںؐ نے مسجد نبوی کے لئے جو جگہ منتخب فرمائی اس کی باقاعدہ قیمت ادا کی۔ توسیع کے وقت بھی پہلے اراضی کی قیمت ادا فرمائی، بعد میں وسعت دی۔ خلافت راشدہ کے دور میں بھی کسی ناجائز جگہ پر مسجد تعمیر نہیں کی گئی۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ نئی مساجد کے قیام کے لئے یا تو حکومت اراضی خود فراہم کرے یا منتخب کمیٹی کی طرف سے ادائیگی کی جائے۔ اس طرح مسجد کو کسی کے تسلط میں جانے اور کسی فرقہ کا گڑھ بننے سے روکا جاسکتا ہے۔ ورنہ آج مساجد ذاتی میراث بن چکی ہیں اور باپ کے بعد بیٹے کے قبضے میں آجاتی ہے۔

مساجد ہی کو اگر دن کے وقت تعلیمی اداروں میں تبدیل کر دیا جائے تو حکومت کو 6 لاکھ تعمیر شدہ اسکول میسر آسکتے ہیں اور یہ تبھی ممکن ہے جب مساجد کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہو۔ بلدیاتی الیکشن کرانے کے بعد مساجد میں ہی ثالثی اور مصالحتی عدالتیں قائم کر کے مقامی تنازعات، مقامی سطح پر طے کئے جاسکتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف فوری انصاف ہوگا، عدالتوں پر دباؤ میں کمی آئے گی اور حکومتی اخراجات میں بھی کمی آئے گی۔

گلی گلی مساجد ہونے کی وجہ سے نماز سے آدھ گھنٹہ قبل اذانیں گونجنا شروع ہوتی ہیں۔ ایک مؤذن دوسرے کی اذان ختم ہونے کے انتظار میں رہتا ہے، جیسے ہی ایک مسجد کی اذان ختم ہوتی ہے دوسری میں شروع ہو جاتی ہے۔ سننے والوں کے لئے ہر اذان کا جواب دینا ممکن نہیں جس کے باعث اذان کی بے توقیری اور عام مسلمان گنہگار ہوتے

ہیں۔اس لئے اگر علاقہ کی ایک بڑی مسجد میں لاؤڈ اسپیکر پر اذان دی جائے اور باقی مساجد میں بغیر لاؤڈ اسپیکر کے اذان کا قاعدہ مقرر کیا جائے۔اجتماع جمعہ کے سوا کسی بھی کانفرنس، اجتماع کے لئے مقامی حکومت سے اجازت لینا ضروری قرار دیا جائے۔تمام مساجد میں جمعہ کا وعظ سرکاری طور پر مرتب کر کے تمام مساجد کو فراہم کیا جائے اور یہ وعظ صرف قرآن و حدیث کی روشنی میں نصیحت و تلقین پر مبنی ہو۔اس کے ذریعے مذہبی منافرت پھیلانے کے بجائے حقوق اللہ، حقوق العباد کو عام کیا جائے۔قرآن وسنت کا حقیقی پیغام جو آج امت مسلمہ فراموش کر چکی ہے اس کا بار بار اعادہ کر کے اہل اسلام کو اسلام کی طرف آنے کی دعوت دی جائے۔آج ہم دہشت گردی کے خلاف قومی تاریخ کی سب سے بڑی جنگ لڑ رہے ہیں۔اس جنگ میں فتح کے لئے مساجد کا اہم کردار ہو سکتا ہے۔اگر ان کو مسلک کی دلدل سے نکال کر اللہ کا گھر بنا دیا جائے جہاں سے قال اللہ اور قال رسول اللہ کی صدائیں بلند ہوں، اہل علاقہ میں یکجہتی پیدا ہو اور لوگ ایک دوسرے کے قریب آئیں اور پوری قوم ایک لڑی میں پرو جائے۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ حکومت اور اتحاد تنظیمات المدارس دینیہ میں دینی مدارس کے نئے فارم کے تحت رجسٹریشن کرانے، مدارس کے بینک اکاؤنٹس کھولنے اور دینی مدارس کو تعلیمی بورڈ کا درجہ دینے اور وہاں جدید علوم پڑھانے پر اتفاق ہو چکا ہے۔یہ اتفاق رائے وفاقی سیکریٹری مذہبی امور اور دینی مدارس کی قیادت کے مشترکہ اجلاس میں سامنے آیا جس میں وزارت مذہبی امور کے سیکریٹری سہیل عامر، تنظیم المدارس کے صدر مفتی منیب الرحمٰن، وفاق تنظیم المدارس العربیہ پاکستان کے سیکریٹری جنرل قاری حنیف جالندھری، وفاق المدارس الشیعہ کے سربراہ قاضی نیاز حسین نقوی، وفاق المدارس اہلحدیث کے وسیم ظفر اور وفاق المدارس العربیہ السلفیہ کے مولانا عبدالمالک نے شرکت کی۔اجلاس میں مدارس کی رجسٹریشن، مدرسہ کی تعریف، علماء کے بینک اکاؤنٹس، فنڈنگ اور غیر ملکی طلباء کا

معاملہ بھی زیر بحث آیا۔ اجلاس کے دوران مدارس کے حوالے سے بنائے گئے نئے رجسٹریشن فارم کو مزید جامع بنانے پر اتفاق ہوا۔ علماء نے موقف اختیار کیا کہ مدرسہ اور مکتب میں تفریق کی جائے کیونکہ ہر مسجد میں مکتب ضرور ہے لیکن مدرسہ صرف وہی ہوتا ہے جہاں سے طالب علم فارغ التحصیل قرار پاتے ہیں اور انہیں اسناد جاری کی جاتی ہیں۔ انہوں نے وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا کہ 2010ء میں وفاقی حکومت اور اتحاد المدارس دینیہ میں معاہدہ ہوا تھا اس پر من و عن عمل درآمد کیا جائے۔ علماء نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ رجسٹریشن کے لئے ایک سرکاری اتھارٹی قائم کی جائے اور اگر کسی بھی سیکورٹی ادارے کو مدارس کے حوالے سے تفصیلات چاہیئے ہوں تو اسی اتھارٹی سے رابطہ کر کے حاصل کی جائیں اور مدارس کو تنگ نہ کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ مدارس کو سیکورٹی کی نظر سے نہیں بلکہ تعلیمی اداروں کی حیثیت سے دیکھا جائے اور بے جا پروپیگنڈا بند کیا جائے۔ وزارت مذہبی امور نے مدارس کی بیرونی و اندرونی فنڈنگ کا معاملہ بھی اٹھایا جس پر علماء نے کہا کہ انہیں بیرونی فنڈنگ کی مانیٹرنگ پر کوئی اعتراض نہیں ہم قومی دھارے میں آنے کے لئے تیار ہیں، شیڈول بینک ہمارے اکاؤنٹس نہیں کھولتے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو ہدایت کی جائے کہ مدارس کے بینک اکاؤنٹس کھولے جائیں تا کہ حکومت کے شبہات بھی دور ہو سکیں۔ ذرائع نے مزید بتایا کہ وفاقی حکومت اور علماء کرام میں دینی مدارس بورڈز کے قیام پر پیشرفت ہوئی ہے، اس سلسلے میں پانچ امتحانی بورڈز قائم کئے جائیں گے اور اس سلسلے میں باقاعدہ قومی اسمبلی سے قانون سازی کرائی جائے گی۔

دینی جماعتوں کی افادیت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے البتہ اپنے اپنے مفادات اور نظریات کے تابع ہر طبقہ انہیں اپنے طریقے سے چلانا چاہتا ہے۔ دینی مدارس کے لاکھوں طلبا اتنی بڑی قوت ہے کہ اگر اسے صحیح سمت پر ڈال دیا جائے تو پوری ملت اسلامیہ کا نصیب جاگ اٹھے اور مسلمان ایک بار پھر دنیا کی قیادت کے منصب پر فائض نظر آئیں گے مگر اس

مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان مدارس کا کلچر بدلنا پڑے گا۔ محض نصاب کی تبدیلی سے یہ مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی روح یہ ہے کہ دینی مدرسوں میں قومی دھارے کے اجزاء داخل کرنے کے بجائے ان مدرسوں کو قومی دھارے میں کھینچ کر لایا جائے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم اپنے تصور علم کی بناء پر دیگر اسکولوں اور درس گاہوں میں دی جانے والی تعلیم سے متصادم ہے۔ پاکستان کی قومی ریاست کو معاشی اور تمدنی سطح پر جدیدیت سے مفر نہیں۔ دینی مدارس نے جدیدیت کے مقابلے قدامت پسندی کو اختیار کر رکھا ہے۔ یہ محض مذہبی تعلیم کے بنیادی حق کا سوال نہیں ہے بلکہ اس کی مدد سے قوم میں ''پولرائزیشن'' پیدا ہوتی ہے۔

یہ جدیدیت اور قدامت کی پرانی لڑائی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ مدرسے کا مورچہ محفوظ ہے اور ہم نے عشروں کی محنت سے عمومی تعلیمی اداروں میں کامیاب نقب زنی کی ہے۔ تعجب نہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں قدامت پسند سوچ کو بالادستی حاصل ہے۔ اس سے قوم مجموعی طور پر فکری اور تمدنی پسماندگی کا شکار رہوئی ہے۔ یہ پوچھنا بے کار ہے کہ بیس ہزار سے زیادہ مدرسے قوم کے جی ڈی پی میں کیا حصہ ڈالتے ہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ ایک ہی ملک میں علم کے دو متصادم بیانیوں کی موجودگی سے قوم کی معاشی اور سیاسی پسماندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہماری حکومت کہتی ہے کہ دہشت گردی سے اب تک قوم کو 68 ارب ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اگرچہ وزیراعظم نے فرمایا ہے کہ مذہبی مدارس کو ریاستی نگرانی میں لائے بغیر دہشت گردی کی فکری نرسری ختم نہیں جاسکتی۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم شعوری سطح پر اس اقدام کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے دینی مدرسے معاشرے کا ایک اہم عنصر ہونے کے باوجود متنازعہ حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں ایک سے زیادہ متضاد آراء پائی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے، مگر جو خودستائی اور تعصب سے پاک بھی نہیں ہیں اور جن سے کسی مفید مطلب مثبت نتیجہ کے برآمد

ہونے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

میں اپنے علماء کرام سے کہتا ہوں کہ آپ قرآن و سنت کی فہم کے لئے صرف و نحو، لغت، ادب، معانی و بلاغت اور دیگر معاون علوم پڑھاتے ہیں، ان کو شروع ہی سے قرآن پر منطبق کریں اور طلباء و طالبات کو صیغوں (Tenses) کی تفہیم کے لئے بھی قرآن سے جوڑیں۔ یہ ہمارے بہت سے احباب کے علم میں نہیں ہے کہ اب ترجمۂ قرآن ہمارے ابتدائی نصاب کا حصہ ہے اور اسی طرح حدیث کی کتابیں ابتدائی درجات میں بھی شامل ہیں: تاہم قرآن و حدیث کو پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تفصیلاً پڑھانا اس دور کی ضرورت ہے، اس سے خود فکر میں وسعت پیدا ہوگی۔

باہمی اعتماد کے ساتھ مدارس کا مسئلہ حل کرنے کے لئے۔ سیاسی عزم (Political Will) کی ضرورت ہے۔ ہمارا تقریباً دو عشروں پر محیط مذاکرات کا تجربہ یہ ہے کہ ہماری سیاسی قیادت میں اس کا فقدان ہے، جب بھی ہمارے مسائل کسی حتمی حل کے قریب پہنچے تو بیوروکریسی نے اسے سبوتاژ کر دیا اور سیاسی حکمران لاتعلق سے ہو کر رہ گئے۔ ہماری بیوروکریسی کی ذہنی ساخت ہمیشہ یہ رہی کہ جس ادارے میں بیوروکریٹک کنٹرول نہ ہو، اسے قانونی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

انتہاء پسندی کا خاتمہ، واحد حل تعلیم

دنیا کا بدترین دور، ہر طرف ظلم اور قتل و غارت گری عام، شرافت ناپید، معمولی باتوں میں تنازع کے نئے پہلوؤں کی تلاش، کئی نسلوں اور برسوں پر محیط دشمنیاں۔ زمین لہو رنگ، انسانی خون ارزاں، گنے چنے تعلیم یافتہ لوگ مگر ان کی تعلیم بھی روح سے خالی، معاشرے کے وحشیوں کا اپنی ہی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کرنا......

پھر قدرت کو انسانوں پر رحم آیا۔ پیکر شرافت نبیؐ کے آنے سے عرب کے زمانۂ

جاہلیت کی یہ تصویر تبدیل ہوئی۔ حضورؐ نے دین اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ ان کی دی گئی تعلیم کے باعث اخوت، محبت، رواداری، برداشت، عفوو درگزر، عدل وانصاف اور سب سے بڑھ کر تحمل مزاجی نے انسانیت کو مرتبۂ کمال پر پہنچادیا۔ فتح مکہ کے وقت جب آپؐ مکہ میں داخل ہوئے تو اعلان ہوا۔

''آج کوئی غالب نہ مغلوب، کوئی فاتح نہ مفتوح، آج محبت واتحاد کا دن ہے، آج امن وامان اور اطمینان کا دن ہے۔''

یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ''تعلیم دراصل کیا ہے؟'' لفظ تعلیم ''علم'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں، جاننا، پہچاننا، معلومات رکھنا، محسوس کرنا اور یقین کرنا۔ اس اعتبار سے تعلیم کے لغوی معنی ہیں، ''پڑھانا اور لکھانا۔''

تعلیم کی ایک تعریف:

''تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے جو انسانی شخصیت کے ہر پہلو کی نشوونما کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس نشوونما کے باعث فرد نہ صرف خود کو پہچاننے کے قابل ہو بلکہ کائنات اور خالق کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت بھی حاصل کر سکے۔''

اس تعریف کی رو سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ تعلیم:

☆ سچائی کی جستجو کا عمل ہے۔

☆ تہذیب وتمدن کی تجدید اور تعمیر نو کا عمل ہے۔

☆ فرد کی صلاحیتوں کی نشوونما کی ضامن ہے۔

☆ فرد کو رضائے الٰہی کے حصول کے قابل اور معاشرے کا ایک ذمہ دار اور مفید رکن بناتی ہے۔

☆ فرد کو کامیاب زندگی گزارنے کے قابل بناتی ہے۔

☆ ایک مسلسل عمل ہے جس کا مقصد فرد کے کردار میں مثبت تبدیلی لانا ہے۔

☆فرد کو انسانیت کی معراج تک لے جانے کا زینہ ہے۔

☆فرد کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اظہار کے مواقع فراہم کرتی ہے۔

☆زندگی کے ادراک کا ایک موثر ذریعہ ہے۔

تعلیم کے یہ تمام پہلو انسان کو آگے بڑھنے پر اکساتے ہیں۔اس میں منفی سرگرمیاں ختم ہوتی ہیں اور وہ اپنے بجائے دوسروں کے وسیع تر مفاد کا خیال رکھتا ہے۔تعلیم اسے معتدل مزاج بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یہاں پر یہ سمجھنا بھی ضروری ہوگا کہ ''انتہا پسندی کیا ہے؟''انتہا پسندی لفظ''انتہا پسند'' سے نکلا ہے جو دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔انتہا اور پسند۔انتہا، یعنی آخری، حد، سرا، انجام، خاتمہ اور پسند، یعنی چاہنا، مرغوب، انتخاب۔ان معنوں کی روشنی میں ''انتہا پسند کسی کام کو آخری حد تک چاہنے والا ہے۔''

اسی طرح ''اعتدال پسند'' بھی دو الفاظ سے مل کر بنا ہے۔اس کے معنی ہیں۔برابر، نہ کمی نہ زیادتی۔میانہ روی پسند کرنے والا شخص اعتدال پسند ہے۔جب انسان میں تحمل مزاجی کا فقدان ہوتا ہے تو اس میں انتہا پسندی جنم لیتی ہے۔

مسلمانوں نے جب اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈالا تو اسلام کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا۔مذہبی منافرت کو ہوا دی جانے لگی تو صبر و برداشت اور شرافت کے پیرو کاروں کو ایک الزام سننا پڑا۔''انتہا پسند'' بد قسمتی سے چند مسلمانوں کے منفی کردار نے اس الزام کو حقیقت کا روپ بھی دے دیا۔اب اس الزام کی گونج چہار سو سنائی دیتی ہے اور امت مسلمہ اس کی صفائی پیش کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔وجہ صاف ظاہر ہے کہ 55 سے زائد اسلامی ممالک اور تعلیمی میدان میں موت کی سی خاموشی۔

حضورؐ نے غزوۂ بدر میں قید کئے گئے پڑھے لکھے کفار مکہ کا فدیہ یہ مقرر کیا تھا کہ ان میں سے ہر ایک دس مسلمانوں کو زیور علم سے آراستہ کرے۔تعلیمات نبویؐ ہر صدی اور ہر

دور میں قابل عمل ہیں۔ ذرا ان تعلیمات کی خصوصیات تو دیکھئے:

☆ جدید علوم وفنون کا فروغ۔

☆ قیام امن۔

☆ عدل وانصاف کا قیام۔

☆ مساوات۔

☆ انسانوں کے بنیادی حقوق۔

☆ اقتصادیات۔ (حلال معیشت، طبقاتی کشمکش کا خاتمہ)

☆ نظام اخلاق۔

جب نظام تعلیم میں یہ خوبیاں ہوں تو کیا انسان انتہا پسندی کی طرف جا سکتا ہے؟ اسلامی تعلیمات انسانوں کو خلاف طبیعت کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں، نہ ہی ان کے فطری میلانات کو روکتی ہیں۔ بلکہ وہ تو انہیں توازن اور اعتدال کے ساتھ مہذب بناتی ہیں۔

جب تعلیم نہ تھی تو اس وقت معاشرے کی کیا صورت حال تھی؟ اس بات کا اندازہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے اس مضمون سے لگایا جا سکتا ہے، جس کے مطابق:

☆ اسپین میں ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کے قافلے میں سے ایک لاکھ مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔

☆ چین میں کمیونزم نافذ کرنے کی خاطر ڈیڑھ کروڑ زمینداروں کو پھانسی دی گئی۔

☆ امریکی خانہ جنگی (25-1821) میں آٹھ لاکھ افراد مارے گئے۔

☆ 957 قبل از مسیح (یروشلم) میں پانچ لاکھ یہودی مارے گئے۔

مسلم معاشرہ نے بھی اپنی ترقی کا سفر تعلیم سے شروع کیا۔ تاہم، برسوں بعد جب علوم وفنون کی سرزمین بغداد کو منگولوں نے تاراج کیا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وحشی سدھر سکتے ہیں۔ کیا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے منگولوں نے بغداد کو

آگ لگا دی اور انسانی کھوپڑیوں کا مینار بنایا۔ پھر جب ان میں تبدیلی کی لہر پیدا ہوئی۔ وہ زمانے سے ہم آہنگ ہوئے تو تعلیم کی برکت سے وہ منگول سے ''مغل'' ہوئے اور ہندوستان میں ترقی کی بنیاد رکھی۔ اسی تعلیم کے باعث صلیبی جنگوں کے مسلمان فاتحین اپنے دشمنوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز اور مسلمان ایک دوسرے کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس مخالفت نے مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچایا۔ تاہم، سر سید احمد خان کی دور اندیشی نے مسلمانوں کو ایک راہ دکھائی۔ انہوں نے بتایا کہ منزل تک پہنچنے کے لئے تعلیم کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی نے تعلیمی انقلاب برپا کیا۔ بندوق کی بجائے گفتگو کے ذریعے آزادی کی راہ ہموار ہوتی رہی اور یوں پاکستان وجود میں آ گیا۔

دوسری جنگ عظیم میں جاپان اور امریکہ کی لڑائی کیسے بھلائی جا سکتی ہے؟ جاپانیوں کا پرل ہاربر تباہ کرنا، امریکہ کا ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کے دھماکے کرنا جس کے نتیجے میں جاپانی انتقام کی آگ میں جلنے لگے اور اپنے جسموں پر بم باندھ کر امریکی فوجیوں کو مارنے لگے۔ جب ان واقعات میں اضافہ ہوا تو امریکی اذہان نے فیصلہ کیا کہ شدت پسند جاپانیون کے لئے امریکی جامعات کے دروازے کھولنے ہوں گے۔ یہ فیصلہ منظور ہونے کے بعد ان واقعات میں کمی ہونے لگی۔ جاپانیوں نے تحمل مزاجی کو اپنا لیا اور آج عالم یہ ہے کہ جاپان کو تباہ کرنے والا امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ قرض لینے والا اور جاپان دنیا میں سب سے زیادہ قرض دینے والا ملک ہے۔

دنیا نے صرف پچیس برس کے قلیل عرصے میں دو جنگوں کا خونیں منظر دیکھا ہے۔ جنگ عظیم اوّل اور جنگ عظیم دوم، جنہوں نے لاکھوں انسانوں کو اس دنیا سے رخصت کیا۔ ان ادوار میں لوگ تعلیم کی صلاحیتوں کے معترف ہو رہے تھے مگر اسے حاصل کرنے کا رجحان اتنا زیادہ نہیں تھا۔ ان جنگوں کے بعد ہی یہ احساس ہوا کہ انتہا پسندی کے اس زور

سے نمٹنے کے لئے تعلیم ہی ایک موثر ہتھیار ہے۔ جب لوگوں نے خود کو اس ہتھیار سے لیس کیا تو وہ ترقی کی نئی جہتوں سے روشناس ہوئے۔ تعلیم نے ان کے ذہنوں کے بند دریچے کھول دیئے، دوسروں کو برداشت کرنے اور ان کے لئے وسعت قلبی کا احساس پیدا ہوا۔ تب انسان نے چاند کو تسخیر کیا، ایجادات وانکشافات کا لامحدود سلسلہ شروع ہوا۔ سیٹلائٹ کمیونیکیشن اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی نے انسان کو بام عروج پر پہنچا دیا۔

یہ تعلیم ہی تھی جس کی بدولت چین نے جنگ کی بجائے مذاکرات کے ذریعے اپنے علاقے حاصل کئے۔ مشرقی اور مغربی جرمنی دوبارہ یکجا ہوئے۔ تعلیم ہی نے منفی سوچ اور انتقامی جذبات رکھنے والوں کو تعمیری عمل کی طرف راغب کیا۔

ان مثالوں سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ تعلیم ہی امن اور بھلائی کا راستہ ہے۔ تعلیم کا بنیادی مقصد ہی فرد کو اعتدال پسند شہری اور اچھا انسان بنانا ہے۔ یہ تعلیم ہی ہے جو دنیا کی ثقافتوں اور تہذیبوں کو قریب لاتی ہے۔ تمام انسانوں سے پیار سکھاتی ہے۔ تعلیم ہی انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کے لہو کا رنگ ایک ہے، چاہے کوئی گورا ہو یا کالا، ایشیائی ہو یا یورپی، مسلم ہو یا غیر مسلم۔ یہ تعلیم ہی ہے جس نے ہر جذبے، ہر محبت اور ہر تمنا کو ایک نیا روپ دیا۔ تعلیم ہی بین المذاہب و بین الثقافت مکالمات کو فروغ دے سکتی ہے۔ مثبت فکر ہی مثبت رویوں کا ابلاغ کر سکتی ہے۔ لہٰذا، امن پسندی کے خیالات کو پروان چڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کی بہترین جامعات شدت پسندوں کے لئے اپنے دروازے کھول دیں جو نہ صرف انہیں بلکہ پورے عالم کو بدل دے۔ انتہا پسندی کی کونپلیں ہمیشہ بیمار ذہن سے پھوٹتی ہیں۔ اس بیمار ذہن کی معالج تعلیم ہے، جس کے بغیر انسان زندہ تو رہ سکتا ہے مگر اس کے پاس زندگی نہیں ہوتی۔

باب 4

☆......فوجی عدالتوں کا قیام پہلی بار نہیں ہوا۔

☆......ساٹھ دہشت گرد تنظیمیں

☆......دہشت گردی کی وجوہات

☆......فوجی عدالتیں کن مقدمات کی سماعت کریں گی۔

☆......فوجی عدالتوں میں کام کا آغاز

☆...... چھ ہزار رجسٹرڈ شدت پسند

☆......قومی ایکشن پلان، کامیابیوں کا آغاز

فوجی عدالتوں کا قیام پہلی بار نہیں ہوا

جب ریاست کو اپنا وجود خطرے میں نظر آئے تو وہ اپنی بقاء کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مذہبی اور فرقہ وارانہ دہشت گردی کے خلاف ریاست کو اکیسویں ترمیم کرنے کے غیر معمولی اقدامات کرنے پڑے۔ یعنی کہ ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں'' دو بڑی مذہبی جماعتوں نے ترمیم کے حق میں ووٹ نہیں دیئے اور یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ مذکورہ جماعتیں پاکستان بننے کی مخالف تھیں۔ آج ان جماعتوں کی فوجی عدالتیں قائم کرنے کی مخالفت ان کے ماضی کے نظریات کا تسلسل نظر آتا ہے۔ اکیسویں ترمیم کے ذریعے فوجی عدالتوں کا قیام انتہائی اہم نوعیت کا فیصلہ تھا۔ لیکن یہ کہنا بھی بجا ہے کہ غیر معمولی حالات میں غیر معمولی فیصلے کئے جاتے ہیں۔

اکیسویں آئینی ترمیم کے تحت بننی والی موجودہ فوجی عدالتیں پہلی بار قائم نہیں کی جارہیں تاہم یہ بات ضرور ہے کہ فوجی عدالتوں کو پہلی بار آئینی تحفظ دیا گیا ہے، اگر ہم اپنے ماضی کا جائزہ لیں تو فوجی عدالتیں مارشل لاء اور جمہوری ادوار میں بنائی جاتی رہی ہیں۔

☆ پاکستان میں سب سے پہلا مارشل لاء 1953ء میں لاہور میں نافذ ہوا، فوجی عدالتیں قائم ہوئیں جنہوں نے قادیانی مخالف فسادات میں حصہ لینے والوں کو سزائیں دیں، اگرچہ فسادات کی تحقیقات کرنے والے منیر کمیشن کی رپورٹ سے ثابت ہوا کہ پر تشدد واقعات کے پیچھے پنجاب کے وزیراعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ کا ہاتھ تھا اور مقصد مشرقی بنگال سے تعلق رکھنے والے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو کمزور کرنا تھا تاہم فوجی عدالتوں نے نہ صرف جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی، جمعیت علمائے پاکستان کے رہنما مولانا عبدالستار خان نیازی سمیت متعدد افراد کو سزائے موت اور دیگر

بہت سوں کو قید و بند کی سزائیں سنا دیں بلکہ ان افراد کو اپیل کے حق سے بھی محروم رکھا گیا۔ مسلم دنیا کی طرف سے آنے والے بے پناہ دباؤ کے نتیجے میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے مولانا مودودی اور عبدالستار نیازی کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی۔ سزا پانے والے بعض افراد جن میں روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر مولانا اختر علی خان شامل تھے۔

☆اکتوبر 1958ء میں جنرل ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کیا، انہوں نے پورے ملک میں فوجی عدالتیں قائم کیں، جہاں بائیں بازو کے کارکنوں اور قوم پرستوں کو سزائیں سنائی گئیں۔ ان میں بلوچستان کے نامور سردار نوروز خان اور ان کے بیٹوں، بھتیجوں کو سزائے موت جبکہ نواب اکبر بگٹی سمیت متعدد رہنماؤں کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ نوروز خان کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا البتہ ان کے جوان بیٹوں اور بھتیجوں کو پھانسیاں دے دی گئیں۔ مشرقی پاکستان، سندھ اور صوبہ سرحد میں بھی اسی طرح کا فوجی انصاف فراہم کیا گیا۔ ایوب خان نے دو سال بعد ہی مارشل لاء ختم کر کے عدالتیں کالعدم قرار دے دیں اور ملک کا روایتی عدالتی نظام بحال کر دیا۔

☆1969ء میں جنرل یحییٰ خان نے بھی مارشل لاء نافذ کر کے فوجی عدالتیں قائم کیں، یہاں نیشنل عوامی پارٹی، پیپلز پارٹی، عوامی لیگ، کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں کے خلاف کارروائی ہوئی۔ ملتان میں اللہ وسایا ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں کے مطالبات کی حمایت کرنے پر نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما اشفاق احمد خان، پیپلز پارٹی کے رہنما محمود نواز بابر، مزدور رہنما اشرف کو قید اور کوڑوں کی سزائیں دی گئیں۔ اس طرح پیپلز پارٹی کے رہنما معراج محمد خان کو بھی سزا سنائی گئی، ٹی وی کمپیئر طارق عزیز بھی سزا پانے والوں میں شامل تھے۔ معروف صحافی عبداللہ ملک نے بھی سزا پائی۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے لاتعداد کارکنوں کو طویل مدت کی سزائیں دی گئیں۔ سپریم کورٹ کے جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں 1972ء میں عاصمہ جیلانی بنام ریاست کیس میں مارشل لاء کے نفاذ کو

غیر آئینی اور فوجی عدالتوں کو انصاف کی پامالی کے مترادف قرار دیا تھا۔

☆ جنرل ضیاء الحق نے بھی 1977ء میں مارشل لاء نافذ کرتے ہی پورے ملک میں فوجی عدالتیں قائم کر دیں، ان میں خصوصی فوجی عدالتیں اور سرسری سماعت کی عدالتیں شامل تھیں، جنہوں نے لاکھوں لوگوں کو جو 1973ء کے آئین کی بحالی، پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے خلاف اور جمہوری حقوق کے لئے احتجاج کر رہے تھے، قید و جرمانے اور کوڑوں کی سزائیں دی گئیں، فوجی عدالتوں نے متعدد لوگوں کو سزائے موت دی، ان میں مکران کا ایک طالب علم حمید بلوچ بھی شامل تھا۔ بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خدا بخش مری نے فوجی عدالت کے فیصلے کیخلاف حکم امتناعی جاری کیا، انہوں نے عدالت میں یہ اعلان کیا تھا کہ وہ خود یہ حکم لے کر مچھ جیل جائیں گے۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے عبوری قانونی حکم نافذ کر کے جسٹس خدا بخش مری سمیت ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے بہت سے ججوں کو معزول کیا اور حمید بلوچ کو سزائے موت دے دی گئی، جنرل ضیاء الحق کی قائم کردہ فوجی عدالتوں نے سب سے زیادہ سزائیں سندھ میں دیں، بالخصوص ایم آر ڈی تحریک کے ہزاروں کارکنوں کو بھی سزائیں ملیں جن میں خواتین بھی شامل ہیں۔

☆ میاں نواز شریف نے بھی اپنے سابقہ دور میں کراچی کے مسئلے کا حل فوجی عدالتوں کو قرار دیا۔ جمہوری دور میں فوجی عدالتوں کے قیام کی بڑے پیمانے پر مذمت ہوئی۔ سپریم کورٹ نے فوجی عدالتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ نے 1999ء میں اپنے فیصلے میں فوجی عدالتوں کو غیر آئینی اور بغیر کسی منطق کے قائم کی جانے والی قرار دیا تھا، عدالت عظمیٰ نے اپنے فیصلہ پی ایل ڈی 1999ء سپریم کورٹ 504 جو کہ چیف جسٹس اجمل میاں اور دیگر جن میں سعید الزماں صدیقی، ارشاد حسن خان، راجہ افراسیاب خان، محمد شبیر جہانگیری، ناصر اسلم زاہد، منور احمد مرزا، مامون قاضی اور عبدالرحمٰن خان شامل تھے، نے دیا تھا۔ فیصلے میں کہا گیا تھا کہ ملک میں متوازی عدالتی نظام کی اجازت نہیں دی جاسکتی نہ ہی

آئین ایسی چیز کی اجازت دیتا ہے۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بعد دہشت گردی کے مقدمات کی عدالتوں کا قانون اسمبلی نے منظور کیا۔

جب سول عدالتیں فوری انصاف فراہم کرنے سے قاصر ہو جائیں تو اس کام کے لئے فوجی عدالتوں کا استعمال صدیوں سے کیا جا رہا ہے۔ عدالتوں کے لئے کافی منفی اثرات پیدا کیے۔ دنیا بھر میں انصاف کی فوری فراہمی کے لئے فوجی عدالتوں اور کمیشن کا قیام کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ دنیا کے کئی ممالک دہشت گردی کے خاتمے کے لئے فوجی عدالتیں قائم کر چکے ہیں، جن میں امریکہ سرفہرست ہے۔ پاکستان کی طرح دنیا بھر میں فوجی عدالتوں کے قیام پر انسانی حقوق کی تنظیمیں اپنے تحفظات کا اظہار کرتی رہی ہیں، جن ممالک نے اپنے حالات کے پیشِ نظر فوجی عدالتیں قائم کیں۔

☆امریکہ: امریکہ میں پہلی بار فوجی عدالتوں کا قیام انقلاب امریکہ کے دوران جنرل جارج واشنگٹن نے کیا۔ جس کے تحت جاسوسی کے الزام میں ایک برطانوی میجر جان اینڈری کو پھانسی دی گئی۔ 1861ء سے 1865ء تک امریکہ میں ہونے والی خانہ جنگی میں ریاست کے ساتھ لڑنے والے نسلی امریکیوں کو بھی فوجی عدالتوں نے ہی تختہ دار پر لٹکایا تھا۔ 1889ء میں اسپین کے ساتھ ہونے والی جنگ کے بعد امریکہ نے فلپائن مین ایک فوجی کمیشن قائم کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران صدر فرینکلین روز ویلٹ نے 8 جرمن قیدیوں کو سزائے موت دینے کے لئے فوجی عدالت قائم کی۔ ان افراد پر 'آپریشن پاسٹوریس' کے تحت امریکہ کی جاسوسی کرنے اور ملک میں انتشار پھیلانے کا الزام تھا۔ ان میں سے چھ افراد کو برقی کرسی پر بٹھا کر ہلاک کر دیا گیا، جبکہ دو افراد کو کچھ عرصے بعد رہا کر دیا گیا تھا۔ امریکہ کی بدنام زمانہ جیل 'گوانتاموبے' میں بھی ملٹری کمیشن ایکٹ کے تحت ایک فوجی کمیشن قائم کیا گیا ہے، جسے انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والی بین الاقوامی تنظیموں کے شدید تنقید کا سامنا ہے۔

☆ مصر: مصر میں آنے والے انقلاب کے بعد فوجی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا، جس میں شہریوں کے ٹرائل سے متعلق متنازعہ دفعہ کو بنا کسی ترمیم کے برقرار رکھا گیا ہے۔ مصر کے نئے دستور کی ترتیب و تدوین کا کام کرنے والے پچاس ارکان کے پینل میں سے 41 نے اس متنازعہ دفعہ کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ مصر میں قائم یہ فوجی عدالتیں اب تک سینکڑوں شدت پسندوں کے خلاف مقدمات کا فیصلہ سنا چکی ہیں۔ تاہم ان عدالتوں پر عام شہریوں پر بھی بلاجواز مقدمات قائم کرنے اور سزا دینے کے الزامات عائد کئے جا رہے ہیں۔

☆ بھارت: بھارتی پارلیمنٹ نے 2007ء میں 'آرمڈ فورسز ٹریبونل' کے نام سے ایک بل پاس کیا اور 8 اگست 2009ء کو اس وقت کے بھارتی صدر نے اس فوجی عدالت کا افتتاح کیا۔ یہ عدالتیں نئی دہلی اور علاقائی برانچیں چندی گڑھ، لکھنو، کولکتہ، گوہاٹی، چنائے، کوچی، ممبئی اور جے پور میں قائم کی گئیں۔ شروع میں ان فوجی عدالتوں میں ہائی کورٹ کے 9 ہزار سے زائد کیسز کو منتقل کیا گیا۔ بھارت میں بھی ان عدالتوں کے قیام پر حکومت کو سیاست دانوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

☆ جرمنی: جرمنی کا آئین وفاقی حکومت کو خصوصی حالات میں فوجی عدالتیں قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ تاہم ابھی تک یہاں فوجی عدالتیں بنائی نہیں گئیں ہیں اور دوران ملازمت کسی جرم کا مرتکب ہونے والے فوجی کو بھی سول پینل کوڈ اور ملٹری پینل کوڈ کے تحت سزا دی جاتی ہے۔ اس ملک میں کوئی وفاقی یا فوجی جیل نہیں ہے۔ اگر کسی سپاہی کو چھ ماہ تک کے لئے جیل میں ڈال کر فرد جرم عائد کی جائے تو اس پر عمل درآمد اس فوجی کی بیرک کی انتظامیہ کرتی ہے اور وہ فوجی حراست میں رہتے ہوئے اپنے یونٹ میں ڈیوٹی سرانجام دیتا رہے گا۔ تاہم اس مدت سے زائد سزا کی صورت میں فوجی کو ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا ہے اور وہ عام قیدیوں کی طرح جیل میں اپنی سزا پوری کرتا ہے۔

ساٹھ دہشت گرد تنظیمیں

دہشت گردی کے عفریت سے نمٹنے سے لے کر عوامی مسائل سے چشم پوشی تک ایک طویل فہرست ہے جس میں حکمران چارج شیٹ ہو چکے ہیں اور فوجی عدالتوں کے قیام کے حوالے سے سیاسی قیادتوں کے رویے نے جس قدر مایوس کن کردار ادا کیا ہے، آثار بتا رہے ہیں کہ آنے والے دنوں میں ان ''چشم پوشیوں'' اور ''ناروا رویوں'' کی قیمت چکانا پڑے گی۔ آپریشن ضرب عضب کے دوسرے مرحلے میں جہاں پاکستانی طالبان لپیٹ میں آچکے ہیں، اب وہاں ان کے ''ہمدردوں'' کی بھی سرکوبی کی جائے گی۔ یہ بات اب نوشتۂ دیوار ہے کہ پاکستان میں مذہب کے نام پر ''دکانداری'' نہیں چلے گی جو قومی دھارے میں آئے گا، وہی بچے گا۔ باقی سب ''قصۂ پارینہ ہو جائے گا'' یہ امر قابل افسوس ہے کہ انیس سو پچاسی کے بعد قائم ہونے والی تمام مرکزی حکومتیں ملک میں فرقہ وارایت اور مذہبی انتہا پسندی کی مذمت کرتی رہیں لیکن اس کے انسداد کے لئے کچھ بھی نہ کرسکیں اور بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ حکومتیں بالواسطہ طور پر انتہاپسندی کی معاون ثابت ہوئیں۔ کئی شواہد موجود ہیں کہ کس طرح بعض مواقع پر سیاسی فوائد کے حصول کے لئے انتہاپسندوں کو رعایتیں دی گئیں اور ان کو سرپرستی فراہم کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری اداروں میں بھی انتہاپسندوں کے معاونین سامنے آنے لگے جو سماج اور خود ریاست کے لئے خطرہ ثابت ہوئے۔ آج ہماری ریاست کی بقا کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ سانحہ پشاور نے ہمیں موقع فراہم کر دیا ہے کہ اب دہشت گردی سے لڑنے کے لئے ٹھوس اور مربوط اقدامات کئے جائیں اور ان وجوہات کا سدباب کیا جائے جو دہشت گردوں کی افزائش کا سبب بنتی ہیں۔

دہشت گرد ایک دن میں پیدا نہیں ہوتے، اچانک نہیں بن جاتے، ان کی نرسریاں ہیں جہاں یہ خوفناک پودے نشوونما پاتے ہیں۔ ان نرسریوں کا وجود ختم کرنا ہوگا، ان

نرسریوں کے ذمے داروں کو جڑ سے اکھاڑنا ہوگا۔ داعش کے حمایتیوں کو تلاش کرنا ہوگا یہ ایک فتنہ ہے جو امن عالم کو ہی نہیں مسلمانوں کو بھی تباہ کرنے اور اسلام کا چہرہ بگاڑنے میں ملوث ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو ہر جاندار کے حقوق کا ضامن ہے اور بلا وجہ ایک انسان کے ہاتھ سے چیونٹی کے ہلاک ہونے کو بھی ''جرم'' قرار دیتا ہے۔ وہ انسانوں کے ہلاک کرنے والے نظریے کی مذمت کرتا ہے۔ یہ انسانیت کے دشمن ہیں۔ انسانیت تمام عالم انسانیت کی میراث ہے لہٰذا یہ تمام بنی نوع انسان کے دشمن ہیں اور تمام انسانوں کو ان سے لڑنا اور انہیں ختم کرنا ہوگا چاہے وہ اسرائیل میں ہوں، بھارت میں یا پاکستان میں۔ ہر جگہ ان کا تعاقب کرنا اور ختم کرنا ہی اصل فلاح انسانیت ہے اور ان کے ساتھ ہی اس نظریے کا خاتمہ نرسریوں کے خاتمے کی صورت ضروری ہے۔ وہ نرسریاں کہاں ہیں اور کون ان نرسریوں کے ذمے داران ہیں یہ حکومت سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اب خاموشی کو توڑنے کا وقت آ گیا ہے۔

''داخلی سلامتی پالیسی'' کے دستاویزات میں حکومت نے ساٹھ تنظیموں کو کالعدم قرار دیا ہے۔ ان تنظیموں کے خلاف کارروائی کو قومی ایکشن پلان کا حصہ بنایا گیا ہے۔ کالعدم تنظیموں کی یہ فہرست نواز شریف کی جانب سے وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان نے پیش کی۔ صاف ظاہر ہے کہ جن دہشت گردوں اور ان کے سرپرستوں کے خلاف فوجی عدالتوں میں مقدمات چلیں گے ان کا تعلق انہی تنظیموں میں سے ہوگا۔ کالعدم تنظیموں کے نام یہ ہیں۔ (1) لشکر جھنگوی، سربراہ ملک اسحاق (2) سپاہ محمد پاکستان سربراہ علامہ سید محمد رضا نقوی (3) جیش محمد، سربراہ مولانا مسعود اظہر (4) لشکر طیبہ، سربراہ حافظ محمد سعید (5) سپاہ صحابہ پاکستان، سربراہ مولانا احمد لدھیانوی (6) تحریک جعفریہ پاکستان، سربراہ علامہ ساجد نقوی (7) تحریک نفاذ شریعت محمدی، سربراہ مولانا صوفی محمد (8) تحریک اسلامی سربراہ

علامہ حامد علی موسوی (9) القاعدہ، سربراہ ڈاکٹر ایمن الظواہری (10) ملت اسلامیہ پاکستان، سربراہ مولانا محمد احمد لدھیانوی (11) خدام الاسلام سربراہ مولانا مسعود اظہر (12) اسلامی تحریک پاکستان، سربراہ علامہ ساجد علی نقوی (13) جمعیت الانصار، سربراہ مولانا فضل الرحمان خلیل، (14) جمعیت الفرقان، سربراہ سربراہ کمانڈر جبار (15) حزب التحریر، سربراہ نوید اظہر حسین بٹ (16) خیر الناس انٹرنیشنل ٹرسٹ، سربراہ ابوشعیب (17) بلوچستان لبریشن آرمی، سربراہ حیر بیار مری (18) اسلامک اسٹوڈنٹس موومنٹ آف پاکستان (19) لشکر اسلامی، سربراہ منگل باغ (20) انصار الاسلام، سربراہ قاضی محبوب (21) حاجی نامدار گروپ، سربراہا حاجی نامدار (22) تحریک طالبان پاکستان، سربراہ مُلا فضل اللہ (23) بلوچستان ری پبلکن آرمی، سربراہ براہمداغ بگٹی (24) بلوچستان لبریشن فرنٹ، سربراہ ببرک بلوچ (25) لشکر بلوچستان (26) بلوچستان لبریشن یونائیٹڈ فرنٹ، سربراہ خیر بخش مری (27) بلوچستان مسلح دفاع تنظیم (28) شیعہ طلبہ ایکشن کمیٹی گلگت سربراہ آغا ضیاء الدین (29) مرکز سبیل آرگنائزیشن، سربراہ آغا ضیاء الدین (30) تنظیم نوجوانان سنت گلگت سربراہ قاضی نثار (31) پیپلز امن کمیٹی لیاری (32) اہلسنت والجماعت (33) الحرمین فاؤنڈیشن (34) رابطہ ٹرسٹ (35) انجمن امامیہ گلگت بلتستان سربراہ آغا راحت حسین (36) مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن گلگت بلتستان سربراہ شفاعت اللہ طارق (37) تنظیم اہلسنت والجماعت گلگت سربراہ احمد رضا خان بریلوی (38) بلوچستان بنیاد پرست آرمی (39) تحریک نفاذ امن 40) تحفظ وحدت اللہ (41) بلوچستان واجا لبریشن آرمی (42) بلوچستان ری پبلکن پارٹی آزاد (43) بلوچستان یونائیٹڈ آرمی (44) اسلام مجاہدین (45) جیش اسلامی (46) بلوچستان نیشنل لبریشن آرمی (47) خانہ حکمت (48) تحریک طالبان سوات (49) تحریک طالبان مہمند (50) طارق گیدڑ گروپ (51) عبداللہ عزام بریگیڈ (52) ایسٹ ترکستان اسلامک

موومنٹ (53) اسلامک موومنٹ آف ازبکستان (54) اسلامک جہاد یونین 313 (55) بریگیڈ (56) تحریک طالبان باجوڑ (57) امر بالمعروف ونہی عن المنکر حاجی نامدار گروپ (58) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد (59) یونائیٹڈ بلوچ آرمی (60) جئے سندھ متحدہ محاذ۔

دہشت گردی کی وجوہات

اس میں کوئی شک نہیں کہ دہشت گردوں نے اپنے انتہائی ظالمانہ، سفاکانہ، سنگدلانہ اور درندگی پر مبنی دہشت گردی کے اقدام کا جواز بعض صورتوں میں مذہب کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ یہ جماعتیں فکری تشنج میں مبتلا افراد کو اسلام کا داعی اور قبائلیت پر مبنی کلچر کو اسلامی کلچر قرار دیتی رہیں۔ ہمارے معاشرے میں شدت پسندی کی پانچ بڑی وجوہات ہیں، ''زیرو پوائنٹ'' والے سینئر کالم نگار جاوید چوہدری کے کالم ''ملٹری کورٹس'' کو گائیڈ لائن سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''ہماری شدت پسندی کی پانچ بڑی وجواہت ہیں، پہلی وجہ مذہب ہے، اسلام دنیا کا جدید ترین اور موسٹ ماڈرن مذہب تھا (یہ آج بھی ہے) لیکن ہم نے اسے قدیم ترین مذاہب کے برابر لاکھڑا کیا، کیسے؟ آپ وجہ ملاحظہ کیجئے، ہمارے مذہب میں سو شاندار ترین روایات ہیں، ان سو روایات میں سے ایک روایت ظلم کے خلاف جہاد ہے، دنیا کا کوئی مذہب لڑنے کا حکم نہیں دیتا، صرف اسلام کا اعزاز تھا کہ اس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ظلم کیخلاف اٹھنے، لڑنے، مرنے اور مارنے کا حکم دیتا ہے لیکن یہ حکم باقی ننانوے روایات کے ساتھ منسلک تھا، ہم جب تک باقی ننانوے روایات (احکامات) کو نہیں مانتے، ہم جب تک ان پر عمل نہیں کرتے ہم پر اس وقت تک یہ حکم لاگو نہیں ہوتا لیکن 1980ء میں بدقسمتی سے امریکہ کو افغانستان میں ہماری ضرورت پڑ گئی، اس نے اس وقت ایک امریکی اسلام وضع کیا، ہمارے حکمرانوں کو ترغیب دی اور ہم نے ملک میں امریکی

اسلام نافذ کر دیا، یہ اسلام صرف ایک حکم پر مبنی تھا اور وہ ''حکم'' تھا سوویت یونین کے خلاف لڑنا، مارنا اور مرنا عین فرض ہے، ہم نے اس دور میں اسلام کی ننانوے شاندار ترین روایات کو اس سے الگ کیا اور اس ''حکم'' کو پورا مذہب بنا دیا اور آپ جب بھی چار پہیوں کی گاڑی کو ایک پہیے پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں، اس کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جو آگے چل کر ہمارے ملک میں نکلا، آپ آج ملک میں نفاذ شریعت کا مطالبہ کرنے والے لوگوں کی تقریروں اور تحریروں کا مطالعہ کریں آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے یہ اسلامی سزاؤں کو شریعت سمجھتے ہیں، یہ قاتلوں کی گردنیں اتارنے، چوروں کے ہاتھ کاٹنے اور زنا کاروں کو سنگسار کرنے کو پورا مذہب سمجھتے ہیں، آپ ان سے پوچھیں کیا اسلام صرف یہ ہے؟ سزائیں کسی بھی مذہب، کسی بھی معاشرے کا صرف ایک جزو ہوتی ہیں، یہ کبھی کل نہیں ہوتی لیکن ہم نے سزاؤں کو کل مذہب بنا دیا اور یہ اس امریکی اسلام کا نتیجہ ہے جسے ہمارے حکمرانوں نے ذاتی مفاد کے لئے ملک میں نافذ کیا، ہم جب تک اسلام کی باقی ننانوے روایات واپس نہیں لائیں گے، ہم جب تک قوم کو یہ نہیں بتائیں گے گاڑی ایک پہیے پر نہیں چل سکتی ہمارے اندر اس وقت تک شدت پسندی کے جینز موجود رہیں گے، نبی اکرمؐ کی عمر مبارک 63 سال تھی، تبلیغ کا عرصہ 23 برس تھا، آپ نے 23 اور 40 برسوں میں صرف چند مرتبہ حدود جاری کیں جب کہ اسوۂ حسنہ 63 سال پر مبنی تھا، آپؐ کی جہادی زندگی کا نوے فیصد حصہ دفاع پر مبنی تھا، دس فیصد حصے میں حملہ آوروں کا پیچھا اور وعدہ خلافوں سے نبٹنا شامل تھا لیکن ہم نے اسوۂ حسنہ کو فراموش کر دیا اور تلوار اٹھالی، ہم جب تک ان ننانوے فیصد اسلام کو معاشرے میں زندہ نہیں کریں گے ہم اس وقت تک شدت پسندی کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

ہماری شدت پسندی کی دوسری وجہ فرقہ واریت ہے، ہم فرقوں میں بٹ چکے ہیں اور ہر فرقہ خود کو مسلمان اور دوسرے کو کافر سمجھتا ہے، یہ فرقے صرف فرقے نہیں ہیں، یہ انڈسٹری ہیں اور یہ انڈسٹری ہمارے دشمنوں، ہماری صفوں میں چھپے مفاد پرستوں اور چند

ناسمجھ مذہبی اسکالروں نے پیدا کی، یہ فرقے صرف فرقوں تک محدود رہتے تو بھی اتنے خوفناک ثابت نہ ہوتے لیکن ہر فرقے نے اپنی اپنی تقریبات، جلوس اور مظاہرے بھی شروع کر دیئے ہیں اور ان تقریبات کو بدقسمتی سے احکامات الٰہی سے زیادہ سماجی سپورٹ مل گئی، ہم جب تک فرقہ واریت کو ختم نہیں کریں گے، ہمارے اندر اس وقت تک شدت پسندی کے جینز موجود رہیں گی، ریاست کو سب سے پہلے فرقہ واریت پر مبنی تقریبات کو محدود کرنا ہوگا، مذہبی جلوسوں اور اجتماعات کو محدود کرنا ہوگا اور اس کے بعد فرقے کی عوامی شناخت ختم کرنا ہوگی، ہم صرف مسلمان ہیں، ہم میں سے جو شخص اپنی شناخت شیعہ مسلمان، وہابی مسلمان، اہلحدیث مسلمان اور بریلوی مسلمان کی حیثیت سے کروائے اس کے لئے کڑی سزا ہونی چاہئے، ہم جب تک یہ فیصلہ نہیں کریں گے ہم اس وقت تک بحران سے باہر نہیں نکل سکیں گے، ہماری شدت پسندی کی تیسری وجہ سیاسی جماعتیں ہیں، ہماری سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں نے ملٹری ونگز قائم کر رکھے ہیں، یہ ونگز مافیا کی طرح کام کرتے ہیں، یہ اغوا بھی کرتے ہیں، تاوان بھی وصول کرتے ہیں، قتل بھی کرتے ہیں اور قبضے بھی کرتے ہیں، یہ لوگ اس کام کے لئے نسل کو بھی استعمال کرتے ہیں، زبان کو بھی، صوبے کو بھی اور ثقافت کو بھی، یہ مافیاز پاکستان کو پاکستان اور پاکستانیوں کو پاکستانی نہیں بننے دے رہے، آپ کو یہ خرابی ماننا بھی ہوگی اور اس کا تدارک بھی کرنا ہوگا، حقیقت تو یہ ہے قوم کے موجودہ اتحاد کے دوران بھی یہ مسائل موجود تھے، ایم کیو ایم اکیسویں ترمیم کو صرف مذہبی جماعتوں اور مدارس تک محدود رکھنا چاہتی تھی جب کہ مولانا فضل الرحمٰن سیاسی جماعتوں کے ملٹری ونگز کو بھی اس میں شامل کرنا چاہتے تھے چنانچہ فوجی قیادت کی موجودگی میں ڈیڈ لاک پیدا ہوگیا تاہم ریاست نے آخر میں ایم کیو ایم کا مطالبہ مان لیا اور یوں مولانا فضل الرحمٰن باہر ہوگئے اور یہ 21 ویں ترمیم کا پہلا سیاسی سمجھوتہ تھا، آپ خود فیصلہ کیجئے ملک میں جب فرقے کی بنیاد پر قتل کرنے والے لوگوں کے مقدمے ملٹری کورٹس میں چلیں گے جب کہ کسی

سیاسی جماعت کا ملٹری ونگ اگر سو لوگ بھی مار دے، ریاست اس کا مقدمہ عام عدالتوں میں لے کر جائے گی تو کیا ہم ملک میں امن قائم کر سکیں گے، دہشت گرد کو صرف دہشت گرد ہونا چاہئے تھا، یہ مذہبی دہشت گرد اور سیاسی دہشت گرد میں تقسیم نہیں ہونا چاہئے تھا مگر حکومت نے اسے تقسیم کر دیا، ہم اب دو لوگوں کے قاتل کو سزائے موت دے دیں گے لیکن اڑھائی اڑھائی سو لوگوں کے ٹارگٹ کلرز جیلوں میں فائیو اسٹار سہولتیں انجوائے کریں گے، کیا ہمیں یہ منافقت ایک نئے بحران کی طرف نہیں لے جائے گی؟ کیا ہم اس صورت حال میں شدت پسندی کے جینز کو مار سکیں گے، ہماری شدت پسندی کی چوتھی وجہ بے روزگاری اور تربیت کی کمی ہے، دنیا میں تعلیم، صرف تعلیم نہیں ہوتی یہ تعلیم و تربیت ہوتی ہے جب کہ ہم صرف تعلیم کو فوکس کر کے بیٹھے ہیں، ہم نے تربیت کے عنصر کو وجود سے باہر نکال دیا، ہمارا تعلیمی نظام بھی اکتسابی زیادہ ہے اور عملی کم، ہم ہر سال لاکھوں بے ہنر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ پیدا کر دیتے ہیں، آپ انسانوں کا تھوڑا سا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ جانتے دیر نہیں لگے گی بے تربیت، بے ہنر تعلیم یافتہ شخص معاشرے کے لئے موت ثابت ہوتا ہے، ہماری ریاست جب تک تعلیم و تربیت کو تربیت و تعلیم نہیں بناتی اور یہ جب تک تعلیم کو ہنر اور ہنر کو روزگار کے ساتھ نتھی نہیں کرتی، ہمارا مسئلہ اس وقت تک قائم رہے گا، آپ تربیت کا باقاعدہ سلیبس تیار کریں اور اسکولوں کے پہلے تین سال تربیتی رکھیں، تعلیم چوتھے سال سے شروع ہونی چاہئے اور یونیورسٹیوں کو دس سال تک صرف پریکٹیکل علوم کے لئے وقف کر دینا چاہئے، یونیورسٹیوں سے صرف اعلیٰ ہنر مند باہر نکل سکیں اور یہ ہنر مند بھی برسر روزگار ہوں اور ہماری شدت کی پانچویں وجہ تفریح کی کمی ہے، ہمارے ملک میں اسپورٹس، لائبریریاں، فلم، میوزک اور چائے خانے ختم ہو چکے ہیں، یہ پانچ چیزیں جہاں بھی ختم ہوتی ہیں وہاں جنگیں شروع ہو جاتی ہیں یا پھر جہاں جنگیں شروع ہوتی ہیں وہاں سے یہ پانچوں چیزیں نقل مکانی کر جاتی ہیں، ہم جب تک انہیں واپس نہیں لائیں گے ہمیں اس وقت تک ملٹری کورٹس کے

عہد میں زندگی گزارنا پڑے گی۔

فوجی عدالتیں کن مقدمات کی سماعت کریں گی

آئین اور آرمی ایکٹ میں ترمیم سے وفاقی حکومت منتخب مقدمات فوجی عدالتوں میں بھیج سکے گی۔ مذکورہ آئینی ترمیم کے تحت کوئی بھی شخص جو کہ کسی دہشت گرد تنظیم سے منسلک ہو، مذہب یا کسی فرقے کا نام استعمال کرتا ہو، ہتھیار اٹھاتا ہو یا پاکستان کے خلاف جنگ میں ملوث ہو، یا مسلح افواج اور قانون نافذ کرنے والے اداروں پر حملے کرے، یا کسی کو تاوان کے لئے اغوا کرے، کسی کی موت یا زخمی ہونے کی وجہ سے بنے، یا اس کے قبضے میں ہتھیار، گولہ بارود ہو، یا وہ اس کے بانے یا ترسیل میں ملوث ہو، خودکش حملوں کے جیکٹس رکھتا ہو یا دہشت گردی کی کارروائیوں کے لئے گاڑیاں رکھی ہوں، ان کارروائیوں کے لئے اسے کسی بیرونی یا مقامی ذریعے سے مالی مدد مل رہی ہو، ریاست یا عوام یا کسی فرقے یا اقلیت کو خوف زدہ کرنے کے لئے کوئی کارروائی کرتا ہے، پاکستان میں دہشت اور عدم تحفظ کا موجب بنتا ہے، یا پاکستان کی اندر یا باہر مذکورہ کارروائیوں میں سے کسی کو کرنے کی کوشش کرتا ہے اسے آرمی ایکٹ کے تحت سزا دی جائے گی۔ مجوزہ ترامیم کے تحت درج ذیل جرائم کا مقدمہ فوجی عدالتوں میں چلایا جاسکے گا۔ 1) دھمکی، دھونس اور دیگر ایسے اعمال جن کے ذریعے کار سرکار میں مداخلت یا اثر انداز ہونے کی کوشش کی جائے یا حکومتی کارروائیوں کا بدلہ لینے کی کوشش کی جائے تاہم پرامن سول اور سیاسی احتجاج کی اجازت ہوگی۔ (2) نسلی، مذہبی، سیاسی اور اقلیتوں سے متعلق جرائم یا ایسے جرائم جو امتیازی سلوک، نفرت اور رنگ و نسل پر مبنی ہوں۔ (3) آتشزنی، خودکش دھماکے، کیمیائی ہتھیاروں، ایٹم بم، پلاسٹک و دیگر دھماکہ خیز مواد کا کسی انسان کو قتل کرنے یا املاک کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال۔ (4) عوامی مقامات، سرکاری عمارتوں کی حدود، عبادت گاہوں، تاریخی مقامات، تجارتی سرگرمیوں کے دوران

آتش زنی اور بموں کا استعمال جس سے کسی انسان کے ہلاک ہونے کا خدشہ ہو۔ (5) قتل، اغوا برائے تاوان، بھتہ خوری، عدلیہ، پارلیمنٹ انتظامیہ، میڈیا کے ارکان اور دیگر اہم شخصیات پر حملے۔ (6) مسلح افواج اور سیکورٹی ایجنسیوں سمیت سرکاری افسران کا قتل، اغوا، ان سے بھتہ لینا یا ہملہ کرنا۔ (7) غیر ملکی حکام، سرکاری مہمانان، سیاح، بین الاقوامی وفود وغیرہ کا قتل، اغوا، بھتہ یا ان پر حملہ کرنا (8) قتل، اغوا برائے تاوان، بھتہ، حملہ یا سماجی بہبود کے کام کرنے والوں بشمول محکمہ صحت کے اہلکار اور رضا کاروں پر حملہ کرنا شامل ہے۔

نیشنل ایکشن پلان پر عملدرآمد اور فوجی عدالتوں میں مقدمات بھیجنے کے لئے چاروں صوبوں میں سول اور فوجی اعلیٰ عہدیداروں پر مشتمل ''ایپکس کمیٹیاں'' قائم کی گئی ہیں۔ تبدیل شدہ آرمی ایکٹ کے تحت جو فوجی عدالتیں بنیں ہیں ان میں پاکستان کے خلاف جنگ کرنے والوں کو عبرت کا نشان بنایا جا سکے گا، فوج اور قانون نافذ کرنے والے اداروں پر حملہ کرنے والے کو قرار واقعی سزا دی جا سکے گی، اغوا برائے تاوان کے مجرم کو ''مہم جوئی'' پر مزا چکھایا جا سکے گا اور غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث افراد کو مالی معاونت فراہم کرنے والے کو ''سیدھی'' راہ دکھائی جا سکے گی۔ ترمیمی قانون کے تحت مذہب اور فرقے کے نام پر ہتھیار اٹھانے والے کو ''اوقات'' میں لایا جا سکے گا، دہشت گرد تنظیموں کے اراکین کو انسان بنایا جا سکے گا، سول اور فوجی تنصیبات پر حملہ کرنے والے کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکے گا اور دھماکہ خیز مواد رکھنے یا کہیں لانے لے جانے میں ملوث افراد کو ''بار برداری'' کے اس دھندے سے تائب کرانے کے بعد کسی اچھے کام پر لگایا جا سکے گا۔ آرمی ایکٹ اور آئین میں ترامیم کے بعد دہشت اور عدم تحفظ کا ماحول پیدا کرنے والے کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی اور بیرون ملک سے آکر پاکستان میں دہشت گردی کرنے والے ناسور کا خاتمہ کیا جا سکے گا۔ آرمی ایکٹ کے تحت مقدمہ حکومت کی پیشگی منظوری کے بعد چلایا جائے گا اور فوجی عدالت کو مقدمے کی منتقلی کے بعد مزید شہادتوں کی ضرورت نہیں ہوگی، اس کے علاوہ وفاقی

حکومت سول عدالتوں میں زیر سماعت مقدمات بھی فوجی عدالتوں میں بھیج سکے گی۔

امید ہے کہ فوجی عدالتیں آئین کی روشنی میں انصاف کے تقاضے پورے کریں گی اور بنیادی انسانی حقوق سلب نہیں کئے جائیں گے۔ فوجی عدالتوں کے قیام سے دہشت گردوں کو فوری سزائیں دے کر طالبان کو سخت پیغام دیا جائے گا کہ وہ قانون کی گرفت سے نہیں بچ سکیں گے۔ قومی ایکشن پلان پر عملدرآمد کے لئے صوبائی کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں۔ صوبائی دارالخلافہ کے کور کمانڈر ان کمیٹیوں کے رکن ہوں گے۔ پاکستان کے عوام قوانین پر فوری عملدرآمد اور نتائج دیکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ وہ دہشت گردی سے تنگ اور عاجز آچکے ہیں۔ فوجی آمروں کے طویل مارشل لاؤں کی وجہ سے افواج پاکستان کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ قومی سلامتی کی حساس نوعیت کی بناء پر فوجی قیادت اپنا مقدمہ عوام کے سامنے پیش نہ کرسکی۔ خدا کرے اب احتساب ہو، کڑا احتساب ہو، بے لاگ احتساب ہو، طالبانی دہشت گرد پھانسی پائیں تو مالیاتی دہشت گرد بھی کٹہرے میں کھڑے کئے جائیں۔ آج ملک غیر معمولی صورت حال میں ہے، بجلی ہے، نہ گیس، پیٹرول بھی نایاب جنس بن گیا۔ اسپتالوں میں علاج نہیں، تھانے کچہری میں شنوائی نہیں، اگر چند افراد پر خودکش دھماکے کرنے والوں کو فوجی عدالتوں میں جانا ہے تو پھر بیس کروڑ عوام کا ہر لمحے، ہر جگہ خون سوچنے والوں کو بھی فوری انصاف کے عمل سے گزارا جائے، گر یہ نہیں تو بابا! باقی کہانیاں ہیں۔ کیا چین میں انصاف نہیں، ترکی میں انصاف نہیں، برطانیہ میں انصاف نہیں، امریکہ میں انصاف نہیں، سعودی عرب میں انصاف نہیں۔ سب جگہ ہے تو پاکستان میں کیوں نہیں۔ بیرونی بینکوں میں پڑا پیسہ اور لاکروں میں پڑا زیور پاکستان کے خزانے میں واپس آنا چاہئے۔

فوجی عدالتوں میں کام کا آغاز

فوجی عدالتوں نے خطرناک دہشت گردوں کے 12 مقدمات سے اپنے کام کا آغاز

کیا، 7 فروری 2015ء کو پاک فوج کے ترجمان میجر جنرل عاصم سلیم باجوہ کی جاری کردہ پریس ریلیز میں بتایا گیا کہ صوبائی ایپکس کمیٹیوں نے مقدمات وزارت داخلہ کو بھجوائے جہاں چھان بین کے بعد انہیں فوج کو بھجوایا گیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق پہلے مرحلے میں 12 مقدمات فوجی عدالتوں کو سونپے گئے ہیں۔ جس کے بعد فوجی عدالتوں نے قانونی کارروائی کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔

آئی ایس پی آر کے مطابق فوجی عدالتوں کو بھجوائے گئے مقدمات خطرناک دہشت گردوں کے خلاف ہیں۔ ابتدائی طور پر ملک میں نو فوجی عدالتیں قائم کی گئیں جن میں پنجاب اور صوبہ خیبر پی کے میں تین تین، سندھ میں دو جب کہ بلوچستان میں ایک فوجی عدالت قائم کی گئی ہے۔ عسکری ذرائع کا کہنا ہے کہ بعد میں عدالتوں کی تعداد بڑھا دی جائے گی۔ حکومتی اہلکار کے مطابق حکومت اور عدلیہ مل کر عدالتی نظام میں موجود سقم اور کمزوریاں دور کرنے کے لئے تمام تر اقدامات کریں گی۔ ملک بھر میں جس طرح دہشت گردی کا عفریت سرایت کر چکا تھا اور یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اس کا مقابلہ نہ کیا گیا تو ملکی سلامتی اور بقا داؤ پر لگ جائے گی لہٰذا وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فوجی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ قومی ایکشن پلان کے تحت دہشت گردوں کو پھانسی کی سزائیں بھی دی گئیں جو کہ دہشت گردی میں ملوث افراد کے لئے واضح پیغام تھا کہ انہیں اب کہیں جائے پناہ نہ ملے گی اور انہیں کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔ بعض حلقوں کی جانب سے یہ شکایات سننے میں آ رہی تھیں کہ دہشت گردی کے الزامات میں گرفتار بہت سے ملزمان کے مقدمات سول عدالتوں میں طویل عرصے تک چلتے رہتے اور وہ ناکافی شہادتوں اور عدم ثبوت کی بناء پر ضمانت پر رہا ہو جاتے ہیں جس سے وہ دوبارہ دہشت گردی کی وارداتوں میں ملوث ہو جاتے ہیں اس طرح دہشت گردی کا جن قابو میں نہیں آ رہا۔ لہٰذا بعض حلقوں کی جانب سے سیکورٹی اداروں پر یہ الزامات لگائے جاتے رہے کہ وہ اپنے فرائض بااحسن انجام نہیں

دے رہے اور دہشت گردی پر قابو پانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ ان حالات کے تناظر میں یہ ضروری ہو چکا تھا کہ اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے سخت اقدامات کئے جائیں لہٰذا عسکری وسیاسی قیادت نے قومی ایکشن پلان کے تحت فوجی عدالتیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ عدالتیں دہشت گردوں اور طاقتور مافیا کے دھمکی آمیز رویے سے قطعی آزاد ہیں، اور مقدمات کا فیصلہ جلد اور بروقت کریں گی، اس طرح مجرموں کو انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ان کے کئے کی سزا دی جاسکے گی۔ بعض حلقے فوجی عدالتوں کے قیام پر اعتراضات اٹھا رہے اور اسے سول عدالتوں کے اختیارات کم کرنے سے تشبیہہ دے رہے ہیں مگر یہ نہیں بتا رہے کہ دہشت گردی کا آخر حل کیا ہے اور اس سے کیسے نجات ممکن ہے۔ جہاں تک مذاکرات کا تعلق ہے تو حکومت نے یہ بھی کر کے دیکھ لیا مگر انتہا پسند تنظیموں نے ان مذاکرات سے امن کا راستہ تلاش کرنے کے بجائے انہیں حکومت کی کمزوری سمجھتے ہوئے دہشت گرد حملوں کا سلسلہ جاری رکھا، ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ حکومت کو دباؤ میں لا کر مرضی کی شرائط منوانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ اس موقع پر بعض حلقوں کی جانب سے یہ کہہ کر خوف زدہ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی کہ اگر انتہا پسندوں کے خلاف آپریشن کیا گیا تو بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوگا اور اس کے باوجود انتہا پسندوں کو دبانے میں کامیابی نہیں ہوگی۔ مگر بالآخر فوج نے آپریشن ضرب عضب شروع کر کے ان تمام خدشات کو دور کر دیا اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے دکھا دیا کہ اگر عزم پختہ ہو تو بڑی سے بڑی برائی کا خاتمہ کرنا مشکل نہیں۔ انتہا پسند قوتوں کی حامی جماعتوں کو بھی نظر آ رہا ہے کہ اب طاقت کے زور پر اپنی بات منوانا ممکن نہیں رہا لہٰذا اپنی ناکامی کی خفت کو مٹانے کے لئے وہ فوجی عدالتوں کے قیام کی مخالفت پر اتر آئیں۔ انہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جب مرض حد سے بڑھ جائے تو مریض کی جان بچانے کے لئے آپریشن ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اب جو دہشت گرد ملکی امن و امان کے لئے خطرہ بن چکے ہیں اور دہشت گردی کی

کارروائیاں کر کے پورے ملک میں خوف و ہراس پھیلا رہے ہیں انہیں ان کے کئے کی سزا دینا لازم ہو چکا ہے۔ حکومت بارہا یہ واضح کر چکی ہے کہ فوجی عدالتوں کا استعمال سیاسی سطح پر نہیں کیا جائے گا اس کا خالصتاً استعمال دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث افراد کے خلاف ہی ہوگا۔ اس وقت دہشت گردی کے خاتمے کے لئے عسکری و سیاسی قیادت ایک صفحے پر ہے اور اس نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ جب تک اس ملک میں دہشت گرد موجود ہیں ان کے خلاف بھرپور آپریشن کا عمل جاری رہے گا۔ وزیراعظم بارہا اس عزم کا اظہار کر چکے ہیں کہ آخری دہشت گرد کے خاتمے تک جنگ لڑیں گے۔ پوری قوم دہشت گردی کے خلاف ہے اور اس ملک میں ہر ممکن طور پر امن چاہتی ہے۔ وہ قوتیں جو دہشت گردوں کے لئے نرم رویہ رکھتی ہیں انہیں بھی یہ سوچنا چاہیئے کہ اس طرح کا رویہ ملکی سلامتی کے لئے مستقل خطرہ ہے۔ لہٰذا انہیں مخالفانہ رویہ ترک کر کے حکومت کا ساتھ دینا چاہیئے تاکہ اس ملک میں ایک بار پھر امن کا بول بالا ہو سکے۔

مقدمات کے انتخاب کے لئے چاروں صوبوں میں سول اور فوجی قیادت پر مشتمل ایپکس کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں، جو بڑی احتیاط اور چھان بین کے بعد مقدمات کا چناؤ کر رہی ہیں۔ حتمی فیصلہ ہونے کے بعد ضروری کیس وزارت داخلہ کو ارسال کر دیئے جاتے ہیں جہاں مزید اسکروٹنی ہوتی ہے۔ یوں ہر مقدمہ غور و خوض اور چھان بین کے کئی مرحلے طے کر کے فوجی عدالتوں تک پہنچ رہا ہے۔ ایپکس کمیٹیاں تادم تحریر تیرہ سو کے قریب مقدمات فوجی عدالتوں کو بھیجنے کی نشاندہی کر چکی ہیں۔ حکومتی و عسکری حکام بار بار واضح کر چکے ہیں کہ فوجی عدالتوں میں مقدمات شدت پسند دہشت گردوں کی ہی بھجوائے جائیں گے جن کی سماعت بعض وجوہ کی بناء پر عدالتوں میں نہیں ہو سکتی۔

عدالتوں کی اہلیت اور ان کی قوت فیصلہ پر تو کوئی شک نہیں لیکن ہمارا تفتیشی نظام بہت ناقص ہے۔ پولیس کی نااہلیت اور کرپشن کی بناء پر بظاہر اچھے خاصے مضبوط، مقدمے

کمزور اور بودے رہ جاتے ہیں۔ بعض اوقات اتنی کمزور شہادتیں ہوتی ہیں کہ عدالت کو ملزم کو چھوڑنے یا اس سے نرم سلوک کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بھی بعض وجوہ ایسی ہیں کہ دہشت گرد عدالتوں سے قرار واقعی سزائیں نہیں پا سکتے۔ اِس میں دو رائے نہیں کہ فوجی عدالتیں، معروف جمہوری نظام کی ضد ہیں۔ لیکن اس کا کیا جائے کہ مجرم یہ آسرا لگائے رکھتے ہیں کہ وہ سزا سے بچ نکلیں گے۔ رہا یہ سوال کہ فوجی عدالتوں کے قیام کے بعد بھی دہشت گردی ختم نہ ہوئی تو پھر کیا کیا جائے گا؟ تحفظات رکھنے والوں کی نیت پر شک نہیں لیکن فی الوقت اس سوال کی حیثیت مفروضے سے زیادہ نہیں۔ بدقسمتی سے ایک جمہوریت پسند معاشرے کو یہ ناگوار فیصلہ کرنا پڑا لیکن اگر انصاف کے تمام تقاضے پورے ہوں، ملزم صفائی کا پورا حق استعمال کرنے کے بعد سزا پائے تو پھر اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔ سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ مقدمات کی ابتدائی چھان بین سویلین اور ملٹری قیادت پر مشتمل ایپکس کمیٹیاں کریں گی۔ ان کمیٹیوں کی حیثیت چھاننی کی سی ہے۔ بہت کم کیس ایسے نکلیں گے جو واقعی فوجی عدالتوں میں بھیجنے کے قابل سمجھے جائیں گے۔ دہشت گردی کی فضا میں فوجی عدالتوں کی تشکیل ایسے اقدامات کی حیثیت ''بغوض حلال'' کی سی ہے۔ اس سے سیاسی مخالفین یا علمائے حق کو خوفزدہ اور تنگ کرنا مقصود نہیں۔ امید ہے کہ فرقہ وارانہ دہشت گردی کا خاتمہ کرتے وقت نئے قضیے نہیں چھیڑیں گے اور فساد کے نئے دروازے کھولنے سے اجتناب کیا جائے گا۔ غیر جانبداری کو سختی سے ملحوظ رکھا جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت مسئلہ کے اس نازک پہلو سے آگاہ ہوگی۔

فوجی عدالتوں کے قیام کا مقصد انصاف کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا نہیں بلکہ ظالموں کو جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچانا مقصود ہے۔ ایک اچھا کام ہونے جا رہا ہے۔ فی الحال زیادہ مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں، تھوڑے ہی عرصے میں حسن وقبح واضح ہو جائے گا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ فوجی عدالتوں میں مقدمات بھجوانے سے قبل 176 ویں کور

کمانڈر کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اہم فیصلوں کی منظوری دی گئی۔ کانفرنس آٹھ گھنٹے تک جاری رہی اور اس میں شرکاء کو ملک کی داخلی و خارجی سلامتی کی صورت حال پر تفصیلی بریفنگ دی گئی، تاہم فوکس اس بات پر رہا کہ قومی ایکشن پلان پر انتہائی موثر اور تیز انداز میں عمل درآمد کیا جائے تا کہ ملک سے دہشت گردی کی لعنت کا مکمل خاتمہ ہو۔ کور کمانڈرز کانفرنس میں فوجی عدالتوں کے کام شروع کرنے کے بارے میں میکنزم کی بھی منظوری دی گئی۔ پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو فوج کی جانب سے ٹریننگ کا دائرہ کار پورے ملک میں وسیع کرنے کے حوالے سے بھی تبادلہ خیال کیا گیا۔ بتایا جا رہا ہے کہ جہاں تک فوجی عدالتوں کے کام شروع کرنے کے بارے میں میکنزم کا تعلق ہے، یقیناً اس حوالے سے آئینی اور بنیادی انسانی حقوق کے احترام کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ داخلی سیکورٹی پالیسی کے تحت انسداد دہشت گردی اتھارٹی کی زیر نگرانی انٹیلی جنس معلومات کے تبادلوں کے لئے جدید میکانزم تیار ہو چکا ہے۔ نئی سیکورٹی پالیسی سہ جہتی ہے۔ اس کے خفیہ، اسٹریٹجک اور آپریشن پہلو نمایاں ہیں۔ پالیسی کے اہداف واضح ہیں تاہم اہداف کے حصول کے لئے تمام اداروں کا اشتراک و تعاون ناگزیر ہے۔ یہ امر موجبِ طمانیت ہے کہ قوم دہشت گردی کے خلاف یکجان دو قالب ہو چکی ہے۔ وہ دہشت گردی کا قلع قمع کر کے پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست بنانے کے لئے سر بکف، کفن بر دوش اور سینہ سپر ہے۔ انسداد دہشت گردی کے لئے پاک افواج کے افسروں، جوانوں، پولیس کے افسروں، اہلکاروں، شہریوں، بچوں اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے بے مثال قربانیاں دی ہیں اور 50 ہزار سے زائد پاکستانی اس جنگ میں اپنی قیمتی جانیں نچھاور کر چکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک سزا و جزاء کا نظام نہیں ہوگا شہریوں اور حکومتوں کو دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ غیر معمولی حالات میں غیر معمولی فیصلے ناگزیر ہوتے ہیں۔

چیف آف آرمی اسٹاف جنرل راحیل شریف کے دورہ لندن کے موقع پر آئی ایس پی

آر کے ڈائریکٹر جنرل عاصم باجوہ نے فوجی عدالتوں کے بارے میں منفی تاثر پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فوجی عدالتیں بن چکی ہیں اب بحث کی بجائے آگے چلنے کا وقت ہے، یہ عدالتیں پارلیمانی ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی ہیں۔فوجی عدالتوں کو قانونی بنائے جانے کے بعد ہی پیشرفت بھی ہوئی ہے۔

چھ ہزار رجسٹرڈ شدت پسند

حکومت نے دہشت گردی کے خلاف قومی ایکشن پلان پر عملدرآمد کے سلسلے میں کالعدم تنظیموں سے وابستہ 6ہزار سے زائد شدت پسندوں کے خلاف کریک ڈاؤن کی فہرست تیار کی ہے۔قومی ایکشن پلان کے تحت 6ہزار سے زائد شدت پسندوں کے نام انسداد دہشت گردی ایکٹ 1977ء کے فورتھ شیڈول میں شامل کردیئے گئے۔انٹیلی جنس ایجنسیوں، پولیس اور پیراملٹری فورسز کے ذریعے ان کی گرفتاریاں عمل میں لائیں جائیں گی، خیبر پختونخوا میں 3ہزار سے زیادہ مشتبہ افراد کے خلاف کارروائی شروع کی گئی ہے جبکہ پنجاب میں 2200 مشتبہ دہشت گردوں کی گرفتاری کے احکامات جاری کئے گئے ہیں۔ سندھ میں 539افراد کے خلاف جن کے نام واچ لسٹ میں شامل تھے کارروائی کی جارہی ہے، بلوچستان میں 462، اسلام آباد میں 59اور گلگت بلتستان میں 39 شدت پسندوں کو گرفتار کرنے کے احکامات جاری ہوئے۔آرمی ایکٹ کی شق 24 کے تحت بننے والی فوجی عدالتوں میں ان سطور کی تحریر تک ابتدائی طور پر 57 مقدمات بھیج دیئے گئے ہیں۔البتہ اس کی درجہ بندی اس طرح کی گئی ہے کہ پہلے مرحلے میں انتہائی درجے کے دہشت گرد عدالتوں میں جائیں گے اور طریقہ یہ ہے کہ صوبے یہ نام وزارت داخلہ پاکستان کو بھیجیں گے اوران مقدمات کے سلسلے میں وہ اپنی تسلی کر کے فوجی عدالتوں میں بھیج دے گی۔ یہاں پر یہ خطرہ ہے کہ کسی سیاسی لین دین سے کوئی دہشت گرد فوجی عدالت میں جانے سے بچ سکتا

ہے مگر امید ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنا کام کریں گے اور وہ یہ یقینی بنائیں گے کہ کوئی دہشت گرد سزا سے نہ بچ سکے سو پنجاب میں ویسے تو 450 کیسز پر غور کیا جا رہا ہے مگر 147 جیٹ بلیک دہشت گردوں کے کیسز فوری طور پر بھیجے جا رہے ہیں جبکہ خیبر پختونخوا سے 91، بلوچستان سے 53، سندھ سے 194 کیسز ہیں تا حال سندھ حکومت نے 64 کیسز فوجی عدالتوں کو بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ 3 ہزار ملزمان ہیں جن کو فاٹا اور سوات سے پکڑا گیا ہے۔ وہ الگ سے فوجی عدالتوں میں چلیں گی، یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ ہر ملزم کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہوگا۔

فوجی عدالتوں سے ان مقدمات کے فیصلے ہونے کے بعد تصدیق کے لئے چیف آف آرمی اسٹاف کے پاس جائیں گے جن کے پاس JAG کا محکمہ ہے وہ اس کی قانونی اور شہادتوں کی جانچ پڑتال کے بعد چیف آف دی آرمی اسٹاف کو منظوری کے لئے بھیجے گا۔ آرمی چیف کے دستخط ثبت ہونے کے بعد سزا عمل میں لائی جائے گی۔ حکومت سندھ نے فوجی عدالتوں میں بھیجنے کے لئے 64 مقدمات کی منظوری دی ہے۔ جن میں ایئرپورٹ حملہ کیس، ڈاکٹر خالد مقبول سومرو قتل کیس، جسٹس مقبول باقر پر حملہ اور ایڈووکیٹ مبارک رضا کاظمی قتل کیس شامل ہیں۔ وزیر اعلیٰ سندھ کو مذکورہ کیسز فوجی عدالتوں کو بھیجنے کی سفارش سیکریٹری داخلہ کی سربراہی میں قائم لیگل کمیٹی نے کی تھی۔ کمیٹی کو آئی جی پولیس سندھ نے مجموعی طور پر 85 کیس بھیجے تھے تاہم کمیٹی نے ان میں سے کل 64 کیسز فوجی عدالتوں کو بھیجنے کے حق میں رائے دی۔ مجموعی طور پر وزیر اعلیٰ سندھ کے ترجمان کے مطابق وزیر اعلیٰ نے مذکورہ کیس فوجی عدالتوں کو منتقل کرنے کی منظوری آئی جی پولیس سندھ غلام حیدر جمالی کے ساتھ منعقدہ ایک خصوصی اجلاس میں دی۔ آئی جی سندھ نے وزیر اعلیٰ سندھ کو بتایا کہ جن کیسز کو فوجی عدالتوں میں بھیجنے کی منظوری دی گئی ہے ان میں ویسٹ زون کے 10 کیس، ساؤتھ کے 6 کیس، ایسٹ زون کے 3 کیس، ملیر زون کے 7 کیس، اے

وی سی سی کا ایک کیس اور جبکہ سکھر کا ایک کیس شامل ہیں۔ واضح رہے کہ سکھر سے فوجی عدالتوں کو بھیجے جانے والا کیس جی یو آئی سندھ کے سابق جنرل سیکریٹری ڈاکٹر خالد محمود سومرو قتل کیس ہے۔ لیگل کمیٹی کو کراچی سے تعلق رکھنے والے جن کیسز کے متعلق رائے مانگی گئی تھی ان میں 11 کیس ویسٹ زون، 20 کیسز ساؤتھ زون، 7 کیس ایسٹ زون، 11 کیس ملیر زون کے شامل تھے۔ وزیر اعلیٰ سندھ نے آئی جی پولیس کو ہدایت کی کہ تمام قوائد وضوابط کو پورا کر کے مذکورہ کیس وفاقی وزارت داخلہ کو ارسال کئے جائیں۔

قومی ایکشن پلان اور کامیابیوں کا آغاز

دو ماہ کی عرق ریز تفتیش کے بعد سیکورٹی کے ادارے بالآخر آرمی پبلک اسکول وارسک روڈ پشاور پر حملہ کرنے والے دہشت گردوں کے نیٹ ورک کا پتہ چلانے میں کامیاب ہو گئے۔ 12 فروری 2015ء کو پاک فوج کی جانب سے ایک پریس بریفنگ کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈائریکٹر جنرل انٹر سروسز پبلک ریلیشنز میجر جنرل عاصم سلیم باجوہ نے سانحہ پشاور کی تفصیلات، حملہ آوروں اور ان کے ماسٹر مائنڈز کے بارے میں قوم کو آگاہ کیا۔ بقول میجر جنرل عاصم سلیم باجوہ کے سانحہ پشاور میں 27 دہشت گرد ملوث تھے جن میں سے 9 مارے گئے، 12 گرفتار کر لئے گئے۔ چھ کی تلاش جاری ہے۔ حملے میں ملوث تمام دہشت گردوں کی شناخت ہو گئی ہے۔ پشاور مین بازار حملے میں بھی یہی دہشت گرد گروپ ملوث ہے جس میں بچوں اور خواتین سمیت 122 افراد شہید ہوئے تھے۔ آرمی پبلک اسکول پر حملے کی منصوبہ بندی پاک افغان سرحد سے ملحقہ علاقے میں ہوئی جبکہ حملے کا حکم ملا فضل اللہ نے دیا۔ ملا فضل اللہ نے ایک اور دہشت گرد کمانڈر عمر امین سے حملے کے بارے میں مشاورت کی اور اس سفاک کارروائی کا نگران مقرر کیا۔ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایف آر پشاور کے رہائشی دہشت گرد کمانڈر حضرت علی نے فنڈز اکٹھے

کیے۔ حملہ آور دو گروپوں میں پشاور پہنچے۔ آصف عرف حاجی کامران کو کمانڈر بنایا گیا جس نے دو گروپ تشکیل دیئے۔

ایک گروپ عتیق الرحمٰن کا تھا جو پکڑا جا چکا ہے۔ جبکہ دوسرا گروپ رضوان عرف تاج کا تھا، جسے سیکورٹی فورسز نے پکوائی کیمپ میں چھاپہ مار کر گرفتار کرلیا جہاں وہ آئی ڈی پیز کے بھیس میں پناہ گزین تھا۔ دہشت گرد نے اعتراف کرلیا ہے کہ اس کا تعلق 2008ء سے تحریک طالبان سے ہے۔ یہ شخص خیبر ایجنسی میں باڑہ کا رہنے والا ہے اور شمالی وزیرستان اور پشاور میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث رہا ہے۔ دہشت گردوں کا گروپ افغانستان ہی سے روانہ ہوا، پاکستان میں داخلے کے بعد خیبر ایجنسی کے علاقے جمرود میں چند دن قیام کیا اور پھر شدت پسند دو ٹکڑیوں میں پشاور پہنچے، ترجمان کے مطابق شدت پسندوں نے آرمی پبلک اسکول کے قریب ایک امام مسجد کے گھر قیام کیا جو محکمہ آبپاشی کا ملازم تھا، دہشت گرد سبیل نے حملہ آوروں کو ٹرانسپورٹ فراہم کی، صبح سویرے دونوں گروپ اکٹھے ہوئے اور اسکول پر حملہ کر دیا، انہوں نے بتایا کہ اسکول پر حملہ کرنے والے ہی پشاور مینا بازار حملے میں بھی ملوث تھے۔ جس میں خواتین اور بچوں سمیت 122 افراد شہید ہو گئے تھے۔ پاک فوج کے ترجمان نے بتایا کہ آرمی پبلک اسکول پر حملے کی پلاننگ افغان سرحد سے ملحقہ علاقے میں کی گئی تھی، ایف آر پشاور کے رہائشی حضرت علی نے منصوبے کے لئے فنڈز جمع کیے، پاکستان میں گرفتار ہونے والے عتیق الرحمٰن کی گرفتاری پر 50 لاکھ روپے کا انعام رکھا گیا تھا جبکہ ایک اور کمانڈر حضرت علی کی گرفتاری پر 25 لاکھ روپے کی انعامی رقم رکھی گئی تھی، انہوں نے افغانستان میں گرفتار چھ ملزموں کے حوالے کہا کہ پاکستان کی خفیہ معلومات پر یہ گرفتاریاں عمل میں لائی گئی ہیں۔ افغانستان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہے لیکن افغان حکومت ان کو ہمارے حوالے کر دے گی، انہوں نے کہا کہ ملا فضل اور عمر امیر اس وقت افغانستان میں چھپے ہیں، یہ کہیں جا نہیں سکتے، ضرور پکڑے

جائیں گے یا مارے جائیں گے، یہی ان کا انجام ہے، ہمارا افغانستان سے نمبر ایک مطالبہ ملا فضل اللہ کی حوالگی ہے، فوجی ترجمان نے بتایا کہ شمالی وزیرستان کے بیشتر حصے سے دہشت گردوں کا صفایا کیا جا چکا ہے اور اس علاقے سے نقل مکانی کرنے والوں کی واپسی کا آغاز مارچ سے متوقع ہے، انہوں نے کہا کہ پاکستان میں دہشت گردی میں بھارت ملوث ہے، بلوچستان کے حالات کی خرابی اور فاٹا میں کالعدم تحریک طالبان کے پیچھے بھارت کا ہاتھ ہے، بھارت ایک طرف لائن آف کنٹرول کے معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے، جبکہ دوسری طرف وہ اندرونی طور پر بھی ملوث ہے۔ انہوں نے کہا کہ بھارت خطرناک کھیل کھیل رہا ہے، خبردار کرتے ہیں انجام ٹھیک نہیں ہوگا، فوجی ترجمان نے کہا کہ کالعدم تحریک طالبان پاکستان اور بلوچستان میں بدامنی کے پیچھے بھارت ہے، دہشت گردوں کے خلاف مقدمے چلانے کے لئے ابتدائی طور پر 9 فوجی عدالتیں بنائی گئی ہیں ان میں ایف سی اہلکاروں کے گلے کاٹنے والوں کے مقدمات کی سماعت ہو رہی ہے، ضرورت پڑنے پر فوجی عدالتوں کی تعداد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ سندھ میں قائم کی جانے والی دو فوجی عدالتوں کا چارج باضابطہ طور پر لیفٹیننٹ کرنل رینک کے دو افسران نے سنبھال لیا ہے اور عدالتوں کے لئے فوجی عملہ بھی فراہم کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے گرفتار دہشت گردوں کے اعتراف جرم کی ویڈیو اور ملا فضل اللہ کی ٹیلی فون پر آرمی پبلک اسکول پر حملے کی ہدایات پر مبنی ٹیلی فونک گفتگو بھی سنوائی۔

فوجی عدالتوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ مقدمات کی خفیہ سماعت کر سکتی ہیں صدر پاکستان ممنون حسین نے فوجی عدالتوں کے سربراہوں، پراسیکیوٹرز، وکلا صفائی اور گواہوں کے تحفظ کے لئے آرمی ایکٹ میں ترمیم کی منظوری وزیراعظم کی ایڈوائس پر جاری کر دی ہے۔ فوجی عدالتوں کے پریذائیڈنگ افسروں، سربراہوں، پراسیکیوٹرز، وکلا صفائی اور گواہوں کے تحفظ کے لئے فوجی عدالت جو اقدامات تجویز کرے گی۔ انہیں جائز اور قانونی

تحفظ حاصل ہوگا۔فوجی عدالت کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا ہے کہ وہ دہشت گردی کے کسی بھی مقدمے کی اِن کیمرہ اور خفیہ سماعت کا حکم جاری کرسکتی ہے۔ترمیمی آرڈیننس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ ماضی کے جرائم پر بھی اس قانون کا اطلاق ہوگا۔فوجی عدالت کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ مقدمے کی سماعت کے دوران وہ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرسکے گی اور ویڈیو لنک کے ذریعے بھی مقدمے کی سماعت ہوسکے گی۔

ماضی کی حکومتوں نے انتہا پسندی اور لاقانونیت کی خاتمے کے لئے عزم صمیم کے اظہار میں کوتاہی برتی جس کے سنگین اور لرزہ خیز نتائج آج قوم کے سامنے ہیں۔اس لئے دہشت گردی عارضی جنگ، محدود مدت کا جنگی مشن یا آسان ٹارگٹ نہیں ہے، اس میں الجھنے کے بعد بڑے پیمانہ پر معاملات کو سلجھانے کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ مقابل جو قوتیں ہیں وہ ہتھیار اور خود ساختہ نظریہ سے مسلح ہیں اور اپنے مسلکی ایجنڈے کو قوم پر مسلط کرنے کی دیوانگی کا ابھی تک شکار ہیں، لہٰذا اس سوچ اور سرکشی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے سیاسی، عسکری اور قومی سطح پر اتحاد و اتفاق ضروری ہے تاکہ ایک طرف ملک دشمنوں کو داخلی شکست ہو تو دوسری طرف قومی معاشی انجن چلتا رہے، جمہوری حکومت کی معاشی ترجیحات کے طے شدہ اہداف تک رسائی اور نیشنل ایکشن پلان کی کامیابی کو ہر ممکن طریقے سے یقینی بنایا جائے۔یہ پلان قوم کی حقیقی امنگوں کا ترجمان ہے اور اس کو منطقی انجام تک خوش اسلوبی سے پہنچانے کے لئے مستقل مزاجی، عزم مسلسل اور دانشمندانہ حکمت عملی کی ضرورت ہے۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں کی طرف سے وزیراعظم نواز شریف کو 24 دسمبر 2014ء سے 21 فروری 2015ء تک نیشنل ایکشن پلان پر عملدرآمد کی رپورٹ پیش کردی گئی ہے جس کے مطابق اس عرصے کے دوران 19 ہزار 789 سرچ آپریشن ہوئے اور 19 ہزار 272 مشتبہ افراد کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔ملک بھر میں انٹیلی جنس معلومات کی بنیاد پر 1250 آپریشن کئے گئے۔مذہبی منافرت پھیلانے پر

558افراد گرفتار کیے گئے۔ 5066افغان مہاجرین کو واپس افغانستان بھیج دیا گیا۔ سیکورٹی ایجنسیوں نے پنجاب میں11634، سندھ میں3003، خیبر پختونخوا میں 3733، بلوچستان میں 57، اسلام آباد 368، آزاد جموں و کشمیر 891، گلگت بلتستان35اور فاٹا میں68 آپریشنز کیے۔ پنجاب میں2255، سندھ 3552، کے پی کے 9400، بلوچستان 3297، اسلام آباد 615، آزاد کشمیر سے سات، گلگت بلتسان سے 10اور فاٹا سے 136افراد کو گرفتار کیا گیا۔ پولیس نے لاؤڈ اسپیکر ایکٹ کی خلاف ورزی پر 2497افراد کو گرفتار کیا جن میں سے پنجاب سے 2160، سندھ چھ، کے پی کے 243، بلوچستان تین اور اسلام آباد میں85افراد کو گرفتار کیا گیا۔ نفرت انگیز تقاریر اور مواد پر580مقدمات درج کیے گئے جن میں سے پنجاب میں455، سندھ 11، کے پی کے 63، بلوچستان 4، آزاد کشمیر میں46اور گلگت بلتستان میں ایک مقدمہ درج کیا گیا۔

بلاشبہ مزید اعداد و شمار واضح کرتے ہیں کہ صورتحال حکومت اور عسکری جانبازوں کے مکمل کنٹرول میں ہے، دشمن شکست خوردگی کے احساس سے بوکھلاہٹ کا شکار ہے، اس کی خاموشی نئی فتنہ سامانی کا نکتہ آغاز بھی بن سکتی ہے، اس لئے چوکنا رہنا لازم ہے۔ بات آسکر وائلڈ نے سخت کہی ہے کہ امید پرستی کی بنیاد ہی دہشت گردی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ دشمن باہر کا ہو تو اس کی جارحیت کا مقابلہ ایک جنگی پلان کے ساتھ ہوتا ہے تاہم ان بے چہرہ اور روپ بہروپ دہشت گردوں کے ٹھکانے جو "عقابوں کے نشیمن" تھے بہت تیزی سے مسمار کیے گئی، یہ اگر سرنڈر نہیں کریں گے تو مارے جائیں گے، اور امید پرستی سے ہٹ کر یہ جارحانہ حکمت عملی پہلی بار سیاسی و عسکری پیج پر بنی ہے۔ چنانچہ وقت کا تقاضہ ہی کہ ہوم لینڈ سیکورٹی کے ویسے اقدامات آنے چاہئیں جن کا مظاہرہ سلامتی پر مامور غیر ملکی اداروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ کسی سرکاری یا ریاستی تنصیب و مقام یا اہم شخصیات و بے گناہ شہریوں کو یلغار یا خاموشی سے نقب لگا کر ہلاک کرنے کی واردات کے راستے بند ہونے چاہئیں۔ غلطی کی کوئی

گنجائش نہیں۔

میجر جنرل عاصم سلیم باجوہ کی پریس بریفنگ کو ابھی 24 گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ دہشت گردوں نے 13 فروری 2015ء کو پشاور کی مسجد میں نماز جمعہ کے دوران آرمی پبلک اسکول طرز کا ایک اور حملہ کیا جس میں تادم تحریر 22 نمازی شہید اور 67 زخمی ہو گئے۔ جمعہ کے روز مسلح حملہ آور موٹر کار نمبر ایل ای ای 1632 میں حیات آباد پشاور پہنچے۔ حملہ آوروں نے امامیہ مسجد کے قریب زیر تعمیر عمارت میں داخل ہونے سے قبل موٹر کار کو آگ لگا دی۔ زیر تعمیر مکان سے حملہ آوروں نے امامیہ مسجد پر دستی بموں سے حملہ کیا جس کے بعد حملہ آوروں نے امامیہ مسجد کے اندر گھس کر کلاشنکوفوں سے اندھا دھند فائرنگ کی، اس دوران نمازیوں نے حملہ آوروں سے ہتھیار چھیننے اور ان کو پکڑنے کی کوشش کی تو تین خودکش حملہ آور بھی امامیہ مسجد کے اندر داخل ہو گئے جن میں سے دو خودکش حملہ آوروں نے خودکش جیکٹس کے بٹن دبا دیئے جس سے زوردار دھماکے ہوئے اور ہر طرف لاشوں کے ٹکڑے بکھر گئے، تیسرے حملہ آور کی جیکٹ بٹن کی خرابی کی وجہ سے نہ پھٹ سکی تاہم حملہ آور سیکورٹی گارڈ کی فائرنگ سے ہلاک ہو گیا۔

دھماکے وقت مسجد میں کم و بیش 150 افراد موجود تھے تاہم ایک اور عینی شاہد نے بتایا کہ حملہ آوروں کی تعداد 6 سے 7 تھی۔ انہوں نے حملہ کرنے سے قبل اپنی گاڑی کو آگ لگائی، انہوں نے پہلے ہینڈ گرنیڈ سے حملہ کیا عینی شاہد نے بتایا کہ دھماکے کے بعد علاقے میں شدید فائرنگ کی آوازیں بھی سنی گئیں۔ آرمی پبلک اسکول پشاور حملے اور حیات آباد امام بارگاہ میں خودکش حملے میں مماثلت نظر آئی۔ آرمی پبلک اسکول میں حملے کی طرح حملہ آوروں نے حیات آباد میں بھی سیکورٹی کو منتشر کرنے کے لئے اپنی گاڑی جلا دی دونوں جگہ دستی بم استعمال کیا گیا۔ دہشت گردوں نے مسجد میں داخل ہونے سے پہلے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے پاس اپنی گاڑی کو جلایا اور دستی بم پھینک کر پولیس کی توجہ دوسری جانب کی

اور فائرنگ کرتے ہوئے مسجد میں داخل ہو کر خود کش دھماکہ کر دیا۔

آرمی پبلک اسکول پر حملے کی طرح حیات آباد حملے میں بھی دہشت گردوں نے مسجد کے عقب کا راستہ استعمال کیا۔ اس حملے کی منصوبہ بندی بھی افغانستان میں کی گئی۔ دہشت گردوں نے آرمی پبلک اسکول کی طرح یہاں بھی پہلے دستی بم پھینکے، فائرنگ کی اور خود کو دھماکے سے اڑا لیا۔ برطانوی نشریاتی ادارے کے مطابق حیات آباد امام بارگاہ حملے کی ذمہ داری پاکستانی طالبان نے قبول کر لی ہے اور کہا ہے کہ یہ ڈاکٹر عثمان کی پھانسی کا بدلہ ہے جسے جی ایچ کیو پر حملے کے الزام میں تختہ دار پر لٹکایا گیا تھا۔

قبل ازیں شکار پور کی امام بارگاہ پر حملے کی ذمہ داری بھی دہشت گرد قبول چکے ہیں۔ 17 فروری کو لاہور کی پولیس لائنز پر حملہ کرنے والوں نے پی ٹی سی ایل کے فون نمبر سے مختلف صحافیوں کو فون کر کے حملے کی ذمہ داری قبول کی بلکہ فون کرنے ایک سینئر صحافی کو ایس ایم ایس کر کے مذکورہ نمبر وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان کو دینے کا حکم دیا۔ حکومت کی طرف سے دہشت گردی کے خلاف جتنے بھی ایکشن پلان بنائے جا رہے ہیں اس کے خلاف دہشت گرد مسلسل ایکشن میں ہیں، کوئی مہینہ، کوئی عشرہ، کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا جب دہشت گرد اپنی موجودگی کا احساس نہ دلاتے ہوں۔ قومی ایکشن پلان آنے کے بعد دہشت گردی کے جو واقعات ہوئے ہیں ان کے پیچھے خاص منصوبہ بندی نظر آتی ہے۔ آئی ایس پی آر کے سربراہ میجر جنرل عاصم سلیم باجوہ نے درست کہا ہے کہ دہشت گرد قوم کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں تاکہ دہشت گردی اور انتہا پسندی سے نمٹنے کے قوم کے عزم کو کمزور کر دیا جائے۔ لگتا تو یہی ہے کہ دہشت گرد اب پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دینے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ ملک میں اس وقت 33 خفیہ ایجنسیاں کام کر رہی ہیں اور یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ بروقت مربوط انٹیلی جنس شیئرنگ کا ایسا نظام وضع کریں کہ دہشت گردوں کے بڑھتے قدم توڑ دیئے جائیں۔ ہم اجلاس پر اجلاس کئے چلے جا رہے ہیں اور دہشت گرد میدان عمل میں

دکھائی دیتے ہیں، جس کی وجہ سے اب تو قومی ایکشن پلان پر انگلیاں اٹھنا شروع ہو چکی ہیں۔

پچھلے دنوں اسلام آباد کی ایک تقریب میں نصف درجن سے زائد غیر ملکی سفیروں نے یہ سوال اٹھایا کہ پاکستانی قوم کی نگاہیں چیف آف آرمی اسٹاف کی طرف ہیں، ایسا کیوں ہے، یقیناً اس سوال کا جواب یہ ہے کہ 2001ء سے لے کر اب تک پاکستان میں جتنی حکومتیں آئیں ان میں سے کسی نے سنجیدگی سے دہشت گردی ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس مختلف حکومتیں، مختلف طریقوں سے دہشت گردوں کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلاتی رہیں۔ سب اپنی اپنی حکومت اور دولت بچانے کی فکر میں پڑے رہے۔ اس دوران پلوں کے نیچے پانی کی بجائے معصوم لوگوں کا خون بہتا رہا، جب خون کا یہ سمندر سے اونچا ہو گیا تو قوم کی نظریں اپنی فوج اور سپہ سالار پر مرکوز ہو گئیں۔ جب ہماری سلامتی کی یہ جنگ پورے ملک میں پھیل گئی تو یہ جنگ لڑنے کی ذمہ داری ہم نے فوج پر ڈال دی اور فوج کو عدلیہ کا بوجھ بھی فوجی عدالتوں کی شکل میں اٹھانا پڑ رہا ہے۔

جس وقت میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں (17 فروری 2015ء) عین اسی وقت یورپی پارلیمنٹ کا ایک وفد اسلام آباد کا دورہ کر رہا ہے۔ اس وفد کی خاتون سربراہ پاکستانی صحافیوں سے یہ سوال کرتی نظر آئیں کہ ''پچھلے بارہ سال سے دہشت گردوں کے خلاف آپریشن جاری ہے، ہزاروں لوگ مارے جا چکے ہیں، ہمیں ہر سال دو سال کے بعد پاکستان کی حکومتیں دہشت گردوں کو شکست کی نوید دیتی ہیں، دہشت گردوں کو اصل شکست آخر کب ہو گی۔ یورپی وفد کے ایک اور رکن کا کہنا تھا کہ 2008ء سے پہلے جو کہانیاں ہم جنرل پرویز مشرف سے سنتے تھے وہی کہانیاں ہم پانچ سال تک آصف زرداری سے سنتے رہے اور اب گزشتہ ڈیڑھ سال سے وہی کہانیاں ہمیں نواز شریف سنا رہے ہیں۔'' جب صورتحال یہاں تک پہنچ جائے تو دنیا کو پاک فوج اور اس کے سپہ سالار کی جانب دیکھنے کے سوا اور کون سا راستہ رہ جاتا ہے۔
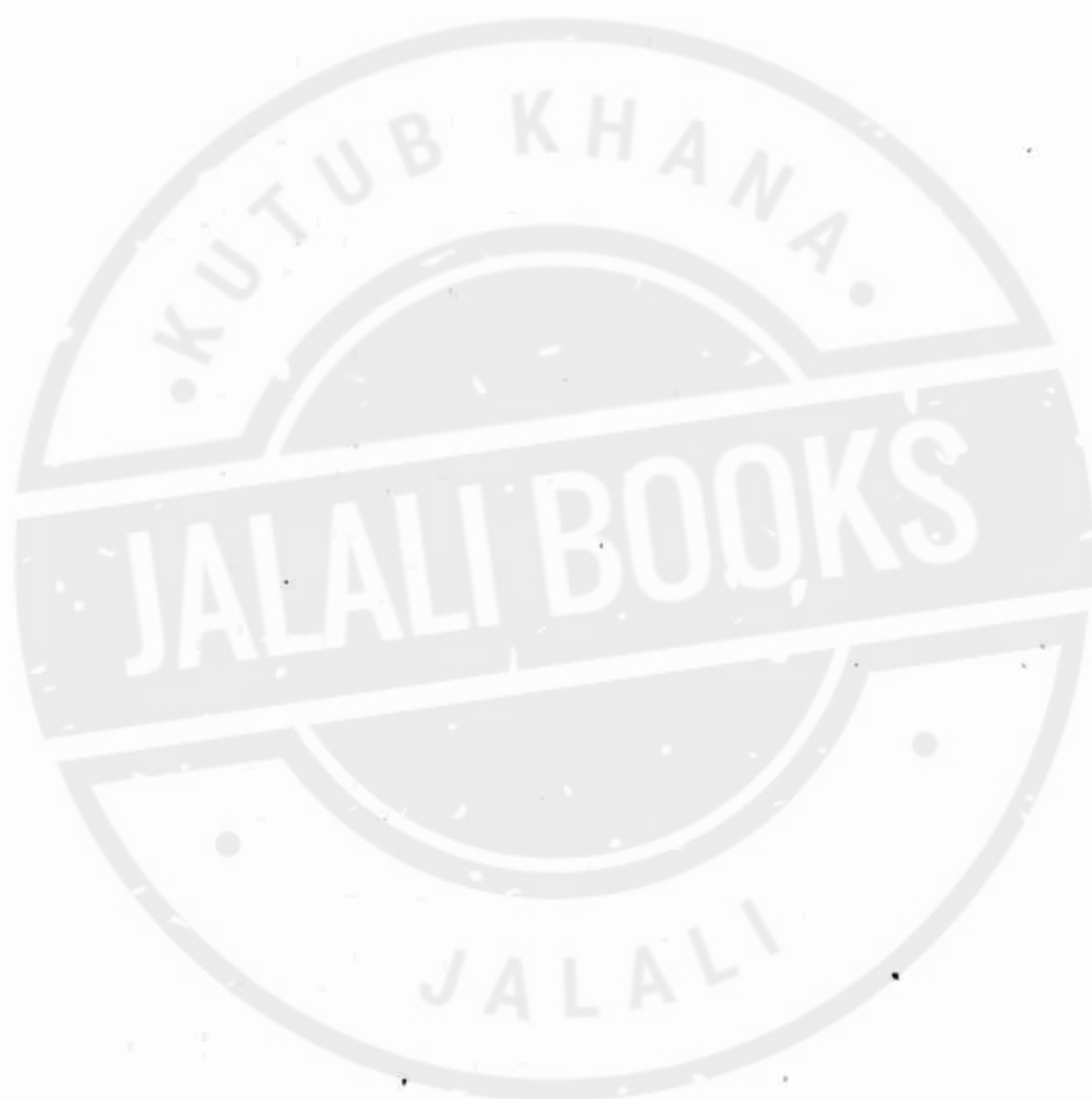
باب 5

☆......سیکورٹی کے اداروں پر دہشت گردوں کے حملے

☆......2012......خونی سال

☆......2012......خودکش حملے

☆......ہلاکتوں کے اعداد و شمار

☆......لاہور، دہشت گردوں کا خصوصی ہدف

☆......دہشت گردی اور معاشی تباہی

سیکورٹی کے اداروں پر دہشت گردوں کے حملوں کی تاریخ

ہمارے محافظ سیکورٹی کے ادارے مذہبی دہشت گردوں کا خصوصی نشانہ بنے رہے، ہمارے قومی سلامی کی اداروں کے شہدا کی تعداد ہزاروں میں ہے، اس دوران معصوم شہریوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ تعلیمی اداروں، عبادت گاہوں اور شفاخانوں پر حملے، بم دھماکے اور فائرنگ معمول بنا رہا۔ سیکورٹی کے اداروں پر دہشت گردوں کے حملوں کی طویل داستان ہے، جن کی تفصیلات درج ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔

1۔ 14 دسمبر 2003ء: جنرل پرویز مشرف کے ملٹری کانوائے پر اس وقت حملہ کیا گیا جب وہ راولپنڈی جا رہے تھے۔ بم ایک پل پر نصب کیا گیا تھا، جو کانوائے گزرنے کے چند منٹ بعد پھٹا اور جنرل مشرف محفوظ رہے۔

2۔ 25 دسمبر 2003ء: دو خودکش حملہ آوروں نے دوبارہ جنرل مشرف کو قتل کرنے کی کوشش کی، مگر مشرف بال بال بچ گئے، جبکہ 16 دیگر افراد ہلاک ہوئے، جن میں آرمی کے اہلکار بھی شامل تھے۔

3۔ 10 جون 2004ء: کراچی میں ایک دہشت گرد نے لیفٹیننٹ جنرل احسان سلیم حیات کے قافلے پر فائر کھول دیا۔ وہ بال بال بچ گئے۔ وزیرستان آپریشن شروع ہونے کے بعد پاک آرمی پر دہشت گردوں کا یہ پہلا حملہ تھا۔

4۔ 8 نومبر 2006ء: درگئی میں ایک خودکش حملے کے نتیجہ میں پاکستان آرمی کے 42 اہلکار شہید ہو گئے۔

5۔ 6 جولائی 2007ء: ڈسٹرکٹ دیر میں بم حملے کے نتیجے میں 4 آرمی اہلکار شہید ہوئے، جن میں ایک میجر اور لیفٹیننٹ بھی شامل تھے۔

6۔ 14 جولائی 2007ء: شمالی وزیرستان کے علاقے میران شاہ میں خودکش حملہ

آور نے بارود بھری گاڑی پیرا ملٹری فورس کے قافلے سے ٹکرا دی، جس کے نتیجے میں 23 اہلکار ہلاک اور 27 زخمی ہو گئے۔

7۔ 15 جولائی 2007ء: سوات کے علاقے مٹہ میں دو خودکش حملہ آوروں نے دو بارود سے بھری گاڑیاں ملٹری کانوائے سے ٹکرا دیں، جس کے نتیجے میں 11 سیکورٹی اہلکار اور چھ شہری شہید، جبکہ 47 زخمی ہوئے۔ 15 جولائی ہی کو ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک خودکش حملہ آور نے پولیس ریکروٹمنٹ سینٹر میں خودکو اڑا دیا جس کے نتیجے میں 25 اہلکار ہلاک اور 61 شدید زخمی ہوئے۔

8۔ 13 ستمبر 2007ء: تربیلا غازی کے مقام پر آرمی آفیسرز میس پر خودکش حملہ کے نتیجے میں 20 کمانڈوز شہید جبکہ 11 زخمی ہوئے۔

9۔ 25 اکتوبر 2007ء: سوات میں خودکش حملے میں فرنٹیئر کانسٹیبلری کے 18 اہلکار ہلاک، جبکہ 35 زخمی ہو گئے۔

10۔ یکم نومبر 2007ء: ایک خودکش حملہ آور نے سرگودھا کے نزدیک پاک فضائیہ کی ایک بس سے بارود بھری موٹرسائیکل ٹکرا دی، جس کے نتیجہ میں مصحف بیس پر تعینات 7 افسران شہید ہو گئے۔

11۔ 24 نومبر 2007ء: ایک خودکش حملہ آور نے اوجڑی کیمپ کے سامنے کھڑی انٹرسروسز انٹیلی جنس کی بس سے بارود بھری گاڑی ٹکرا دی، جس کے نتیجے میں آئی ایس آئی کے 28 افسر شہید ہو گئے، جبکہ اسی روز جی ایچ کیو میں داخل ہونے میں ناکامی کے بعد ایک خودکش حملہ آور نے خودکو اڑا دیا جس کے نتیجہ میں سیکورٹی اہلکار شہید ہو گیا۔

12۔ 13 دسمبر 2007ء: آرمی چیک پوسٹ کوئٹہ پر خودکش حملے کے نتیجے میں 3 آرمی اہلکار شہید ہو گئے۔

13۔ 15 دسمبر 2007ء: نوشہرہ میں ملٹری چیک پوسٹ کو ایک سائیکل سوار خودکش

حملہ آور نے اڑا دیا، جس کے نتیجے میں 5 افراد شہید اور 11 زخمی ہو گئے۔

14۔ 17 دسمبر 2007ء: کوہاٹ میں خودکش حملے کے نتیجے میں 12 سیکورٹی اہلکار شہید جبکہ 5 زخمی ہو گئے۔ یہ افراد آرمی فٹبال ٹیم کے کھلاڑی تھے۔

15۔ 10 جنوری 2008ء: لاہور ہائیکورٹ کے سامنے پولیس پر خودکش حملے میں 24 افراد شہید اور 73 زخمی ہو گئے۔ یہ لاہور میں اپنی نوعیت کا پہلا خودکش حملہ تھا۔

16۔ 4 فروری 2008ء: جنرل ہیڈکوارٹرز راولپنڈی کے نزدیک آرمی میڈیکل کالج کے طلبہ کی بس پر خودکش حملے میں 10 افراد شہید اور 27 شدید زخمی ہو گئے۔

17۔ 25 فروری 2008ء: جنرل ہیڈکوارٹرز راولپنڈی کے نزدیک آرمی کی گاڑی پر خودکش حملے میں لیفٹیننٹ جنرل مشتاق بیگ اپنے ڈرائیور اور سیکورٹی گارڈ سمیت شہید ہو گئے۔ اس سانحے میں 5 راہ گیر شہید اور 20 زخمی ہوئے۔

18۔ 4 مارچ 2008ء: پاکستان نیوی وار کالج لاہور کے پارکنگ ایریا میں دو خودکش حملوں میں 8 افراد شہید جبکہ 24 زخمی ہو گئے۔ یہ پاکستان نیوی پر دہشت گردوں کا پہلا حملہ تھا۔

19۔ 11 مارچ 2008ء: لاہور میں دو خودکش حملوں میں 24 افراد شہید اور 200 زخمی ہو گئے۔ پہلا حملہ ایف آئی اے کی بلڈنگ پر کیا گیا جس میں 16 پولیس اہلکار شہید ہوئے۔

20۔ 18 مئی 2008ء: مردان میں پنجاب رجمنٹ سینٹر پر خودکش حملہ ہوا۔ 4 فوجی شہید اور 20 سے زائد زخمی ہوئے۔

21۔ 12 اگست 2008ء: پشاور میں پاکستان ایئر فورس کی بس پر بم حملے میں 13 اہلکار شہید اور 11 زخمی ہوئے۔

22۔ 21 اگست 2008ء: پاکستان آرڈیننس فیکٹریز واہ کینٹ کے گیٹ پر دو

خوکش حملوں میں 70 افراد شہید اور 67 زخمی ہوئے۔

23۔6 ستمبر 2008ء: پشاور سے 20 کلومیٹر کے فاصلے پر پیراملٹری چیک پوسٹ پر خودکش کار حملے میں 30 افراد شہید اور 70 زخمی ہوئے۔

24۔22 ستمبر 2008ء: سوات میں چیک پوسٹ پر خودکش کار بم حملے میں 9 سیکورٹی اہکار شہید ہوئے۔

25۔9 اکتوبر 2008ء: پولیس ہیڈکوارٹرز اسلام آباد پر خودکش حملے میں 8 اہلکار شہید اور 8 ہی زخمی ہوئے۔

26۔16 اکتوبر 2008ء: مینگورہ میں پولیس اسٹیشن پر خودکش حملے میں 4 اہلکار شہید ہوگئے، جب کہ عمارت منہدم ہوگئی۔

27۔2 نومبر 2008ء: وانا میں خودکش حملے میں 8 آرمی اہلکار شہید ہوگئے۔

28۔4 نومبر 2008ء: ہنگو میں سیکورٹی چیک پوسٹ پر خودکش حملے میں 3 سیکورٹی اہلکار شہید جب کہ 6 زخمی ہوئے۔

29۔17 نومبر 2008ء: سوات کے علاقے کوازہ خیلہ میں کار بم خودکش حملے میں 3 فوجی شہید ہوگئے۔

30۔19 نومبر 2008ء: اسلام آباد کے نزدیک ایلیٹ کمانڈوز کے سابق سربراہ میجر جنرل (ر) امیر فیصل علوی کو ان کے ڈرائیور سمیت گولیاں مار کر شہید کردیا گیا۔

31۔4 جنوری 2009ء: ڈیرہ اسماعیل خان ملتان روڈ پر واقع امام بارگاہ پر خودکش حملہ کے نتیجے میں 3 پولیس اہلکار اور 2 صحافی شہید ہوگئے۔

32۔7 فروری 2009ء: میانوالی میں چیک پوسٹ پر حملہ میں 7 افسران شہید ہوئے۔

33۔23 مارچ 2009ء: پولیس اسپیشل برانچ آفس اسلام آباد پر خودکش حملے میں ایک سیکورٹی اہلکار ہلاک اور 3 زخمی ہوئے۔

34۔30مارچ 2009ء: مناواں پولیس ٹریننگ اسکول پر دہشت گردوں کے حملے میں 8 پولیس ریکروٹس شہید اور 93 کیڈٹ زخمی ہوئے۔

35۔4اپریل 2009ء: اسلام آباد مارگلہ روڈ پر قائم فرنٹیئر کانسٹیبلری کے کیمپ پر خودکش حملہ میں 8 ایف سی اہلکار شہید جبکہ 12 زخمی ہوئے۔

36۔15اپریل 2009ء: چارسدہ میں سیکورٹی چیک پوسٹ پر خودکش حملے میں 9 پولیس اہلکار شہید جبکہ 5 زخمی ہوئے۔

37۔18اپریل 2009ء:ہنگو میں چیک پوائنٹ پر کار بم خودکش حملے میں 5 سیکورٹی اہلکار شہید جبکہ 12 زخمی ہوگئے۔

38۔27مئی 2009ء:لاہور میں آئی ایس آئی کے دفتر کے قریب 100 کلوگرام بارود سے لدی گاڑی ٹکرا دی گئی۔ حملے میں 27 افراد شہید اور 326 زخمی ہوئے اور ریسکیو 15 کی دو منزلہ عمارت تباہ ہوگئی۔

39۔6جون 2009ء ریسکیو 15 ہیلپ لائن یونٹ اسلام آباد، خودکش حملے میں 2 پولیس اہلکار شہید، 20 زخمی۔

40۔26جون 2009ء آزاد جموں و کشمیر میں آرمی کی بس پر خودکش حملے میں دو فوجی شہید ہوگئے۔

41۔10جولائی 2009ء:باجوڑ میں سیکورٹی چیک پوائنٹ پر حملے میں 4 پولیس اہلکار شہید ہوئے۔

42۔15جولائی 2009ء: بنوں میں سڑک کنارے نصب بم پھٹنے سے 2 پولیس اہلکار شہید ہوئے۔

43۔19جولائی 2009ء: خیبرایجنسی کے نزدیک پولیس پٹرولنگ پر حملہ میں 4 اہلکار شہید ہوگئے۔

44۔28جولائی 2009ء: شمالی وزیرستان میں 3 سانحات میں 7پولیس اہلکار شہید ہوئے۔

45۔4اگست 2009ء: بلوچستان میں علیحدگی پسندوں نے 4پولیس اہلکاروں کو شہید کردیااور 21 یرغمالیوں کو مارنے کی دھمکی دی۔

46۔9اگست 2009ء: بلوچستان میں سرگرم علیحدگی پسندوں نے 4پولیس اہلکاروں کوشہید کردیااور 12 یرغمالیوں کو مارنے کی دھمکی دی۔

47۔13اگست 2009ء: کوئٹہ کے نواح میں پولیس کی گاڑی پر راکٹ حملے میں 2اہلکار شہیداور 3 زخمی ہوئے۔

48۔15اگست 2009ء: سوات میں کار بم خودکش حملے میں 3 فوجی شہید ہوئے۔

49۔27اگست 2009ء: طورخم میں افطاری کے وقت سیکورٹی چیک پوسٹ پر حملے میں 22 خاصہ دار شہید ہوگئے۔

50۔30اگست 2009ء: مینگورہ، سوات میں مرکزی پولیس اسٹیشن پر خودکش حملے میں 16 اسپیشل پولیس فورس کے اہلکار شہیداور 5 زخمی ہوئے۔

51۔10اکتوبر 2009ء: جی ایچ کیوراولپنڈی پر حملے میں 22 افراد شہید ہوئے، جن میں 5 ایس ایس جی کمانڈوز تھے۔

52۔12اکتوبر 2009ء: ملٹری کانوائے پر حملے میں 41 عام افراد جبکہ 6 فوجی شہید ہوئے۔

53۔16اکتوبر 2009ء: ایف آئی اے، مناواں پولیس ٹریننگ اسکول اور ایلیٹ پولیس اکیڈمی پر حملہ میں 26 سیکورٹی اہلکار شہید ہوئے۔

54۔22اکتوبر 2009ء: اسلام آباد میں حاضر سرور بریگیڈیئر معین الدین احمد کو ڈرائیور سمیت شہید کردیا گیا۔

55۔23 اکتوبر 2009ء: پاکستان ایروناٹیکل کمپلیکس کامرہ کے نزدیک پولیس چیک پوسٹ پر خودکش حملے میں ایئرفورس کے 2 اہلکار شہید ہوئے۔

56۔27 اکتوبر 2009ء: اسلام آباد میں فوجی آفیسر بریگیڈیئر وقار احمد کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔

57۔13 نومبر 2009ء: آرٹلری روڈ پشاور پر آئی ایس آئی کے دفتر کے قریب واقع چیک پوسٹ پر خودکش حملے میں 10 فوجی شہید اور 50 زخمی ہوئے۔

58۔4 دسمبر 2009ء۔ راولپنڈی کنٹونمنٹ میں نماز جمعہ کے وقت مسجد میں حملے میں 40 افراد شہید 86 زخمی ہوئے، شہداء میں غالب تعداد فوجیوں کی تھی۔

59۔27 اکتوبر 2009ء: اسلام آباد میں فوجی آفیسر بریگیڈیئر وقار احمد کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔

60۔13 نومبر 2009ء: آرٹلری روڈ پشاور پر آئی ایس آئی کے دفتر کے قریب واقع چیک پوسٹ پر خودکش حملے میں 10 فوجی شہید اور 60 زخمی ہوئے۔

61۔4 دسمبر 2009ء: کنٹونمنٹ ایریا ملتان میں آئی ایس آئی کے دفتر کے قریب خودکش حملے میں 12 ہلاک جبکہ 27 زخمی ہوئے۔

62۔8 دسمبر 2009ء: کنٹونمنٹ ایریا ملتان میں آئی ایس آئی کے دفتر کے قریب خودکش حملے میں 12 ہلاک جبکہ 47 زخمی ہوئے۔

63۔10 فروری 2010ء: خیبر ایجنسی میں دہشت گردی اور دیگر سانحات میں بریگیڈیئر سمیت 15 فوجی شہید۔

64۔23 اپریل 2010ء: شمالی وزیرستان میں پاک آرمی کے کانوائے پر حملے میں 7 فوجی شہید اور 16 زخمی ہوئے۔

65۔14 جون 2010ء: مہمند ایجنسی میں 7 پیراملٹری فوجی شہید ہوئے اور 10 کو

یرغمال بنالیا گیا۔

66۔22 اکتوبر 2010ء: اورکزئی ایجنسی میں کرنل سمیت 6 پاکستانی فوجی شہید ہوئے۔

67۔13 مئی 2011ء: چارسدہ میں پیرا ملٹری ٹریننگ اکیڈمی پر خودکش حملے میں 80 افراد شہید اور 15 زخمی ہوگئے۔

68۔22 مئی 2011ء: کراچی میں مہران نیول اسٹیشن پر دہشت گردوں کے حملے میں اطلاعات کے مطابق 10 جانیں گئیں، جب کہ امریکہ کی جانب سے دیئے گئے دو P-3C اورین طیارے بھی تباہ ہوگئے۔

2012ء خونی سال

مذہب کے نام پر دہشت گردی کرنے کا سلسلہ 2012ء میں بھی جاری رہا۔ مختلف اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹس کے مطابق

جنوری: یکم، سوئی، ریموٹ کنٹرول دھماکہ 3 ایف سی اہلکار سمیت 4 افراد جاں بحق۔ ☆2۔ سوئی بارودی سرنگ کا دھماکہ 3 بچے جاں بحق، 3 شدید زخمی۔ ☆ نارتھ ناظم آباد کراچی میں موبائل فون کمپنی کے فرنچائز پر دستی بم حملہ، 2 گارڈ زخمی۔ ☆3۔ پشاور اور خیبر ایجنسی میں بم دھماکے 4 اہلکاروں سمیت 6 افراد جاں بحق 36 زخمی۔ ☆10۔ خیبر ایجنسی مسافر ویگن میں ریموٹ کنٹرول دھماکہ، خواتین اور بچوں سمیت 35 افراد جاں بحق۔ 11 تربت ایف سی کے قافلے پر حملہ 14 اہلکار جاں بحق 15 شدید زخمی۔ ☆15۔ خان پور چہلم کے جلوس میں بم دھماکہ 18 افراد جاں بحق 30 زخمی۔ ☆20۔ خیبر ایجنسی تین ریموٹ کنٹرول بم دھماکے 2 افراد جاں بحق۔ ☆31۔ کرم ایجنسی چیک پوسٹ پر حملہ 18 اہلکار شہید 60 جنگجو ہلاک۔

فروری: 1۔ اورکزئی ایجنسی میں فورسز کی کارروائی، طالبان کمانڈر سمیت 38 جنگجو ہلاک۔

☆3۔ کرم ایجنسی میں شدت پسندوں سے جھڑپ، 8اہلکار شہید 24شدت پسند ہلاک۔☆ 11۔ پشاور، گھر میں بم دھماکہ 7افراد جاں بحق۔ ☆18۔ خیبر ایجنسی میں جھڑپ 17جنگجو ہلاک 4اہلکار تین رضا کار شہید۔☆ 19 خیبر ایجنسی میں دھماکہ امن لشکر کے 9رضا کار جاں بحق۔☆23۔ پشاور بس اسٹینڈز پر دھماکہ 15افراد جاں بحق، 37شدید زخمی۔☆25۔ سندھ کے 8اضلاع میں ریلوے ٹریفک پر 13بم دھماکے، پٹریاں تباہ۔☆27۔ نوشہرہ میں اے این پی کے جلسے کے بعد بم دھماکہ 7افراد جاں بحق 32زخمی۔☆28۔ کوہستان بس پر فائرنگ سے 18افراد جاں بحق، گلگت میں فوج طلب۔

مارچ: 2۔ خیبر ایجنسی خودکش حملے جھڑپ میں 46شدت پسند ہلاک، 10اہلکار شہید۔ ☆12۔ کرم مسافر کوچ پر بم حملہ 3افراد جاں بحق 20زخمی۔☆ 14۔ باجوڑ ایجنسی قبائلی رہنما کے حجرے میں دھماکہ 6افراد ہلاک۔ ☆ 20۔ پشاور میں بم دھماکہ پولیس موبائل تباہ، 2اہلکار شہید۔☆24۔ کراچی میں ٹارگٹ کلنگ ملیر بار کے سابق صدر سمیت 7افراد ہلاک۔☆25۔ پشاور اور مالاکنڈ میں فائرنگ بارودی دھماکے سے 6افراد ہلاک۔

اپریل: 2۔ مہمند ایجنسی میں افغان دہشت گردوں کا حملہ، 5اہلکار شہید 13حملہ آور مارے گئے۔☆3۔ گلگت چلاس میں بم حملے 20افراد ہلاک 60زخمی، فوج طلب۔ ☆4۔ جمرود، مسافر گاڑی بارودی سرنگ سے ٹکرانے سے 7افراد جاں بحق 9زخمی۔ ☆5۔ تربت میں ایف سی کی گاڑی پر حملہ، 3اہلکار شہید۔

مئی: 1 کوئٹہ میں ایف سی کے قافلے پر ریموٹ کنٹرول بم سے حملہ 2افراد ہلاک۔ ☆ 2۔ سندھ کے 16 شہروں میں بینکوں اور ریلوے ٹریک پر دھماکے 8افراد زخمی۔ ☆ 6۔ میرانشاہ، سیکورٹی فورسز کے قافلے پر جنگجوؤں کا حملہ 9اہلکار شہید 10 زخمی۔ ☆9۔ نوشہرہ میں 2دھماکے، اجمل خٹک کا زیر تعمیر مزار تباہ۔☆12 کراچی میں فائرنگ سے عالم دین مولانا اسلم شیخوپوری ساتھیوں سمیت 14افراد شہید۔☆14۔ کوئٹہ میں ایف

سی کے قافلے پر کار بم حملہ، 2 اہلکار سمیت 4 افراد ہلاک۔ ☆24۔ کوہاٹ، سائیکل پر بم دھماکے میں ایک شخص جاں بحق 7 زخمی۔ ☆25۔ نواب شاہ کے قریب کراچی سے صوابی جانے والی بس پر فائرنگ 7 افراد جاں بحق۔ ☆27۔ کوئٹہ میں بم دھماکہ، 3 افراد جاں بحق۔

جون: 7۔ کوئٹہ سیٹلائٹ ٹاؤن میں مدرسے کے باہر بم دھماکہ 7 بچوں سمیت 16 افراد جاں بحق 42 زخمی۔ ☆8۔ پشاور سرکاری ملازمین کی بس میں بم دھماکہ 9 خواتین سمیت 19 افراد جاں بحق 46 زخمی۔ ☆16۔ لنڈی کوتل اور کوہاٹ میں بم دھماکے 34 افراد جاں بحق، 70 زخمی۔ ☆17۔ کوئٹہ میں یونیورسٹی کی بس پر کار بم حملہ 5 افراد ہلاک 70 زخمی۔ ☆21۔ پشاور مزار کے باہر بم دھماکہ بچے سمیت 3 جاں بحق 31 زخمی۔ ☆27۔ سبی ریلوے اسٹیشن پر بم دھماکہ 2 بچوں سمیت 8 افراد جاں بحق، 35 زخمی۔ ☆29۔ باڑہ ریموٹ کنٹرول بم حملے میں کیپٹن سمیت 8 اہلکار ہلاک۔

جولائی: 3۔ باجوڑ اور باڑہ میں بم حملے، ایک اہلکار اور 4 خواتین جاں بحق۔ ☆5۔ طالبان کمانڈر نیک محمد کا بھائی محافظ سمیت قتل۔ ☆6۔ تربت سے ایران جانے والی گاڑیوں پر فائرنگ، 18 افراد جاں بحق۔ ☆9۔ گجرات میں فوج کے ریسکیو کیمپ پر دہشت گردوں کا حملہ، 8 جوان شہید۔ ☆11۔ حب، اسپار کو بس پر ریموٹ کنٹرول بم حملہ، راہ گیر جاں بحق، 24 ملازم زخمی۔ ☆12۔ لاہور میں خیبر پختونخوا کے زیر تربیت جیل اہلکاروں کے ہاسٹل پر حملہ، 9 شہید۔ ☆13 کوئٹہ میں اے این پی کے جلسے میں دھماکہ، 6 افراد جاں بحق، 42 زخمی۔ ☆ لوئر اورکزئی میں مسافر گاڑی کو ریموٹ کنٹرول بم سے اڑا دیا گیا، 14 افراد جاں بحق۔ ☆19۔ پشاور میں موٹروے کے قریب بم دھماکہ، 6 افراد زخمی، 2 اہلکار شہید، 13 شدت پسند ہلاک۔ ☆26۔ باجوڑ بازار میں بم دھماکہ، 2 بچوں سمیت 10 جاں بحق 42 زخمی۔ ☆ خیبر ایجنسی کے علاقے اکاخیل کے مرکز میں دھماکہ، 4 افراد ہلاک، 4 زخمی۔

اگست: 1۔ لاہور میں سبزی منڈی میں یکے بعد دیگرے 2 بم دھماکے، 20 زخمی۔ ☆ 5۔ شاہراہ قراقرم پر مسافر وین پر دھماکہ 2 جاں بحق، 4 زخمی۔ ☆ 8۔ پشاور، ایف سی گاڑی پر بم حملہ، 4 اہلکاروں سمیت 8 زخمی۔ ☆ 12۔ میر علی فوجی گاڑی کے قریب دھماکہ، 3 اہلکار شہید۔ ☆ 16۔ عید کے لئے استور جانے والے 25 افراد کو بسوں سے اتار کر قتل کر دیا گیا۔ ☆ 17۔ کراچی، سفاری پارک کے قریب سڑک کنارے نصب بم پھٹنے سے 2 افراد جاں بحق، 16 زخمی۔ ☆ 28۔ جیکب آباد میں خوشحال خان خٹک ایکسپریس میں بم دھماکہ، 3 افراد جاں بحق۔ ☆ 31۔ پشاور میں متنی بازار میں گاڑی میں دھماکہ، خواتین و بچوں سمیت 12 افراد جاں بحق، 18 زخمی۔

ستمبر: 1۔ کوئٹہ بس ٹارگٹ کلنگ میں 7 افراد ہلاک۔ ☆ 13۔ بلوچستان 10 مزدوروں کو قطار میں کھڑا کر کے گولی مار دی گئی۔ ☆ 16۔ لوئر دیر ریموٹ کنٹرول بم حملے میں مسافر گاڑی تباہ 16 افراد ہلاک۔ ☆ 18۔ کراچی حیدری مارکیٹ کے قریب 2 بم دھماکے 8 افراد جاں بحق، ٹارگٹ کلنگ میں 18 افراد ہلاک۔ ☆ 19۔ پشاور فضائیہ کی گاڑی کے قریب کار بم دھماکہ 10 افراد ہلاک 25 زخمی۔

اکتوبر: 11۔ بنی اور ڈیرہ بگٹی میں بم دھماکے، 4 اہلکاروں سمیت 15 جاں بحق ☆ 14۔ پشاور پولیس چوکی پر دہشت گردوں کا حملہ، ایس پی سمیت 5 اہلکار شہید۔ ☆ 15۔ کوئٹہ میں صوبائی وزیر اسفندیار کاکڑ کے گھر پر حملہ، فائرنگ سے 13 ہلاک۔ ☆ 19۔ کوئٹہ میں بم دھماکہ، ایف سی کے 3 اہلکار جاں بحق، 11 زخمی۔ ☆ 28 نوشہرہ، زیارت کا کا صاحب میں دھماکہ 4 افراد جاں بحق 24 زخمی۔

نومبر: 9۔ ڈیرہ بگٹی مسجد کے باہر دھماکہ، رکن قومی اسمبلی احمدان بگٹی سمیت 13 زخمی۔ ☆ 10 کراچی، فائرنگ سے مدرسے کے 6 طلبا جاں بحق دیگر واقعات میں 12 افراد ہلاک۔ ☆ 18۔ کراچی امام بارگاہ کے قریب دھماکے 2 ایف سی اہلکار

شہید۔☆ 21 کراچی کوئٹہ، راولپنڈی اور شانگلہ میں دھماکے 12افراد جاں بحق70زخمی۔☆24۔ڈیرہ اسماعیل خان میں بم دھماکہ 8بچوں سمیت9افراد جاں بحق۔☆25۔ یوم عاشورہ کو ڈیرہ اسماعیل خان ماتمی جلوس پر بم دھماکہ،9افراد جاں بحق8زخمی۔☆26۔کراچی ملیر سٹی میں دھماکہ ایک شخص جاں بحق3زخمی۔

دسمبر:3۔کراچی میں عالم دین مولانا محمد اسماعیل سمیت 11ہلاک۔☆4۔بنوں میں تھانے پر کار بم حملہ، اہلکاروں سمیت10زخمی۔☆8 کوئٹہ میں بم دھماکہ،4راہ گیر زخمی۔☆ 10۔ بنوں میں 5دہشت گردوں کا تھانے پر حملہ، 4اہلکار اور 5نمازی شہید،4حملہ آور مارے گئے۔☆12۔کراچی میں قائدآباد کے علاقے میں ہوٹل کے باہر رکھے بم کے پھٹنے سے 2افراد جاں بحق اور 11افراد زخمی۔☆17۔جمرود بازار میں کار بم دھماکہ 21افراد جاں بحق۔

2012ء خودکش حملے

یوں تو وطن عزیز ایک دہائی سے بھی زیادہ عرصہ سے دہشت گردی کی عفریت کے شکنجے میں ہے تاہم 2012ء کا سال میں ہونے والی دہشت گردی کی ہولناک کارروائیاں ہوئیں جس کی تفصیل درج ذیل ہیں۔ یہ تمام شہادتیں خودکش حملوں میں ہوئیں۔اس دوران خودکش حملوں میں مارے جانے والے دہشت گردوں کے اعداد وشمار بھی پیش کئے جارہے ہیں۔

جنوری: یکم، لنڈی کوتل میں خودکش دھماکہ، ایک اہلکار شہید 4 جنگجو مارے گئے۔ ☆3۔ گجرات میں دو مشتبہ خودکش حملہ آوروں نے دھماکے سے خود کو اڑالیا۔☆14۔ڈیرہ اسماعیل خان ڈی پی او آفس پر دہشت گردوں کا حملہ، خودکش دھماکے 6افراد جاں بحق۔ ☆30۔پشاور میں خودکش حملہ کالعدم تنظیم کے امیر سمیت 4افراد ہلاک30زخمی۔

فروری: 17 پاراچنار میں مسجد کے باہر خودکش دھماکہ، 27 افراد جاں بحق۔

مارچ: 3 چارسدہ آفتاب شیرپاؤ کے قافلے پر خودکش حملہ 2 پولیس اہلکار جاں بحق، 6 زخمی۔ ☆ 11۔ پشاور میں امن لشکر کے رہنما کی اہلیہ کے جنازے میں خودکش دھماکہ۔ ☆ 15۔ پشاور میں خودکش حملہ ایس پی شہید، 3 اہلکار زخمی۔ ☆ 23۔ خیبر ایجنسی کالعدم تنظیم کے مرکز پر خودکش حملہ 13 افراد ہلاک۔

اپریل: 5۔ کراچی، ملیر میں پولیس قافلے پر خودکش حملہ 4 افراد ہلاک۔

مئی: 4۔ باجوڑ خودکش حملے میں لیویز کمانڈنٹ ڈپٹی سمیت 25 افراد جاں بحق۔

جون: 12۔ پشاور امن لشکر کے سربراہ کی گاڑی پر خودکش حملہ 2 اہلکار جاں بحق۔ ☆ 28۔ کوئٹہ زائرین کی بس پر خودکش حملہ 13 افراد جاں بحق، 24 زخمی۔

اگست: 17 کوئٹہ میں خودکش دھماکہ، 2 ایف سی اہلکار جاں بحق۔

ستمبر: 3۔ پشاور امریکی قونصلیٹ کی گاڑی پر خودکش حملہ 2 افراد ہلاک، 20 زخمی۔ ☆ 10۔ پاراچنار بازار میں خودکش کار بم دھماکے 14 افراد ہلاک 80 زخمی۔

اکتوبر: 13۔ درہ آدم خیل میں خودکش دھماکہ، 17 افراد جاں بحق۔ ☆ 24 میران شاہ پر ڈرون حملہ، 5 افراد ہلاک، باڑہ میں آپریشن 1800 گرفتاریاں۔

نومبر: 2۔ بونیر خودکش حملہ امن لشکر کے سربراہ اسعد احمد خان سمیت 6 جاں بحق۔ ☆ 5۔ مہمند خودکش حملہ 2 اہلکار زخمی باڑہ میں 7 شدت پسند ہلاک۔ ☆ 7۔ پشاور قصہ خوانی بازار میں خودکش حملہ ایس پی سمیت 8 جاں بحق، 30 زخمی۔ ☆ 8۔ کراچی میں رینجرز ہیڈکوارٹر پر خودکش حملہ 3 اہلکار شہید 21 زخمی۔ ☆ 16۔ ژوب میں خودکش دھماکہ 2 ایف سی اہلکار شہید۔ ☆ 29۔ وانا طالبان کمانڈر ملا نذیر خودکش حملے میں زخمی 6 افراد ہلاک۔

دسمبر: 5۔ وانا میں چیک پوسٹ پر خودکش حملہ، کیپٹن سمیت 4 اہلکار شہید۔ ☆ پشاور میں خودکش حملہ، خیبر پختونخوا کے سینئر وزیر بشیر بلور سمیت 9 افراد شہید۔

ہلاکتوں کے اعداد و شمار

مجموعی طور پر ہلاکتوں کی بات کی جائے تو تفصیل یہ ہے۔اعداد و شمار کے مطابق 2003ء میں کل 189 اموات ہوئیں (جن میں 140 شہری، 29 سیکورٹی اہلکار اور 25 دہشت گرد تھے) 2004ء میں 863 اموات (جن میں 435 شہری، 184 سیکورٹی اہلکار اور 244 دہشت گرد) 2005ء میں کل 648 اموات (جن میں 430 عام شہری، 81 سیکورٹی اہلکار اور 137 دہشت گرد) 2006ء میں کل 1471 اموات (جن میں 608 عام شہری، 325 سیکورٹی اہلکار، 538 دہشت گرد) 2007ء میں 3598 اموات (جن میں 1522 شہری، 597 سیکورٹی اہلکار اور 1479 دہشت گرد) 2008ء میں 6715 اموات (جن میں 2155 عام شہری، 654 سیکورٹی اہلکار اور 3906 دہشت گرد شامل) 2009ء میں 11704 اموات (جن میں 2324 شہری، 991 سیکورٹی ہلکار اور 8389 دہشت گرد شامل ہیں) 2010ء میں 7435 اموات (جن میں 1796 عام شہری، 469 سیکورٹی اہلکار اور 5160 دہشت گرد شامل) 2011ء میں 6303 اموات (جن میں 2378 عام شہری، 765 سیکورٹی اہلکار اور 2800 دہشت گرد شامل) 2012ء میں 6211 اموات (جن میں 3007 عام شہری، 732 سیکورٹی اہلکار اور 2472 دہشت گرد بھی شامل تھے) 2013ء میں 5379 اموات (جن میں 3001 عام شہری، 676 سیکورٹی اہلکار اور 1702 دہشت گرد شامل) اور 2014ء میں اکتوبر کے مہینے تک 4034 اموات (جن میں 1369 شہری، 440 سیکورٹی اہلکار اور 2225 دہشت گرد شامل) ہوئیں۔اس طرح کل اموات کی تعداد 54550 بنتی ہے جس میں 19525 عام شہری، 5938 سیکورٹی اہلکار اور 29087 دہشت گرد شامل ہیں۔سب سے زیادہ ہلاکتیں

2009ء میں 11704 ریکارڈ کی گئی۔ جب کہ سب سے کم 189 ہلاکتیں 2013ء میں درج کی گئیں۔ سب سے زیادہ فاٹا کا علاقہ متاثر ہوا جہاں پر 18445 اموات ہوئیں۔ اس کے بعد خیبر پختونخوا جہاں 12955 اموات جب کہ سب سے کم پنجاب جہاں پر 1651 اموات دہشت گردی کے اس عفریت کی وجہ سے ہوئیں۔

لاہور۔ دہشت گردوں کا خصوصی ہدف

پشاور کے بعد لاہور وہ شہر ہے جو دہشت گردوں کا خصوصی ہدف رہا۔ وطن عزیز میں دہشت گردی کا آغاز بھی لاہور سے ہوا، یہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کا دور تھا۔ 30 مارچ 1987ء کا دن تھا جب ہمارے ملک دہشت گردی کے عفریت کا شکار ہوا۔ اس روز معروف عالم دین علامہ احسان الٰہی ظہیر لاہور ہی میں ایک بم دھماکے میں 22 گھنٹے موت وزیست کی کشمکش میں رہنے کے سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض کے اسپتال میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ 19 دسمبر 1990ء کو ایرانی ثقافتی مرکز کے ڈائریکٹر جنرل صادق گنجی کو گولی مار دی گئی تھی۔ جنوری 1997ء میں کالعدم سپاہ صحابہ کے رہنما ضیاء الرحمٰن فاروقی کو لاہور کی سیشن عدالت کے قریب بم دھماکے میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ 2004ء کے بعد سے لاہور میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات کے تفصیل درج ذیل ہے۔

14 مئی 2004ء کو مغل پورہ میں ایک اہل تشیع خاندان کے 6 افراد کو قتل کر دیا گیا۔ 10 اکتوبر 2004ء کو ایک اہل تشیع مسجد کے باہر خودکش بم دھماکے میں 4 افراد ہلاک ہوئے۔ 22 ستمبر 2005ء کو دو بم دھماکوں میں ایک خاتون سمیت 6 افراد جاں بحق اور 27 زخمی ہوئے۔ 10 جنوری 2008 کو وکلاء تحریک کے دوران لاہور ہائیکورٹ پر تعینات سیکورٹی اہلکاروں کو نشانہ بنایا گیا جس میں 24 افراد ہلاک اور 73 زخمی ہوئے۔ 4 مارچ 2008 کو پاکستان نیوی وار کالج کے پارکنگ علاقے میں دو خودکش بمباروں نے

خود کو دھماکوں سے اڑالیا جس کے نتیجے میں 8افراد ہلاک اور 24زخمی ہوئے۔
11 مارچ 2008ء کو ایف آئی اے بلڈنگ اور ماڈل ٹاؤن میں بلاول ہاؤس کے قریب دہرے خودکش بم دھماکوں میں 16 پولیس اہلکاروں سمیت 24افراد جاں بحق ہوئے۔
13 اگست 2008ء کو یوم آزادی کی تقریبات کے موقع پر تھانے کے قریب مبینہ خودکش حملے میں دو پولیس اہلکاروں سمیت 8افراد جاں بحق ہوئے۔ 3 مارچ 2009ء کو سری لنکن کرکٹ ٹیم اور عہدیداروں کو لے جانے والی دو بسوں پر فائرنگ کی گئی جس میں سری لنکن ٹیم کے 6ارکان زخمی جبکہ 6پاکستانی پولیس اہلکار اور دو راہگیر جاں بحق ہوئے۔
30مارچ 2009ء کو مناواں پولیس ٹریننگ اسکول پر 10دہشت گرد حملہ آور ہوئے۔ صبح کی پریڈ کے موقع پر اس واردات میں 8رنگروٹ اور ایک شہری جاں بحق ہوئے۔ تین دہشت گردوں نے خودکو دھماکوں سے اڑالیا جبکہ تین گرفتار کر لئے گئے۔ 27 مئی 2009ء کو خودکش حملہ آوروں نے 100 کلوگرام بارودی مواد سے بھری گاڑی کوئنز روڈ پر سی پی او اور آئی ایس آئی کے دفاتر کے قریب دھماکے سے اڑادی جس میں 27افراد ہلاک اور 326زخمی ہوئے۔ 40 گاڑیاں تباہ ہوئیں۔ 12 جون 2009ء کو علامہ اقبال روڈ پر جامعہ نعیمیہ پر خودکش حملہ میں ممتاز عالم دین سرفراز احمد نعیمی سمیت 7افراد جاں بحق ہوگئے۔
15 اکتوبر 2009ء کو تین مختلف دہشت گرد حملوں میں 14 سیکورٹی اہلکاروں سمیت 38افراد جاں بحق اور سیکورٹی فورسز کی جوابی کارروائی میں تمام 9دہشت گرد بھی مارے گئے۔ حملے ٹمپل روڈ پر ایف آئی اے بلڈنگ، مناواں پولیس ٹریننگ اسکول اور ایلیٹ پولیس اکیڈمی پر کیئے گئے تھے۔ 7دسمبر 2009ء کو علامہ اقبال ٹاؤن کی مون مارکیٹ میں دو طاقتور بم دھماکوں میں تقریباً 100افراد جاں حق ہوئے۔ یہ لاہور میں ہلاکتوں کے اعتبار سے سب سے بڑا سانحہ تھا۔ 8مارچ 2010ء کو ایف آئی اے کے انسداد دہشت گردی ونگ کی عمارت سے دھماکہ خیز مواد سے لدی گاڑی ٹکرانے سے

13 افراد جاں بحق اور 60 زخمی ہوئے۔ 12 مارچ 2010ء کو دو خودکش حملوں میں 9 جوانوں سمیت 45 افراد جاں بحق اور 100 زخمی ہوئے۔ 28 مئی 2010ء کو گڑھی شاہو اور ماڈل ٹاؤن میں دو قادیانی عبادت گاہوں پر دہشت گرد حملے ہوئے جن میں تقریباً 100 افراد ہلاک ہوئے۔ 5 جولائی 2010ء کو پولیس نے کالعدم حرکت الجہاد الاسلام کے 6 ارکان کو گرفتار کر کے ان کے قبضے سے 18 ہزار کلو گرام دھماکہ خیز مواد، 21 دستی بم اور 6 کلاشنکوف برآمد کیے۔ 31 مئی 2010ء کو لاہور کے اسپتال میں تین دہشت گردوں کی اندھادھند فائرنگ سے 8 افراد ہلاک اور 40 زخمی ہوئے۔ یکم جولائی 2010ء کو حضرت داتا صاحب کے مزار پر دو خودکش بمباروں کے حملے میں 50 افراد ہلاک اور 200 زخمی ہوئے۔ یکم ستمبر 2010ء کو حضرت علیؓ کے یوم شہادت کے جلوس میں تین بم دھماکوں میں 38 افراد جاں بحق اور 250 زخمی ہوئے۔ 25 جنوری 2011ء کو کربلا گامے شاہ کے قریب ماتمی جلوس پر خودکش حملے میں 16 افراد ہلاک اور 70 زخمی ہوئے۔ 24 اپریل 2012ء کو لاہور ریلوے اسٹیشن پر بم دھماکے میں 3 افراد چل بسے۔ 12 جولائی 2012ء کو پولیس اکیڈمی پر طالبان کے حملے میں 9 کیڈٹس جاں بحق ہوئے۔ 2 نومبر 2014ء کو واہگہ سرحد پر دہشت گرد حملے میں 10 خواتین اور 8 بچوں سمیت 60 سے زائد افراد جاں بحق اور 110 زخمی ہوئے۔ یہ 387 دنوں کے امن وسکون کے بعد لاہور میں پیش آنے والا بڑا دہشت گرد واقعہ تھا۔ جاں بحق ہونے والوں میں ایک ہی خاندان کے 8 افراد بھی شامل ہیں۔ واضح رہے کہ طاہر القادری کی عوامی تحریک کا مسلسل اس بات پر زور ہے کہ 17 جون 2014ء کو سانحہ ماڈل ٹاؤن میں عوامی تحریک کے 14 کارکنوں کی ہلاکت کو بھی دہشت گردی کے زمرے میں لیا جائے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران کم از کم 50 دہشت گرد حملے ہوئے جس میں شمالی و جنوبی وزیرستان سمیت قبائلی علاقوں اور سوات میں ہونے والی دہشت گردی کی وارداتیں

شامل نہیں۔ ایسے حملوں میں سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو، لیفٹیننٹ جنرل مشتاق بیگ، میجر جنرل (ر) امیر فیصل علوی، سابق وفاقی وزیر شہباز بھٹی، کمانڈنٹ ایف سی صفوت غیور، سی سی پی او پشاور ملک سعد خان اور دیگر شخصیات جاں بحق ہوئیں۔ معروف امریکی تفتیشی صحافی جیرالڈ پوسز 20 فروری 2003ء کو کوہاٹ کے قریب فضائی حادثے میں اس وقت پاک فضائیہ کے سربراہ ایئر چیف مارشل مصحف علی میر کے جاں بحق ہونے کو بھی حادثہ نہیں سمجھتے۔ جمہوریہ چیک کے سفیر سمیت متعدد سفارتی شخصیات بھی دہشت گردی کا نشانہ بنیں۔ مئی 2011ء میں کراچی میں سعودی سفارتکار حسن الخطانی کو گولی مار دی گئی۔

دہشت گردی اور معاشی تباہی

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ملکی معیشت کو جس قدر نقصان اٹھانا پڑا، وہ یقیناً ایک بہت بڑا دھچکا ہے جس پر قابو پانے کے لئے یقیناً کئی سال لگ سکتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پچھلے تین سالوں میں اس دہشت گردی کی وجہ سے ملکی معیشت کو 28 ارب 46 کروڑ ڈالرز نقصان ہوا جبکہ اگر 2002ء سے حساب لگایا جائے تو یہ نقصان لگ بھگ 102 ارب ڈالرز کے قریب ہے۔ ہماری برآمدات کو پچھلے دو سالوں میں 2 ارب 29 کروڑ ڈالر جب کہ انفرا اسٹرکچر کو تقریباً 2 ارب 47 کروڑ ڈالر کا جھٹکا برداشت کرنا پڑا۔ جب کہ صنعتی پیداوار (Industrial Production) کو لے لیا جائے تو اس میں تقریباً 71 کروڑ ڈالرز کا نقصان ہوا۔ ان تمام نقصانات کی وجہ سے ملک کی معیشت کی کمر ٹوٹ گئی اور یہ ملک بدترین دہشت گردی اور خودکش حملوں کی وجہ سے سرمایہ کاروں اور صنعتکاروں کے لئے خطرے کی علامت سمجھا جانے لگا۔ ملک کو درپیش توانائی کے مسائل اور سیاسی افراتفری سے جو نقصان ہوا وہ اس کے علاوہ ہے۔ امریکی امداد جو دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں پاکستان کے حصے میں آئی وہ اس تمام نقصان کا

بمشکل 10 فیصد ہے۔ جس سے ہمارے ان تمام نقصانات کا ازالہ یقیناً نہ ہوسکا۔ دہشت گردی کے اس عفریت نے ایک دہائی سے بھی زیادہ عرصے سے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ جس سے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، کئی ہزار قیمتی جانوں کے ضیاع کے ساتھ ساتھ ملک کی معیشت کو جس قدر نقصان پہنچا ہے وہ ناقابل بیان ہے اور اس کا صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ سفارتی تنہائی، ملک میں ہونے والے کھیلوں کے مقابلے اور غیر ملکی ٹیموں کے دورے منسوخ ہرنے سے لے کر (جس میں کرکٹ ورلڈ کپ کی میزبانی منسوخ ہونا بھی شامل ہے) ذہنی اذیت اور سرمایہ کاری کا انخلا وغیرہ سب شامل ہیں عام عوام سے لے کر سیکورٹی اہلکار، آفیسرز، مذہبی رہنما، اقلیتیں، عبادت گاہیں، حکومت یا ور سیاسی شخصیات سب ہی اس دہشت گردی کا نشانہ بن چکے ہیں۔ واہگہ حملہ وزیرستان اور قبائلی علاقوں میں کئے جانے والے فوجی آپریشن کا ردعمل بتایا جارہا ہے۔ جس کے بارے میں سیکورٹی خدشات بہت پہلے سے ظاہر کئے جارہے تھے۔ اس حملے کے بعد ایک دفعہ پھر پورے ملک میں خوف اور سراسیمگی کا عالم ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا سب سے بڑا شکار ہونے کے باوجود یہ بات بھی ایک المیہ ہے کہ اب بھی ہمارے ملک پر دہشت گردی کی مبینہ سرپرستی کا الزام لگایا جاتا ہے، اگر پچھلے 10 سے 12 سال میں ہونے والے نقصانات کا اندازہ لگایا جائے تو کئی ہوشربا انکشافات سامنے آتے ہیں۔ اگر مالی نقصانات کا تخمینہ لگایا جائے تو اس کی لاگت 102.51 ارب ڈالرز یعنی 8264.4 ارب روپے ہے، اس میں پچھلے دو سال میں ہونے والے 24.86 ارب ڈالرز کا نقصان بھی شامل ہے۔ نقصانات کی یہ لاگت (جو وزارت خزانہ اور وزارت خارجہ کی مدد سے تیار کی گئی ہے) بتاتی ہے کہ 11-2010ء میں 13.19 ارب ڈالرز 12-2011ء میں 11.98 ارب ڈالرز، 13-2012ء میں 9.97 ارب ڈالرز، 2013ء میں 701.26 ملین روپے 09-2008ء میں 720.60 ارب ڈالرز جب کہ 2001ء سے 2008ء تک 27/36 ارب ڈالرز رہے ہیں۔

صرف 2011ء سے 2013ء تک کے عرصے میں پاکستانی برآمدات کو 2,290.13 ملین ڈالرز نقصان ہوا جب کہ ٹیکس وصولی تقریباً 6,479.94 ارب ڈالرز سے کم رہی۔ پیداوار میں 769.79 ملین ڈالرز کی کمی ریکارڈ کی گئی۔ غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے معیشت کو 204.78 ملین ڈالرز کا نقصان جب کہ دہشت گردی کا شکار لوگوں کی بحالی پر 59.21 ملین ڈالرز خرچ ہوئے۔ انفرااسٹرکچر کی مد میں صرف پچھلے تین سال میں 2,470 ملین ڈالرز کا نقصان ہوا۔ افغانستان میں امریکی فوجوں کی آمد پر ہزاروں افغان مہاجرین نے پاکستان کا رخ کیا جب کہ ملک اس سے پہلے ہی لاکھوں افغانی باشندوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ ملک میں جاری گومگو کی کیفیت کی وجہ سے برآمدات کے آرڈرز منسوخ ہوئے غیر ملکی سرمایہ کاری میں کمی آئی اور سڑکیں اور پل تباہ ہونے کی وجہ سے مواصلات کا نظام بھی بری طرح متاثر ہوا۔ خصوصاً خیبر پختونخوا سب سے زیادہ متاثر ہوا، جہاں ہر سرکاری اسکول اور درس گاہیں بھی اس دہشت گردی کا نشانہ بنیں۔

اکنامک سروے 14-2013ء کے دوران وزارت داخلہ، خارجہ اور خزانہ کے مشترکہ اعداد و شمار کے مطابق اس پورے عرصے کے دوران دہشت گردی کی کارروائیوں کے نتیجے میں انفرااسٹرکچر وغیرہ کی صورت میں جو مالی نقصان پاکستان کو برداشت کرنا پڑا وہ 8264.4 بلین روپے ہے۔ جنگ جاری ہے جو ایک وباء کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ 8 جون 2014ء کو جناح انٹرنیشنل ایئرپورٹ کراچی میں داخل ہو کر ایئرپورٹ سیکورٹی فورس کی وردیوں میں ملبوس درجن کے قریب مسلح دہشت گردوں نے غیر ملکی ساخت کے دستی گرنیڈ، راکٹ لانچر اور خودکار ہتھیار استعمال کر کے جو تباہی مچائی، اس میں پی آئی اے اور سول ایوی ایشن اتھارٹی کو ایک اندازے کے مطابق 180 بلین روپے کا مالی نقصان ہوا۔ ایئرپورٹ پر حملہ ازبک جنگجوؤں نے کیا، جن کا تعلق اسلامی تحریک ازبکستان (آئی ایم یو) سے تھا۔ ازبک جنگجوؤں اور القاعدہ کے مطابق ان کے حملے میں 37 افراد ہلاک ہوئے۔
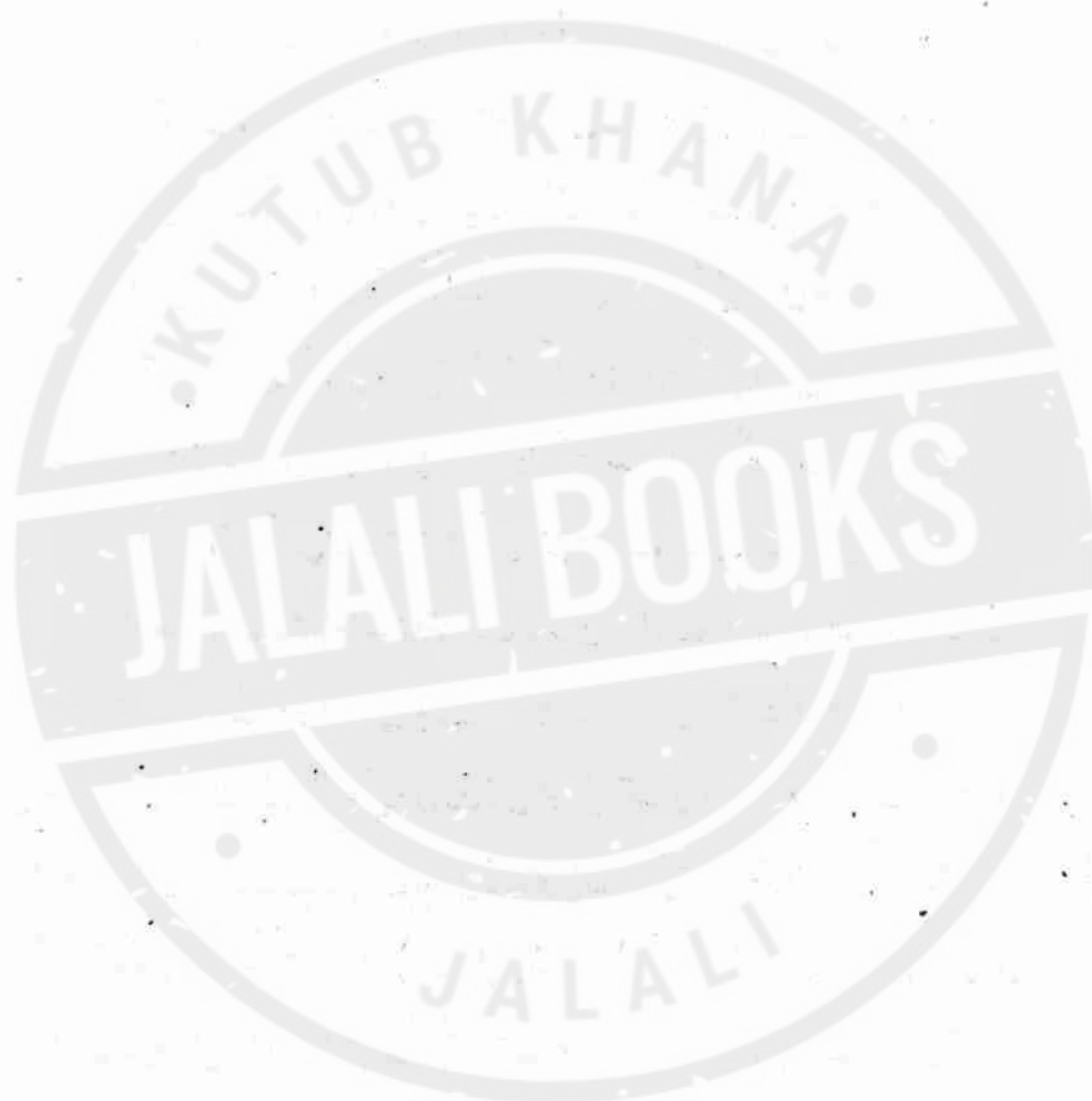
باب 6

☆......قومی ایکشن پلان اور سماجی اصلاحات

☆......دہشت گردی کے خاتمے کے لئے 50 نکاتی فارمولا

☆......جرگہ سسٹم پر خاموشی اور فوجی عدالتوں کی مخالفت!

قومی ایکشن پلان اور سماجی اصلاحات

پاکستان اس وقت جن سنگین مسائل سے دوچار ہے ان میں سب سے زیادہ دہشت گردی کا مسئلہ ہے، جس کے خاتمے کے لئے پاکستان کی مسلح افواج سربکف ہوچکی ہیں امید واثق ہے کہ اب وہ دن دور نہیں جب دہشت گرد اور دہشت گردوں کی نرسریاں نیست و نابود ہوجائیں گی، میں ان سطور میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ ملک نارمل حالات سے نہیں گزر رہا اس لئے غیر معمولی صورتحال میں غیر معمولی فیصلے کرنے پڑ رہے ہیں۔ آج پاکستان دہشت گردی کے علاوہ بے شمار مسائل کا شکار ہے، کرپشن نے ہمیں قوموں کی برادری میں بدیانت ملک بنا دیا ہے، توانائی کا بحران صنعت وتجارت کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ ماضی کی تمام حکومتیں تعلیم، ٹرانسپورٹ، صحت سمیت عوام کو بنیادی سہولیات کی فراہمی میں ناکام ہوچکی ہیں۔ اس امر سے کون انکار کرسکتا ہے کہ سرکاری شعبہ میں چلنے والے ابتدائی تعلیمی اداروں کی ناکامی کی وجہ سے ہی ''مدرسہ کلچر'' توانا ہوا ہے۔ یہ صورتحال جنرل ضیاء الحق کے دور سے بلا روک ٹوک پروان چڑھ رہی ہے، آج ہم ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہین جہاں قانون شکنی کو ہم اپنا حق سمجھتے ہیں، ٹیکس چوروں کی سرکوبی کی بجائے انہیں تحفظ دیا جاتا ہے، ہمارے ملک میں ملاوٹ شدہ اشیاء کی فروخت عام ہے، انسانی جان بچانے والی ادویہ تک جعلی ہوتی ہیں، تعلیم کو تجارت بنا دیا گیا ہے، عوامی خدمات کے ادارے عوام کو سہولیات دینے کی بجائے عذاب جان بن چکے ہیں، دہشت گردی کے خاتمے کے بعد اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ عوام کو ان کے حقوق ملنے لگیں۔ کیا کوئی حکومت برائیوں کے اژدھوں پر ہاتھ ڈالے گی؟

قومی ایکشن پلان سے دنیا کو یہ پیغام ملا ہے کہ اس پلان کی پشت پر عوامی حمایت کی طاقت ہے مگر دہشت گردوں کا احتسابی عمل تیز کرنے کے اقدامات کے ساتھ ساتھ انتظامیہ

اور عدلیہ میں کرپشن اور نظام انصاف، تعلیم، صحت، پولیس اور ٹیکسوں کے نظام سمیت ان تمام شعبوں کی تنظیم نو پر توجہ دینی ہوگی جو برسوں کے زوال آمادہ رجحانات کے باعث بحث مجموعی ریاست کو ناکامی کے دھانے تک پہنچا چکے ہیں۔ جن معاشروں میں استحصال، معاشی وسماجی ناانصافی اور کرپشن کا دور دورہ ہو اور غریبوں کی فلاح و بہبود کے اقدامات سے خالی ہوں، جرائم اور دہشت گردی کی پرورش کے لئے بہترین زمین ثابت ہوتے ہیں۔ ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جہاں بنیادی سہولیات کو عوام کے لئے شجر ممنوعہ بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں انصاف کے نام پر جو نظام رائج ہے اس تک رسائی عدالت اور وکلاء کے بھاری اخراجات کی سکت سے محروم طبقات کے لئے دشوار تر ہو چکا ہے اس صورتحال کی اصلاح کے لئے ہمیں وسیع تر اصلاحات کرنا ہوں گی۔ تعلیمی نظام کی بوسیدگی دور کر کے اسے مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے اقدامات کرنے ہوں گے۔ استیصال کی روک تھام کر کے سماجی انصاف کو یقینی بنانا ہوگا تاکہ دہشت گردی کو جنم دینے والے اسباب کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اس پہلو پر توجہ دے کر ہی ریاست کو ناکامی کی کھائی میں گرنے سے روکا جا سکتا ہے مگر حکمرانوں کی سابقہ کارکردگی کو دیکھتے ہوئے کم از کم مجھے اس بات کا مکمل ادراک ہے کہ یہ کام ہماری سیاسی قیادت کے بس کی بات نہیں ہے۔

دنیا میں جب تک خرابی اور بیماری کی سپلائی بند نہیں ہوتی مسائل اس وقت تک حل نہیں ہوا کرتے، دہشت گرد، دہشت گردی اور قتل اس بیماری کی صرف علامتیں ہیں جو ہماری رگوں، ہمارے جسم کے خلیوں کے اندر موجود ہے، ہم جب تک اپنے خلیوں کا علاج نہیں کریں گے، ہم جب تک بیماری کو جڑوں سے نہیں نکالیں گے۔ یہ علامتیں بھی اس وقت تک قائم رہیں گی اور قوم بھی اس وقت تک ملٹری کورٹس کے سامنے بیٹھی رہے گی، اب سوال یہ ہے ہماری بیماری ہے کیا؟ ہمارا مسئلہ کیا ہے؟ ہمارا مسئلہ ہماری شدت پسندی ہے، ہم لوگ اپنے رویوں میں سخت اور متشدد ہیں، ہم میں یہ سختی اور یہ شدت ایک طویل معاشرتی عمل کے

ذریعے آئی، ہم جب تک اس عمل کو نہیں سمجھیں گے، ہم اس وقت تک شدت پسندی پر قابو نہیں پا سکیں گے اور ہم میں جب تک شدت پسندی کے یہ جینز زندہ رہیں گے ہمارا مسئلہ بھی اس وقت تک جوں کا توں رہے گا۔

سرکار کی فوری طور پر عدل و انصاف کے سلسلے میں نظام میں تبدیلی لانا ہوگی تاکہ انصاف ہوتا ہوا نظر بھی آئے۔ ملک کی تمام بڑی سیاسی جماعتوں نے اے پی سی میں 20 نقطوں پر اتفاق کیا، ہم نے ان 20 نقطوں میں سے صرف ملٹری کورٹس کے ایک نقطے کو عملی شکل دے دی لیکن 19 نقطے خاموش بیٹھے ہیں، یہ 19 نقطے پائپ ہیں اور ملٹری کورٹس اس پائپ کا آخری سرا۔ ہم جب تک پائپ کو ٹھیک نہیں کریں گے ہمارا آخری سرا ٹھیک نہیں ہوگا، آپ ان 19 نقاط پر بھی اتنی ہی جلدی اور اتنی ہی قوت سے عمل کریں گے جتنی جلدی آپ نے ملٹری کورٹس بنائیں تو مسئلہ حل ہوگا بصورت دیگر ملٹری کورٹس بنتی رہیں گی، پھانسیاں ہوتی رہیں گی اور دہشت گردوں کے نئے لشکر پیدا ہوتے رہیں گے، ہم پہلے بھی مر رہے تھے، ہم بعد میں بھی مریں گے، بس پہلے زمانے اور دوسرے زمانے میں ایک فرق ہوگا، پہلے زمانے میں عام عدالتیں تماشہ دیکھتی تھیں اور دوسرے زمانے میں ملٹری کورٹس بھی تماشے میں شامل ہو جائیں گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ملک میں ایک بھی ایسا ادارہ موجود نہیں ہے جو پوری قوم کی سمت متعین کر سکے، جبکہ جو سول و سرکاری ادارے موجود ہیں ان میں اکثر میں کرپشن دیمک کی طرح سرایت کر چکی ہے۔ اس وقت اگر قوم کو کسی ایک ادارے پر اعتماد ہے تو وہ صرف اور صرف پاک فوج ہے جس کی بدولت عام انسان اپنے گھروں میں سکون کی نیند بسر کر سکتا ہے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ مالیاتی دہشت گردوں کو بھی ایسی ہنگامی انصاف کے عمل سے گزارا جائے۔ یہ بات یقینی ہے کہ موجودہ پارلیمنٹ اور حکومتی مشینری جیتے جی تو ایسا

قانون نہیں بننے دی گی کیونکہ ہر کوئی کرپشن کی دہشت گردی میں لتھڑا ہوا ہے۔ تاجر، صنعت کار، مذہبی رہنما سب کے سب مالیاتی دہشت گردی میں اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں اپنے اپنے انداز میں۔

تاجروں کو مذہبی رہنماؤں کی طرف سے بہت حمایت ملتی ہے کیونکہ وہ ان کی مدد سے زیادہ منافع بھی کما سکتے ہیں اور ٹیکسز بھی بچا لیتے ہیں۔ اس کے عوض وہ ان کے مدرسوں کو دل کھول کر چندہ دیتے ہیں۔ ایف بی آر قانونی طور پر پابند ہے کہ وہ ایسے عطیات کی تحقیقات کرے، لیکن اس نے مدرسوں کو کبھی ٹیکس فائل جمع کرانے کا نوٹس نہیں بھیجا۔ ان درس گاہوں کو پاکستان اور بیرونی ممالک میں موجود ہمدردوں کی طرف سے بھاری رقوم ملتی ہیں۔

بہت سے دولت مند کاروباری افراد حج، عمرے، عیدالاضحیٰ اور دیگر مذہبی رسومات پر بھاری رقوم خرچ کرتے ہیں۔ علما زور دیتے ہیں کہ دین صرف عبادات، جیسا کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا ہی نام ہے۔ ان کا موقف ہے کہ چونکہ ان کے مدرسے دین کی بہترین خدمت کر رہے ہیں، اس لئے وہ زکوٰۃ کے حق دار ہیں۔ وہ دولت مند افراد کو یہ کہہ کر مساجد اور مدارس کو سرمایہ فراہم کرنے کے لئے قائل کر لیتے ہیں کہ ایسا کرنی سے ان کے گناہ دھل جائیں گے اور وہ جنت میں اعلیٰ مقام حاصل کریں گے۔ بہت سے تاجر، جو ٹیکس فائل جمع نہیں کراتے، مدرسوں کو رقوم دے کر اپنی ''عاقبت'' سنوارتے ہیں کیونکہ انہیں بتایا جاتا ہے کہ ان مدرسوں میں غریب والدین کے بچے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح غزیب بچوں کے نام پر مدرسے چلانے والے بھاری رقوم حاصل کر لیتے ہیں۔ کچھ سیاسی نما مذہبی جماعتیں بہت بڑے بڑے مدرسے چلاتی ہیں۔

مذہب کو تجارت بنانا، جیسا کہ ہمارے ہاں ہو رہا ہے، ایک طرف، لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو قرآن پاک دولت جمع کرنے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے، لیکن مدرسوں کو رقوم فراہم کرنے کے بعد تاجر قوم کی رگوں سے بھاری منافع نچوڑنے کے لئے آزاد ہوتے ہیں

اس کے باوجود انہیں بتایا جاتا ہے کہ ان کے گناہ معاف کر دیئے جائیں۔ اس کے نتیجے میں دولت جمع کرنے کا لالچ ہمارے ہاں ایک خبط بن چکا ہے، اس کے لئے ہر قسم کی اخلاقی اور سماجی ذمہ داریوں کو پامال کیا جاتا ہے اور ضمیر میں خلش تک نہیں ہوتی کیونکہ خرقۂ سالوس میں چھپے ہوئے مہاجن انہیں یقین دلاتے ہیں کہ وہ جنت کے حقدار ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اشیائے خورد و نوش میں ملاوٹ، ناپ تول میں کمی بیشی، ناقص اور غیر معیاری اشیاء کی فروخت، مشہور برانڈز کی نقول، جعلی دستاویزات کی تیاری اور سرکاری واجبات بچانے کی لامتناہی سرگرمیاں معاشرے میں بلا روک ٹوک جاری ہیں...... پھر بھی زعم کہ ہمارے ہاں کوئی حکومت بھی پائی جاتی ہے!

پاکستان میں قائم ہزاروں مدرسے یقیناً ریاست کی ناکامی کی دلالت کرتے ہیں کیونکہ وہ آئین کے آرٹیکل 25A کے تحت اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ مذہبی جماعتیں سیاسی لبادہ اوڑھ کر بھی بھاری بزنس کرتی ہیں۔ ان کے مدرسے ہی ان کے ''انتخابی حلقے'' ہیں جہاں سے وہ بلاشرکت غیرے جیت جاتے ہیں۔ مذہبی جماعتیں اسمبلی میں زیادہ نشستیں تو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتیں لیکن وہ مقامی اسٹریٹ پاور رکھتی ہیں، اس کے بل بوتے پر وہ حکومت کو اپنا احتساب کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔

پاکستان میں نظام تعلیم کے حوالے سے کسی بھی حکومت نے سنجیدہ طرز عمل اختیار نہیں کیا۔ بلکہ تعلیم کبھی بھی اوّلین ترجیحات میں شامل نہین رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ملک میں ایک سے زائد طرز تعلیم اور نصاب رائج ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ محکمہ تعلیم میں کرپشن اس کے سوا ہے، جس نے ناقص انتظامی ڈھانچہ کو مزید مفلوج کر دیا ہے۔ دینی مدارس تو دور کی بات نجی شعبہ میں کام کرنے والے عصری تعلیم کے تعلیمی اداروں کی مانیٹرنگ کا بھی اس وقت کوئی واضح مکینزم موجود نہیں ہے۔ انگریز کے دور کے سالانہ انسپکشن کے طریقہ کار سے

بھی جان چھڑالی گئی ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ فروغ علم میں سیاسی جماعتوں کو چونکہ کوئی دلچسپی نہیں ہے، اس لئے اس پر توجہ دینا ان کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ جب کہ بیورو کریسی اپنی نااہلی اور کرپشن کے باعث مروجہ طریقہ کار پر عملدرآمد نہیں کررہی۔ لہٰذا تعلیم طبقاتی کے ساتھ فرقہ وارانہ بنیادوں پر بھی تقسیم ہوچکی ہے اور اس کی کوئی سمت نہ ہونے کے باعث زبوں حالی کا شکار ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ حکومت نے دینی مدارس کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی بھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ آج جتنے مدارس رجسٹرڈ ہیں ان سے کہیں زیادہ تعداد میں غیر رجسٹرڈ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کو نہ تو یہ معلوم ہے کہ ان اداروں میں کیا نصاب پڑھایا جارہا ہے؟ ان کے اساتذہ کی تعلیمی استعداد کیا ہے؟ اور ان کی آمدن کے ذرائع کیا ہیں؟ سب سے بڑھ کر ان اداروں میں طریقہ امتحان اور اسناد کی تقسیم کا طریقہ کار کیا ہے؟ جو ادارے یا بورڈ امتحان لیتے اور اسناد تفویض کرتے ہیں ان کی اپنی اہلیت واستعداد کیا ہے؟ نتیجتاً دینی مدارس شتر بے مہار کی طرح اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ دنیا کی کوئی ریاست اپنی سرزمین پر ایسے اداروں کی اجازت نہیں دے سکتی جہاں ریاستی انتظامیہ کو رسائی حاصل نہ ہو۔ جہاں کی سرگرمیوں پر ریاستی قوانین کی عملداری قائم نہ ہو۔ حال ہی میں کراچی کے ایک مذہبی مدرسے سے باجوڑ کی 26 کم سن بچیاں برآمد ہوئیں لیکن اس معاملے کو دبا دیا گیا۔ سماجیات کا بنیادی اصول ہے کہ اخفا کے اندھیرے میں جرائم پلتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مذہبی مدارس کے ماحول، نظام تعلیم، نصاب، بچوں پر تشدد اور مالی امور سمیت جملہ سرگرمیوں پر تاریکی کی ایک دبیز چادر موجود ہے۔ ان پس پردہ حقائق کو بے نقاب کرنے کی ہر حکومتی اور ریاستی کوشش کی شدت سے مزاحمت کی جاتی ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت شدت پسندی کے خاتمے کے نام پر محض خانہ پری سے گریز کرے۔ بلکہ اس عفریت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ٹھوس بنیادوں پر جامع اقدامات ترتیب دے۔ اگر فوج ضرب غضب کے ذریعے قبائلی

علاقوں میں اس عفریت کے خاتمے کے لئے نبرد آزما ہے، تو پولیس سمیت قانون نافذ کرنے والے دیگر اداروں کی مدد سے ان عناصر کے گرد گھیرا تنگ کر کے قانون کی گرفت میں لائے، جو شہروں، قصبوں اور دیہات میں شدت پسند عناصر کو پناہ مہیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ملک کے تقریباً ہر شہر میں شدت پسند عناصر کے محفوظ ٹھکانے پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر دینی مدارس سمیت تمام تعلیمی اداروں کی مانیٹرنگ کا ایک فعال اور مستعد نظام ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی تمام تعلیمی اداروں کے تعلیمی، انتظامی اور مالیاتی آڈٹ کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے، تاکہ وہ قواعد وضوابط کے اندر رہ کر کام کرنے کے پابند ہوسکیں۔ جو تعلیمی ادارے خواہ وہ دینی ہوں یا عصری، اگر عصبیتوں کا زہر نوجوان نسل کے ذہنوں میں بھر رہے ہین، تو ان کے خلاف کسی رورعایت اور مصلحت کے بغیر سخت ترین کارروائی کی جانی چاہئے، تاکہ آئندہ کسی کو ملک کے منطقی جواز سے کھیلنے کی جرأت نہ ہوسکے۔ لہٰذا اب فیصلہ کن مرحلہ آ گیا ہے کہ حکومت سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس مسئلے کو ٹھوس بنیادوں پر حل کرے۔

دہشت گردوں کا خاتمہ آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے شارٹ ٹرم اور لانگ ٹرم اقدامات کرنے پڑیں گے۔ شارٹ ٹرم میں دہشت گردوں کے خلاف فوجی اور سول اداروں کی کارروائی کرنا، انٹیلی جنس ایجنسیوں کی کارکردگی کو بہتر نہیں بلکہ مثالی بنانا گرفتار دہشت گردوں کے خلاف مقدمات کی کارروائی جلد مکمل کر کے انہیں سزا دلوانا وقت کا تقاضا ہے اس کے ساتھ ساتھ لانگ ٹرم اقدامات میں سب سے پہلا کام نصاب تعلیم میں مثبت تبدیلیاں لانا ہے۔ اس حوالے سے ابھی سے کام شروع کر دیا جانا چاہئے۔ دہشت گردوں کے مالیاتی نیٹ ورکوں کا خاتمہ بھی انتہائی ضروری ہے۔ بلاشبہ دہشت گردی کا خاتمہ ایک طویل جدوجہد کا نام ہے لیکن یہ امر اطمینان کا باعث ہے کہ اس جدوجہد کا آغاز ہو گیا ہے۔ دہشت گردوں کے خاتمے کا عزم ظاہر ہو رہا ہے۔ قوم حکومت کے ساتھ ہے اور تمام اسٹیک

ہولڈر بھی ایک پیج پر ہیں۔اس لئے امکان یہی ہے کہ دہشت گردوں اوران کے سرپرستوں کا خاتمہ زیادہ دور نہیں ہے۔حکومت کو نیشنل ایکشن پلان میں فوجی عدالتیں قائم کرنے کے لئے آئین پاکستان میں تبدیلی کا فیصلہ کرنے کے ساتھ ہی آئین کی مندرجہ ذیل شقوں پر عمل درآمد کا بھی فیصلہ کرلیا جاتا جن پر گزشتہ 40 برس سے دانستہ عمل نہیں کیا جارہا۔

(1) ''ریاست 5 سے 16 سال کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی۔''(شق 25 الف)

(2) ''ریاست ہر شہری کو زندگی کی بنیادی ضروریات مثلاً، غذا، لباس، رہائش، تعلیم اور علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کرے گی۔''(38۔د)

(3) ریاست جلد اور سستے انصاف کی فراہمی کو یقینی بنائے گی۔(37۔د)

(4) وفاق اور صوبوں کے بجٹ میں آئین کی شقوں 25 الف اور 38۔د پر عمل درآمد کے لئے فوری اقدامات کیے جائیں۔

ہمارے علماء کرام جو قوم کو ایک لڑی میں پرونے میں اہم ترین کردار ادا کر سکتے تھے ان کو بری طرح نظر انداز کیا گیا ہے اسی کے باعث ہمارے گاؤں اور دیہات اور شہروں میں جس کو جہاں موقع ملا وہاں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کے اپنا ایک راستہ متعین کرلیا، ان ہی وجوہات کی بناء پر قوم کی سوچ بھی مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے۔اس تمام صورتحال کی ذمہ دار ہماری حکومتیں اور سیاست دان ہی ہیں جنہوں نے غیر ملکی امداد حاصل کرنے والے مدرسوں کو نظر انداز کر دیا جبکہ بغیر امداد کے چلنے والے کسمپرسی کا شکار مدرسوں کو بھی نظر انداز کر کے غیر ذمہ دارانہ طرز حکمرانی کا ثبوت دیا ہے۔مجھ سمیت ہر باشعور مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے علماء کرام بکھرے ہوئے وہ موتی ہیں جن کو اگر ایک لڑی میں پرو لیا جائے تو یہ قوم کے گلے کا بہترین ہار ثابت ہو سکتے ہیں، اگر حکومت آج بھی یہ فیصلہ کرلے کہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی قوم کو ایک قوم بنانا ہے اور قوم کی ایک سمت متعین کرنی ہے تو حکومت کو کُل بجٹ کا دو

فیصد حصہ اس اہم کام کے لئے مختص کرنا ہوگا اور چند اہم اقدامات کرنا ہوں گے، سب سے پہلے حکومت کو یہ لازمی قرار دینا ہوگا کہ کم سے کم کسی بھی جامع مسجد کے امام کا عہدہ مقابلے کا امتحان پاس کیئے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکے گا، جبکہ امام مسجد کے لئے کم سے کم دنیاوی تعلیم گریجویٹ، دینی تعلیم میں حافظ قرآن اور مفتی ہونا ضروری ہوگا جس کے بعد جامع مسجد میں امام کے طور پر تعینات کیا جاسکے گا جبکہ ہر تعینات ہونے والے امام مسجد کے پاس مجسٹریٹ کے اختیارات بھی ہوں گے جس سے علاقے کے لوگوں میں امام مسجد کی اہمیت اور عزت وتکریم میں بھی اضافہ ہوگا۔ بطور امام اس کو بہترین رہائش کے ساتھ ساتھ سرکاری گھر اور گاڑی کے علاوہ ایک ملازم بھی فراہم کیا جائے، جبکہ امام جامع مسجد کو تنخواہ بھی دیگر سول سرونٹس کے مقابلے میں زیادہ دی جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ اور ذہین افراد اس شعبے میں داخل ہوسکیں، ایسے امام مسجد جن کے پاس مجسٹریٹ کے اختیارات بھی ہوں گے وہ گراس روٹ لیول پر عوام سے نہ صرف رابطے میں رہیں گے بلکہ عوامی مسائل کو حل کرنے میں حکومت کی بہترین مشینری ثابت ہوسکیں گے۔

علماء کرام جو مقابلے کا امتحان پاس کر کے مساجد میں بطور امام تعینات ہوں اس کے لئے وزارت مذہبی امور کا کردار انتہائی اہم ہے، حکومت ایک علماء کرام کا بورڈ تشکیل دے جو پورے ملک میں موجود جامع مساجد کے اماموں کو ایک ہی موضوع پر تقریر تیار کر کے بھیجے اور موضوع ایسا ہو جو تمام فرقوں کے لئے نہ صرف قابل قبول ہو بلکہ اس موضوع میں ملک اور قوم کے لئے محبت کا جذبہ ہو اور اس موضوع سے قوم اور ملک کی سمت کا تعین بھی کیا جاسکے، جبکہ رمضان اور عید اور بقرعید پر بھی پورے ملک میں ایک ہی موضوع پر محبت کا پرچار کرنے والی تقاریر کی جاسکیں گی اور تقاریر کرنے والے امام صاحبان جن کے پاس بہترین دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ مذہبی تعلیم بھی ہو، پھر ان کے پاس بیوروکریٹس عہدہ ہونے کے باعث ان کو ملک کی سلامتی کا بھی احساس ہوگا تو یقیناً صرف چند سالوں میں ملک اور قوم کے

حالات میں بہتری نظر آئے گی، میرے خیال سے اگر پورے ملک میں کئی لاکھ مساجد موجود ہیں تو کئی لاکھ تعلیم یافتہ اور معاشرے میں اہم مقام رکھنے والے علماء کرام ہماری قوم کی سمت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، ایسے علماء کرام ہماری قوم اور نئی نسل کا رول ماڈل بن سکتے ہیں کیونکہ ہزاروں مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والے قوم کے لاکھوں بچوں کو بھی ایسے علماء کرام کو دیکھ کر اپنا مستقبل روشن نظر آ سکے گا۔ (بشکریہ روزنامہ جنگ)

نیشنل ایکشن پلان پر عمل درآمد کے سلسلے میں مذہبی رہنماؤں اور علماء کا کردار بھی انتہائی اہم امر ہے جن کے تعاون کے بغیر انتہا پسندی کے اس مائنڈ سیٹ کو شکست دینا شاید ناممکن ہے۔ یہ امید کی جانی چاہیئے کہ ہماری سیاسی اور فوجی قیادت نے انتہائی عرق ریزی اور جدوجہد کے ساتھ جن سفارشات کی منظوری دی ہے ان پر صحیح رو کے مطابق عمل بھی ہوگا۔ اس سلسلے میں تمام اسٹیک ہولڈرز کا آپس میں تعاون انتہائی ناگزیر ہے۔ سانحہ پشاور میں بچوں کی شہادت پوری قوم پر ایک قرض ہے جس کو چکانے کے لئے ہم سب کو ایک ہو کر آگے بڑھنا ہوگا تا کہ اس ملک کے مستقبل کو بچایا جا سکے۔

دہشت گردی کے خاتمے کے لئے 50 نکاتی فارمولا

کچھ عرصہ قبل دہشت گردی کے خاتمے کے لئے محمد ضیاء الحق نقشبندی صاحب نے ایک پچاس نکاتی فارمولا پیش کیا تھا جو روزنامہ جنگ میں فروری 2015ء کے اوائل میں شائع ہوا تھا۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ پالیسی ساز اداروں اور ارباب عقد وحل کو درج ذیل نکات پر غور کرنا چاہیئے۔ مذکورہ نکات ملاحظہ فرمائیے!

☆ طالبان کے گمراہ کن فلسفہ جہاد کے رد کے لئے حکومت تمام مکاتب فکر کے سینئر علما، مفتیان کرام اور دینی اسکالرز پر مشتمل تھنک ٹینک تشکیل دے۔ یہ تھنک ٹینک طالبان کے فکری و نظریاتی توڑ کے لئے لٹریچر تیار کرے، جسے شائع کر کے ملک بھر میں وسیع پیمانے پر

تقسیم کیا جائے۔

☆ طالبان سمیت تمام انتہاپسند گروہوں کی تحریراً، تقریریا کسی بھی طرح کی حمایت کو سنگین جرم قرار دیا جائے۔ ☆ دہشت گرد تنظیموں اور فرقہ وارانہ قتل و غارت میں ملوث فرقہ پرست جماعتوں کے بیرونی رابطوں کے تمام راستے بند اور ان کی اندرونی و بیرونی فنڈنگ کے تمام تر ذرائع یکسر ختم کئے جائیں۔ ☆ اشتعال انگیز، نفرت آمیز اور انتہاپسندانہ لٹریچر کو ضبط کر کے تلف کیا جائے اور آئندہ ایسا لٹریچر تحریر کرنے، شائع کرنے اور تقسیم کرنے کے عمل کو سخت ترین جرم قرار دے کر سنگین سزائیں مقرر کی جائیں۔ ☆ حکومت پاکستان ملک بھر میں خطبات جمعہ اور دینی اجتماعات کو واچ کرنے کا نظام بنا کر نفرت و تشدد کا پرچار کرنے والے خطباء، ذاکرین اور مذہبی رہنماؤں کو پکڑا جائے۔ ☆ حکومت ہر طرح کے دباؤ اور خوف سے آزاد ہو کر مدرسہ ریفارمز کا عمل شروع کرے۔ مدارس کی رجسٹریشن یقینی بنائی جائے اور دہشت گردی میں ملوث مدارس کو سیل کیا جائے اور جہاں دہشت گردی انتہاپسندی اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کا سبق پڑھایا جاتا ہے ان مدارس کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ ☆ حکومت پاکستان سرکاری سطح پر تمام خطباء کو پابند بنائے کہ وہ معمول کے موضوعات کو چھوڑ کر اگلے چھ ماہ مسلسل قتل ناحق، خودکش حملوں، دہشت گردی اور شدت پسندی کے خلاف ''خطبات'' دیں اور خطبات جمعہ کے ذریعے امن و محبت، رواداری، برداشت اور بھائی چارے کی فضاء کو پروان چڑھائیں۔ ☆ حکومت تمام مکاتب فکر کے جید علماء کرام کا مشترکہ اجلاس بلا کر تمام مسالک کی طرف سے خودکش حملوں، اسلامی ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد، خروج اور انتہاپسندی کے خلاف اجتماعی فتویٰ جاری کروائے اس کو آئین پاکستان کا حصہ بنایا جائے اور اس فتویٰ کی بھرپور تشہیر کی جائے۔ ☆ حکومت سیاسی و مذہبی جماعتوں کے عسکری ونگز کے خاتمے کے لئے مصلحتوں سے بالاتر ہو کر سخت ترین اقدامات کرے اور عسکری ونگ بنانے والی جماعتوں پر پابندی عائد کرنے کے لئے قانون

سازی کرے۔ حکومت ہر طرح کے نجی لشکروں کا قلع قمع کرے اور کسی صورت پرائیویٹ جہاد کی اجازت نہ دے۔ اس معاملے میں زیرو ٹالرنس کی پالیسی اختیار کی جائے۔ ☆ پاک سرزمین پر غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کے نیٹ ورک کا صفایا کیا جائے۔ ☆ پاکستان میں غیر ملکی مذہبی مداخلت کا خاتمہ کیا جائے اور ایسا کرنے والوں کو دوٹوک پیغام دیا جائے کہ وہ پاکستان میں اپنی پراکسی وار بند کردیں۔ ☆ پاکستان میں بھارتی مداخلت کے ثبوت عالمی اداروں، اقوام متحدہ اور عالمی برادری کے سامنے پیش کئے جائیں اور عالمی دباؤ کے ذریعے بھارت کو پاکستانی دہشت گردوں کی سرپرستی ترک کرنے پر مجبور کیا جائے۔ ☆ افغانستان میں پاکستانی دہشت گردوں کی پناہ گاہوں کے خاتمے کے لئے عالمی برادری کا تعاون حاصل کیا جائے۔ افغانستان کے ساتھ ایک دوسرے کے ممالک میں مداخلت نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔ ☆ پاکستان سے افغانستان اور افغانستان سے پاکستان دہشت گردوں کی آمدورفت کو روکنے کے لئے پاک افغان بارڈر پر خاردار تار لگائی جائے یا پھر پاک افغان سرحد پر گہری خندق کھودی جائے اور پاک افغان بارڈر کی نگرانی کا میکانزم بنایا جائے۔ ☆ افغان مہاجرین کو وطن واپس بھیجا جائے اور ملک بھر میں پھیلی ہوئی افغان بستیاں ختم کی جائیں۔ ☆ دہشت گردی کے مقدمات کی سماعت کرنے والے ججز، وکلاء اور گواہوں کی سیکورٹی کا فول پروف نظام وضع کیا جائے اور ججز کی شناخت کو ظاہر نہ کیا جائے۔ پراسیکیوشن کی خامیاں دور کی جائیں۔ ☆ دہشت گردی کے ملزمان کے لئے الگ جیل بنائی جائے۔ ☆ دہشت گرد انتہاپسند تنظیموں، شدت پسند فرقہ وارانہ جماعتوں اور ان کے حامیوں کے رسائل و جرائد کے ڈیکلریشن منسوخ کرکے ان کی اشاعت پر پابندی لگائی جائے۔ ☆ کالعدم جماعتوں کو نام بدل کر کام کرنے سے روکا جائے اور کالعدم تنظیموں کے نیٹ ورک کا خاتمہ کیا جائے۔ ☆ فرقہ وارانہ قتل و غارت اور دہشت گردی میں ملوث شخصیات کی جائیدادیں ضبط کی جائیں۔ ☆ نادرا کے کردار کو فعال بنایا جائے۔ ☆ ملک بھر

میں ہنگامی بنیادوں پر مردم شماری کی جائے تاکہ آبادی کے صحیح اعداد و شمار کو جان کر مربوط پالیسی بنائی جائے۔ ☆ مذہب کا منفی استعمال روکنے اور حقیقی اسلام دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے تمام مکاتب فکر کا مشترکہ علماء بورڈ تشکیل دیا جائے۔ علماء کو پابند کیا جائے کہ وہ فضائل جہاد کے ساتھ ساتھ شرائط جہاد بھی بیان کریں۔ ☆ صحابہ کرام، اہل بیت اطہار اور اولیاء کرام کی توہین اور گستاخی کو سنگین ترین جرم قرار دیا جائے اور ہر طرح کے گستاخانہ لٹریچر کو ضبط کیا جائے۔ ☆ نیشنل سیکورٹی سسٹم کو ری آرگنائز کیا جائے۔ سیاسی و عسکری قیادت پر مشتمل مستقل نیشنل سیکورٹی کونسل قائم کی جائے۔ ☆ انسداد دہشت گردی کے متعلقہ اداروں میں موزوں اور قابل افراد کو تعینات کیا جائے اور انسداد دہشت گردی کے تمام اداروں کو مطلوبہ فنڈز فراہم کئے جائیں۔ ☆ انٹیلی جنس شیئرنگ کے لئے تمام انٹیلی جنس اداروں کا مشترکہ "جوائنٹ سیکرٹریٹ" قائم کیا جائے اور گلی محلے تک انٹیلی جنس کا مضبوط اور مربوط نظام بنایا جائے۔ ☆ کاؤنٹر ٹیررازم کے ماہرین پر مشتمل مستقل کونسل قائم کی جائے جو مسلسل انسداد دہشت گردی کے لئے تجاویز دیتی رہے۔ ☆ دہشت گردی کو کچلنے کے لئے فوجی بجٹ میں اضافہ کیا جائے اور مسلح افواج کو فری ہینڈ دیا جائے۔ ☆ ملک حالت جنگ میں ہے اس لئے "وار کیبنٹ" قائم کی جائے۔ ☆ غیر قانونی سموں کو بلاک کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں اور آئندہ سم کے اجراء کے لئے فول پروف نظام بنایا جائے۔ ☆ قوم میں امن پسندی پیدا کرنے کے لئے نصاب تعلیم میں خصوصی مضامین شامل کئے جائیں۔ انتہا پسندانہ سوچ کے توڑ اور محبت و رواداری اور انسان دوستی کے پرچار کے لئے صوفیاء کی تعلیمات و افکار کو فروغ دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ملک بھر میں صوفی فیسٹیول اور تصوف کانفرنسوں کا انعقاد کیا جائے اور صوفیانہ کلام کی محفلوں کا اہتمام کیا جائے۔ ☆ حکومت غیر قانونی خطرناک اسلحہ کے خلاف ملک گیر آپریشن کلین اپ کرے اور ملک کو غیر قانونی اسلحہ سے پاک کیا جائے۔

☆ گولہ و بارود تیار کرنے والی فیکٹریوں کی اسکریننگ اور چیکنگ کی جائے اور گولہ بارود کی خرید و فروخت کی سخت نگرانی کا مستحکم نظام بنایا جائے۔ ☆ اسلحہ فروخت کرنے والے ڈیلروں کو قانون کے دائرے میں لایا جائے۔ ☆ سرکاری اداروں اور محکموں کو دہشت گردوں کے مخبروں، ہمدردوں اور حامیوں سے پاک کیا جائے۔ ☆ آپریشن ضرب عضب کا دائرہ ملک بھر میں پھیلایا جائے اور ملک کے ہر شہر اور دیہات میں دہشت گردوں اور ان کے حامیوں، سہولت کاروں اور مددگاروں کے ہر ٹھکانے اور پناہ گاہ کا خاتمہ کیا جائے۔ ☆ ریٹائرڈ فوجیوں پر مشتمل خصوصی ''انسداد دہشت گردی فورس'' قائم کی جائے۔ ☆ پولیس کو سیاسی مداخلت سے مکمل طور پر پاک کیا جائے اور پولیس کی صلاحیت و مہارت میں اضافے کے لئے خصوصی ٹریننگ کا بندوبست کیا جائے۔ ☆ سوشل میڈیا پر دہشت گردوں، انتہا پسندوں اور فرقہ پرستوں کے افکار و نظریات کے فروغ کو روکنے کے لئے اقدامات کئے جائیں اور سائبر کرائم قوانین پر عمل یقینی بنایا جائے۔ ☆ تعلیم الامن کے فروغ کے لئے ہر شہر میں ''پیس سینٹر'' قائم کئے جائیں۔ ☆ ملک بھر کی تمام مساجد کی اسکروٹنی کی جائے اور ہر مسجد کے خطیب، امام اور موذن کی کڑی نگرانی کی جائے۔ ☆ ہر شہر میں کرائے کے مکانوں میں رہنے والوں کے کوائف جمع کئے جائیں اور مالک مکان کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنا مکان کرائے پر دیتے وقت متعلقہ تھانے میں کرائے دار کی تفصیل جمع کروائے۔ ☆ حکومت دہشت گردی، انتہا پسندی، عسکریت پسندی اور فرقہ واریت کے خلاف خصوصی قومی مہم کا آغاز کرے۔ اس مہم کے دوران مسلسل الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر اشتہارات دیئے جائیں۔ ہر شہر میں سیمینارز اور مذاکرے کروائے جائیں۔ اس مہم میں ملک کی تمام چھوٹی بڑی، سیاسی، مذہبی، سماجی تنظیموں اور تاجروں، ڈاکٹروں، وکلاء، اساتذہ، طلباء، دینی مدارس، صحافیوں، ادیبوں، شاعروں، اقلیتوں اور این جی اوز کو شامل کیا جائے۔ ☆ افغان جہاد کے دوران عسکری جہاد ٹریننگ لینے والوں کی جامع فہرست تیار کی جائے اور ایسے تمام

افراد کی نگرانی کا نظام بنایا جائے۔ ☆ کالعدم تنظیموں کے ویلفیئر ادارے اور ٹرسٹ کو غیر قانونی قرار دے کر حکومتی تحویل میں لیا جائے۔ ☆ انتہا پسندی کے مواد پر مشتمل ویڈیو، آڈیو کیسٹوں کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا جائے۔ ☆ تمام اداروں میں موجود دہشت گردوں سے کسی بھی طرح کی ہمدردی رکھنے والے لوگوں کی مکمل جانچال پڑتال کی جائے۔ ☆ تمام میڈیا چینل، اخبارات، اور نیوز ایجنسیوں کے مالکان اور ملازمین کو پابند بنایا جائے کہ وہ کسی بھی طرح دہشت گردوں کے حوصلے بڑھانے والی خبر، پروگرام نہ چلائیں۔ ☆ جو کالعدم تنظیمیں نئے نام سے کام کر رہی ہیں ان کو فوری طور نئے نام سے کام کرنے سے روکا جائے۔

جرگہ سسٹم پر خاموشی اور فوجی عدالتوں کی مخالفت!

قومی اخبار میڈیا گروپ کے چیف ایڈیٹر جناب الیاس شاکر اپنی طرز کے منفرد قلم کار ہیں، 29 جنوری 2015ء کو موصوف کا ایک کالم روزنامہ قومی اخبار میں شائع ہوا تھا جسے میں اس کتاب میں آخری باب کے طور پر شامل کر رہا ہوں۔ الیاس شاکر صاحب کا یہ مضمون میری کتاب کے لئے ''تحریک'' ثابت ہوا کیونکہ اس مضمون کو پڑھنے کے لئے بعد ہی میں نے ''فوجی عدالتیں، لہو کا قرض'' لکھنے کا فیصلہ کیا۔ آپ بھی پڑھیے!

کراچی کے اخبار نے گزشتہ روز دل دہلا دینے والی خبر شائع کی۔ یہ کوئی عام خبر نہیں، یہ ایسی خبر ہے کہ پڑھ کر دل دہل جاتا ہے۔ رونگٹوں کے ساتھ انسان خود بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ خبر کی سرخیاں ہیں ''شکارپور کے جرگے نے 2 بچیاں ونی کر دیں۔ 3 سالہ بچی کا 36 سالہ شخص اور 6 سالہ بچی کا 40 سالہ شخص سے نکاح کر دیا گیا۔'' کچے کے علاقے میں ہفتے کے روز ''کاروکاری جرگے'' میں شرمناک فیصلہ سنایا گیا۔ اس دل خراش فیصلے نے ان تمام پاکستانیوں کا جلوس نکال دیا جو فیشن ایبل کپڑے پہن کر انسانی حقوق کے لئے جلوس

نکالتے ہیں اور دہشت گردوں سے دوستی نبھانے کے لئے فوجی عدالتوں کے خلاف تقریریں بھی کرتے ہیں۔

ذرا سوچئے! ملک میں چلنے والے غیر آئینی، غیر قانونی اور غیر اسلامی ''جرگہ سسٹم'' نے 3 اور 6 سال کی کم سن بچیوں کی شادی کرادی، 3 سال کی بچی تو تین بار ''ہاں اور نہ'' بھی نہیں کہہ سکتی لیکن جبراً نکاح کر دیا گیا اور ایسا لگتا ہے کہ پولیس ان شادیوں کی ''خاموشی باراتی'' تھی۔ علاقے کے عوام نے جبر کے ماحول میں اسے قبول کرلیا۔ ملک کا عدالتی نظام اور ازخود نوٹس لینے کے شاندار روایت بھی ایک نظر ادھر نہ ڈال سکی۔ مذہبی رہنما اور سیاسی ٹھیکے دار بھی منہ چھپا گئے، لیکن فوجی عدالتوں کے خلاف سینہ اور منہ پھلا کر سامنے آ گئے تاکہ عوام کو تحفظ دینے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکے۔

کیا ہمارے ملک کی نئی نسل یہ نہیں سوچتی ہوگی کہ وہ کس ملک میں جوان ہو رہی ہے، جہاں مذہبی سیاست دان سے لے کر روایتی سیاست دان تک کوئی بھی جرگہ سسٹم کے خلاف ایک لفظ نہیں بول رہا۔ اگر ہمارے ''سیاسی وکلا'' فوجی عدالتوں کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کے لئے جاتے ہوئے چند سطریں جرگہ سسٹم اور لیویز سسٹم کے خلاف بھی لکھ دیتے تو ان کی اپیل طاقتور ہو جاتی اور عدالت ایک اچھا فیصلہ دے سکتی تھی۔ یا کم از کم ''جرگہ سسٹم اور لیویز سسٹم'' کو غیر قانونی اور غیر آئینی ہی قرار دے دیتی لیکن چونکہ ہمیں ہمیشہ آدھا سچ بولنے کی عادت ہوگئی ہے، اس لئے ہم قومی اسمبلی، سینیٹ اور صدر مملکت سے منظور شدہ آئینی ترمیم کے خلاف تو عدالت میں چلے گئے لیکن ظلم کے سب کے بڑے نظام یعنی جرگہ سسٹم اور لیویز کے خلاف نہ کچھ بولتے ہیں اور نہ ہی عدالت کے کھلے دروازوں سے کوئی فائدہ سمیٹتے ہیں۔ ہم سب اس سچ کے لئے لڑ رہے ہیں جس میں ہمارے گروہی مفادات ہوتے ہیں۔

پاکستان میں ایک نئی بحث شروع ہوگئی ہے کہ ''فوجی عدالتیں'' جائز ہیں یا ناجائز۔ تین

چار سیاسی جماعتیں اور گروپ وقفے وقفے سے پارلیمنٹ سے منظور شدہ فوجی عدالتوں کو متنازع بنانے کا کام بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پہلے کہا گیا کہ جب تک پارلیمنٹ آئین میں ترمیم منظور نہیں کرے گی انہیں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔اب جبکہ پارلیمنٹ کی اکثریت نے فوجی عدالت کے لئے آئینی ترمیم کو حالت جنگ میں وقت کی ضرورت قرار دے کر منظور کر لیا لیکن ہر معاملہ میں مخالفت کرنے والوں نے فوجی عدالت کو بنیاد بنا کر ایک بار پھر اپنی سیاست چمکانے کے لئے گرما گرم بیانات دینا شروع کر دیئے ہیں۔ کچھ عناصر نے آئین میں فوجی عدالت کے لئے 21ویں ترمیم کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ سپریم کورٹ 21ویں ترمیم کو آئین کا حصہ نہ بننے دے۔اب اگر مختلف حربوں اور طریقوں سے فوجی عدالتوں کو چیلنج کرنے کا سلسلہ جاری رہا تو ایک ایسی قوم جو سانحہ پشاور کے بعد متحد ہو گئی تھی وہ دل شکستہ ہو کر بکھر جائے گی، اور دہشت گرد ایک بار پھر جری اور قوی ہو جائیں گے۔دیکھتے ہیں کہ انصاف کے ادارے کیا فیصلہ کرتے ہیں؟ لیکن قوم کو یہ سوال پوچھنے کا حق دیا جانا چاہئے کہ 20 کروڑ عوام کی جان و مال کی اہمیت زیادہ ہے یا پانچ سات ہزار دہشت گردوں کی؟ جو عوام کی جان و مال کے دشمن ہیں اور کھلم کھلا کہتے ہیں کہ نہ ہم پاکستان کو مانتے ہیں اور نہ پاکستان کے آئین کو، خوب ہیں یہ لوگ!! جو ملک اور آئین کو نہ ماننے والوں کے لئے پورے ملک سے لڑ رہے ہیں۔ کیا یورپ اور امریکہ کی جمہوریت میں کوئی بھی شخص ایسا کرنے کا سوچ سکتا ہے؟ وہاں تو ہر لیڈر وہی کرتا ہے جو ملک و قوم کے مفاد میں ہو وہاں کوئی بھی ایسا لیڈر نہیں جو کھلم کھلا کہہ سکے کہ ''خدا کا شکر ہے کہ اس ملک کو بنانے کے گناہ میں ہم شریک نہیں تھے۔'' پاکستان دنیا کا اس لحاظ سے سب سے بڑا جمہوری مملکت ہے کہ یہاں ہر کس و ناکس کو ''بے لگام آزادی'' ہے۔اس مملکت خداداد میں تو ایسے جلسے بھی ہوئے جہاں ملک توڑنے کی باتیں لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے کی گئیں۔قومی پرچم کو بھی جلایا گیا لیکن کسی نے اف تک نہ کی۔ ہر موضوع پر بیان دینے والوں کی۔ پاکستان اور عوام سے

وفاداری کے معاملے پر زبان گنگ کیوں ہو جاتی ہے؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ اب ایک بار پھر پارلیمنٹ کی اکثریت کے ہاتھوں منظور ہونے والی اس آئینی ترمیم کے خلاف ''منظم مہم'' منصوبہ بندی کے ساتھ چلائی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں فوجی عدالتیں بنائی گئیں۔

فوجی عدالتوں کی مخالفت کرنے والے لیڈران سے کیا یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ کبھی انہوں نے جرگہ سسٹم کے خلاف بیان دیا؟ اس کی مخالفت کی؟ کبھی لیویز کے خلاف بولے؟ جرگہ سسٹم دنیا کا سب سے زیادہ ظالمانہ نظام ہے جس کے فیصلے کے خلاف نہ کوئی اپیل کرسکتا ہے اور نہ ہی ''جرگے'' میں بلائے جانے والے ملزمان کو وکیل کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ ''جرگہ سسٹم'' کے ججوں کے لئے تعلیم، قابلیت، تجربے اور ذہانت کی کوئی پابندی ہے اور نہ جرگے سسٹم کے فیصلوں کا کوئی ریکارڈ ہوتا ہے۔ جرگہ سسٹم میں اسلام کے مسلمہ اصولوں کے تحت شادی اور نکاح کرنے والے لڑکے اور لڑکی کو سنگسار کرنے اور وزنی پتھر باندھ کر ''دریا برد'' کرنے کی شرمناک سزائیں دی جاتی ہیں۔ ماضی میں بھی اسی جرگہ سسٹم کے تحت مختاراں مائی کے ساتھ اجتماعی زیادتی کے فیصلے پر سرعام عمل کرایا گیا۔ ایک ''مبینہ خطا کار'' پر کتے تک چھوڑے گئے۔ کئی ایک کے منہ کالے کرکے گدھوں پر سواری کرائی گئی۔ سزائیں بھی ایسی کہ زمین پھٹ جائے اور آسمان خون تھوک دے، لیکن کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ جرگے کے ''معزز'' جج صاحبان کس قانون اور آئین کی کس شق کے تحت یہ سزائیں دیتے ہیں اور حکومت یعنی پولیس اور انتظامیہ ان کے سامنے کیوں بے بس ہو جاتی ہے؟

بلوچستان کا لیویز سسٹم اس سے بھی زیادہ منفرد ہے۔ سردار اور اس کے ولی عہد کو جج کے اختیار حاصل ہیں۔ پہلے وہ سزا دیتا ہے پھر اپنے علاقے میں صوبائی حکومت کے خرچے پر قائم ذاتی جیل میں رکھ سکتا ہے اور جب چاہے اس کی سزا معاف کر کے رہا بھی کرسکتا ہے، یعنی وہ خود جج بھی ہے اور رحم کی اپیل منظور کرنے کا اختیار رکھنے والا ''صدر'' بھی۔ حالانکہ

پاکستان کے صدر کے پاس بھی ایسے اختیارات نہیں وہ تو 58ٹو بی کے بغیر ہالی ووڈ کی ہیروئن کے خاوند جیسا ہے۔ لیویز سسٹم میں ''قانون کی دفعات'' نہیں ہوتیں بلکہ سردار کی مرضی کو ہی قانون سمجھا اور مانا جاتا ہے۔ لیویز سسٹم میں سردار کو پولیس رکھنے کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ اپنے علاقے کے کچھ چیدہ لوگوں کو پولیس میں بھرتی کرتا ہے۔ حکومت سردار کو اُن کی تنخواہ اور اسلحہ فراہم کرتی ہے اور سردار اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق تنخواہ طے کرتا ہے اور بعض علاقوں میں سردار سرکار سے ملنے والی تنخواہ میں سے آدھی یا اس سے کچھ زیادہ تنخواہ آگے دیتا ہے اور باقی اپنے ''ذاتی خزانے'' میں جمع کر لیتا ہے۔ اس طرح مذکورہ علاقے میں سردار کی علیحدہ حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ جس کو سرکاری زبان میں ''ریاست'' کے اندر ''ریاست'' کہا جاتا ہے۔ فوجی عدالتوں اور آئینی ترمیم کے خلاف بولنے والے اس ''ملک گیر ظلم'' کے خلاف بھی لب کشائی کرتے تو ان کی حق گوئی اور صاف گوئی کی کوئی بھی قسم کھا سکتا تھا لیکن ''آدھے سچ'' والا ''مکمل انصاف پسند'' کیسے کہلا سکتا ہے؟

جس ملک میں ''جرگے'' کے ذریعے سیاسی جماعتوں سے مذاکرات کئے جائیں، وہاں اس وحشیانہ سسٹم کے خلاف آواز کون بلند کرے گا؟ ملک کے دانشوروں اور سول سوسائٹیز کے متحرک اور جوشیلے افراد کو چاہئے کہ وہ جرگہ سسٹم اور لیویز سسٹم کے خلاف نا صرف آواز بلند کریں بلکہ اندرون سندھ، اندرون پنجاب، کے پی کے اور بلوچستان کے پسماندہ علاقوں میں جا کر حقائق تلاش کریں اور تحریری رپورٹس جاری کریں۔ یہ معلومات ملک بھر کے عوام کو یہ بات ضرور سمجھا دیں گی کہ ہم کس وحشیانہ ماحول میں جی رہے ہیں اور ہمیں اس سے چھٹکارا دلانے میں کون کردار ادا کر سکتا ہے؟ یا ہمیں اسی طرح سسک سسک کر مر جانا ہے!

☆☆☆